

جاسوسی دنیا

96- سہمی ہوئی لڑکی

97- قاتل کا ہاتھ



والوں میں فن کے قدردانوں کی کمی نہیں اس لئے مجھے محتاط رہنا پڑتا ہے۔ ابھی حال ہی میں میرے ایک معزز ہمدرد نے مشورہ دیا ہے کہ میں کبھی کبھی ایک آدھ ناول اپنے لئے بھی لکھ لیا کروں۔ ”صرف پبلک کے بے حد اصرار“ ہی کا شکار ہو کر نہ رہ جاؤں۔ میرے لئے یہ مشورہ بہت دقیق ہے..... ویسے بھی اب ”طلسم ہوشربا“ قسم کی کہانیاں لکھنے میں میرا جی نہیں لگتا اور یقین کیجئے میں وہی لکھوں گا جو میرا جی چاہے گا۔ پہلے بھی کسی کا مشورہ قبول کئے بغیر لکھتا رہا ہوں۔ لیکن آخر آپ یہ کیوں چاہتے ہیں کہ میں ویسی ہی کہانیاں لکھوں جیسی پہلے لکھ چکا ہوں۔ اب بھی جو کچھ لکھ رہا ہوں اگر اس میں نیا پن نہ ہو تو مجھے گولی مار دیجئے اور اپنے ذوق کی تسکین کے لئے دوسروں کو پڑھئے۔ اب میں اکیلا تو نہیں۔ میرے بے شمار ”نا تحقیق بھائی“ منظر عام پر آ گئے ہیں یہ اور بات ہے کہ وہ بھی ”صفی“ ہی کی چھاؤں میں پناہ لیتے ہیں۔

ٹنڈو آدمی صاحب آپ جہاں بھی جائیں گے مجھے ہی پائیں گے۔ ورنہ پھر میرے اس مشورے پر عمل کیجئے کہ خود ہی لکھا اور پڑھ ڈالا۔ خیر ختم کیجئے..... کہاں تک لکھتا رہوں اس کے متعلق۔

ایک صاحب نے کسی ایسے مصنف کے بارے میں لکھا ہے جو اپنی کہانیوں میں میرے کردار استعمال کرتا ہے اس نے اپنی کسی کتاب کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ وہ میری اجازت سے میرے کردار استعمال کر رہا ہے اور میں نے اُسے اس سلسلے میں مفید مشورے بھی دیئے ہیں۔

بھئی اس سلسلے میں اس کے لئے میرا مفید مشورہ یہی ہو سکتا تھا کہ وہ میرے کردار استعمال کرنے کے بجائے اپنی صلاحیتوں پر بھروسہ کرے۔

پیشکش

ٹنڈو آدم کے ایک ٹیلی فون آپریٹر صاحب کا خیال ہے کہ میرا اچھلا ناول ”آتش بادل“ محض ”بکواس“ تھا۔

ان کی دانست میں ناول کا نام تو شاندار تھا لیکن اس کے اعتبار سے کہانی پھس پھسی ہے۔ چلئے تسلیم! میں تو ہر بات تسلیم کر لینے کا عادی ہوں۔ محض اس لئے کہ میرے پڑھنے والے ہر طبقے اور ہر عمر سے تعلق رکھتے ہیں لہذا ان کے ٹیٹ میں اختلاف ہو سکتا ہے۔

ٹیلی فون آپریٹر صاحب نے ”سہ لنگا شعلہ“ میں ”آتش بادل“ کا اشتہار دیکھ کر اس کے بارے میں کچھ اس قسم کی کہانی خود بنائی ہوگی کہ آگ برساتا ہوا ایک بادل پورے شہر پر مسلط ہو گیا۔ عمارتیں دھڑا دھڑ چلنے لگیں۔ لیکن اُس عمارت پر ذرہ برابر بھی اثر نہ ہوا جس میں عمران مقیم تھا۔ جب ساری عمارتیں جل کر خاک ہو چکیں تو عمران شور نالہ و بکا پر تھپتھپے لگاتا ہوا اپنی پناہ گاہ سے برآمد ہوا اور ہزاروں میل دور کے پہاڑوں میں فروکش اس سائنٹسٹ کا ٹیٹو جادوایا جو ایک بہت بڑی مشین کے ذریعے آتش بادل بنانا کرفضا کو پسلائی کر رہا تھا۔

یار ٹنڈو آدمی صاحب! خود ہی لکھ کر پڑھ لیا کرو۔ میرے پڑھنے

و ایسے ان صاحب سے درخواست ہے کہ مجھے اس کتاب کا نام اور ادارے کا پتہ لکھ بھیجیں جہاں سے وہ کتاب شائع ہوئی ہے تاکہ میں اس غلط بیانی کی وجہ معلوم کر سکوں۔

اب آئیے ”سہمی ہوئی لڑکی“ کی طرف..... یہ بھی عجیب کہانی ہے کہ جہاں کہانی ختم ہوتی ہے وہیں سے اس کی شروعات ہوتی ہے۔ ہے نا عجیب بات۔

میں اس پلاٹ کو ایک ہی جلد کے ضخیم ناول میں بھی پیش کر سکتا تھا لیکن زیادہ تر پڑھنے والے مجھے اس سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ کہانی خواہ دس جلدوں میں پھیلے لیکن ہر جلد کی قیمت زیادہ نہ ہونی چاہئے۔ ان کے خیال کے مطابق چونکہ میں ایک ”عوامی مصنف“ ہوں اس لئے مجھے عوام کی جیبوں کا وزن بھی مد نظر رکھنا چاہئے۔

چونکہ اس کہانی کا اختتام ہی دراصل اس کی شروعات ہے اس لئے بعض حضرات کے لئے یہ اطلاع تکلیف دہ بھی ہو سکتی ہے کہ کہانی آگے بڑھ گئی۔ وہ مجھے پھر کچھ اسی قسم کے خطوط لکھیں گے کہ میں ”ہوس زر“ کا شکار ہو گیا ہوں۔ حالانکہ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ کسی کہانی کی طوالت کی بناء پر کتابوں کی تعداد اشاعت پر تو اثر پڑتا نہیں۔

بہر حال خیال اپنا اپنا.....!

ابن مسعود

۲۳ اپریل ۱۹۶۶

اچھوتا خیال

بال میں احمقوں کا ہجوم تھا اور اسٹیج پر ایک امریکی گلوکارہ حلق پھاڑ رہی تھی۔ ہر احمق کے چہرے پر کچھ ایسے ہی تاثرات پائے جاتے تھے جیسے وہ اس کی فنکارانہ صلاحیتوں سے پوری طرح محظوظ ہو رہا ہو۔ موسیقی کے اتار چڑھاؤ پر احمقوں کے سر اس طرح جنبش کرتے جیسے وہ ان کے ریشے ریشے میں رچی بسی ہو۔ آغوش مادر میں بھی انہوں نے دہی لوریوں کی بجائے یہی سب کچھ سنا ہو۔

ان احمقوں میں وہ سب سے بڑا احمق بھی شامل تھا جس کی عقل ہمیشہ معدے ہی میں مقیم رہنے پر مصر رہتی تھی۔

دوسروں کو محظوظ ہوتے دیکھ کر وہ بھی محظوظ ہونے کی کوشش کرتا لیکن خالی پیٹ کی قراقرز کی طرف توجہ زیادہ تھی اور وہ کسی قدر اُداس بھی تھا۔ اُداس اس لئے تھا کہ پہلو میں ”حمید بھائی“ کی بجائے ”گلہری خانم“ مقیم تھیں۔

آج کل وہ قاسم کو تنہا باہر نہیں نکلنے دیتی تھی۔ مقصد یہی تھا کہ کیپٹن حمید کا ساتھ نہ ہونے پائے۔ اس کا خیال تھا کہ قاسم کا دماغ خراب کرنے میں کچھ فیصد اسی کا ہاتھ ہے اور یہی بات اس نے عاصم صاحب کو بھی سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ اس پر عاصم صاحب نے گرج کر کہنے فرزند ارجمند کو حکم دیا تھا کہ اب وہ تنہا باہر نہ نکلا کرے۔

قاسم نے حیرت سے آنکھیں پھاڑی تھیں اور ”قہا“ ”قہا“ ”ارے یہ میرے ساتھ کہاں بندھی پھریں گی۔ میں تو دن بھر گھر سے باہر رہتا ہوں۔“

بیوی تر سے بولی تھی۔ ”تمہاری بھلائی کے لئے میں یہ تکلیف بھی گوارا کروں گی۔“
 پھر باپ کے آگے قاسم صاحب کی کہاں چلتی۔ ”گہری خانم“ تعویذ بن کر گلے میں لٹک گئی تھیں اور قاسم کا خیال تھا کہ اب وہ چوبیسوں گھنٹے سنگ سنگ کر بلاآ خر بھسم ہی ہو جائے گی۔
 بعض اوقات جھلاہٹ میں ایسی حرکتیں کرتا جسے کوئی باسلیقہ آدمی برداشت نہیں کر سکتا۔
 لیکن بیوی شاید اس پر تل گئی تھی کہ ہرگز پیچھا نہ چھوڑے گی۔ وہ اس وقت بھی سوچ رہا تھا کہ پروگرام ختم ہونے پر کھانا کسی نانباہی کی دوکان پر کھائے گا۔ پھر دیکھو کیسے بیٹھتی ہیں بیگم صاحبہ میرے ساتھ۔ سڑک کے کنارے گندی سی بیچ پر اور کیسے کھاتی ہیں میرے ساتھ گندی سی میز پر۔
 خدا خدا کر کے ساڑھے آٹھ بجے۔ غیر ملکی موسیقی کا وہ مظاہرہ ختم ہوا۔ دونوں ہال سے باہر آئے اور قاسم نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”بھونگ لگی ہے۔“

”اب تم مجھے کھا جاؤ۔“ قاسم کی بیوی جھلا کر بولی۔ ”جب دیکھو تب بھونگ لگی ہے۔“
 ”میں تو بھینس کے پائے اور توری روٹی کھاؤں گا۔۔۔۔۔!“
 ”کیا کہا۔۔۔۔۔؟“

”وہی جو تم نے سنا۔۔۔۔۔!“ قاسم نے منہ بگاڑ کر کہا۔ ”بہادر شاہ روڈ پر فنانانباہی کی دوکان ہے۔“
 ”فنانانباہی کی دوکان؟“
 ”ہاں۔۔۔۔۔!“ قاسم غرایا۔

”اچھا گھر چلو میں منگوا دوں گی۔“
 ”نائیں۔۔۔۔۔ وہیں بیٹھ کر کھاؤں گا۔“
 ”کیا۔۔۔۔۔؟“ بیوی اچھل پڑی۔

”سڑک کے کنارے میزیں اور بنچیں پڑی رہتی ہیں۔“
 ”اور تم سڑک کے کنارے بیٹھ کر کھاؤ گے۔“

”تم بھی بیٹھو غی میرے ساتھ۔۔۔۔۔!“
 ”ہوش میں تو ہو۔۔۔۔۔!“

”نہیں بے ہوش پڑا ہوں۔۔۔۔۔ تم بھی خاؤ غی۔۔۔۔۔ میں بھی خاؤں گا۔۔۔۔۔!“
 ”میں بھی خاؤں گا۔۔۔۔۔!“ بیوی نے جھلاہٹ میں منہ میڑھا کر کے نقل اتاری۔
 ”بس دیکھنا۔۔۔۔۔!“

گاڑی فرار نے بھرتی ہوئی سڑکوں سے گذرتی رہی۔ پھر وہ علاقہ بھی نظر آیا جہاں کئی نان باہیوں کی دوکانیں تھیں۔

قاسم نے ایک جگہ گاڑی روک دی۔

”تو تم نہیں مانو گے۔“ قاسم کی بیوی نے کپکپاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”یعنی بھوکا مر جاؤں تمہارے کہنے پر۔“ قاسم نے آنکھیں نکالیں۔

”اچھی بات ہے۔“ بیوی نے طویل سانس لے کر کہا۔ لیکن اتنا تو کرو کہ گاڑی یہاں

سے کچھ آگے بڑھا کر کھڑی کرو۔

”اچھا۔۔۔۔۔ اچھا۔۔۔۔۔!“ قاسم نے دوبارہ انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

گاڑی کچھ دور تک رنگی اور پھر رک گئی۔

”چلو اترو۔۔۔۔۔!“ قاسم نے کہا۔

”میں۔۔۔۔۔ دماغ تو نہیں چل گیا۔ تم جاؤ۔۔۔۔۔ میں یہیں رہوں گی۔“

”اے الہ۔۔۔۔۔ تو پھر میری نگرانی کیسے ہوگی۔“ وہ جلعے زنہ انداز میں بولا۔ ”اگر کسی

دیکھی یا پتیلی نے مجھے آنکھ ماردی تو قیا ہوگا۔“

لیکن پھر وہ بیوی کے جواب پر دھیان دینے کی بجائے دوسرے منظر میں کھو گیا۔ بائیں جانب ایک دوکان میں ایک درزی جو صورت سے تو شاعر نہیں معلوم ہوتا تھا ایک دہلی پتلی خاتون کی کمر کی پیمائش کر رہا تھا۔

وہاں سے نظر ہٹ کر سائن بورڈ پر آٹھری۔

”منصور اینڈ سنز۔۔۔۔۔ لیڈر ٹیلرس۔۔۔۔۔!“

”قیابا ہے۔“ قاسم نے ٹھنڈی سانس لی۔

وہ سوچ رہا تھا الا قسم یہ ہے زور دار دھندا..... قیا مشکل ہے۔ عیش ہیں سالوں کے۔

”اب کیا سوچ رہے ہو۔“ دفعتاً بیوی چپنائی۔ ”یا تو اُتر دیا گھر چلو.....!“

”اچھا..... اچھا.....!“ قاسم جلدی سے سر ہلا کر بولا۔

انجن پھر اشارت ہوا اور گاڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

”تو یہ سب کچھ میری جان جلانے کے لئے تھا۔“

”ارے نہیں..... بی بی بی بی! وہ تو مذاخ تھا.....!“

”مذاق بھی کر لیتے ہو۔“ بیوی نے ٹھنڈی سانس لے کر پوچھا۔

”قیوں نہیں..... قیوں نہیں۔ وہ تو میں بہت کر لیتا ہوں..... اور ہاں دیکھو اب میں کل

سے گھر سے باہر نہیں نکلوں گا.....!“

”خیریت..... اچانک یہ تبدیلی کیوں۔“

”کچھ نہیں..... بس یونہی..... اب میں تمہیں پریشان نہیں کروں گا۔ تم تو بہت اچھی ہو۔“

”اللہ خیر کرے..... وہ تو..... وہ تو..... میں بھی سوچتا ہوں کہ اب مجھے کچھ کرنا

چاہئے..... کچھ سیکھنا چاہئے۔“

”یعنی گھر ہی میں رہ کر.....!“ بیوی نے خوش ہو کر پوچھا۔

”اور قیا..... شریف آدمی کا بچہ ہوں۔“ قاسم کے لہجے میں اکڑن تھی۔

”بھلا کیوں سیکھو گے۔“

”تم مجھے کپڑا کاٹنا سکھا دو۔“ قاسم گھگھکیا اور بیوی ہنسی کے مارے دوہری ہو گئی۔

ہنسی ہی رہی آخر قاسم جھنجھلا گیا۔

”ذرا یہ تو بتاؤ کہ یہ نئی سوچھی کیسے.....؟“

”شوک ہے اپنا اپنا.....!“ قاسم نے بے حد خشک لہجے میں کہا۔

”پہلے تو نہیں تھا..... یہ اچانک کیوں.....؟“

”اب کھاموش رہو.....!“ وہ غرایا۔

گھر آ کر بھی وہ اسی کے متعلق سوچتا رہا تھا۔ جب بے چینی بہت بڑھی تو ڈرائیونگ روم میں آ کر فون پر کرنل فریدی کے نمبر ڈائل کئے۔

دوسری طرف سے جواب ملنے پر کیپٹن حمید سے گفتگو کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ بھی شائد گھر ہی پر موجود تھا۔

”اوہ..... اچھا..... آپ ہیں۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”ابے دکھائی کیوں دیتے آج کل۔“

”بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہوں حمید بھائی۔“

”کوئی نئی محبت.....!“

”ہائے! اب ایسا کہاں ہے کدر۔“

”پھر کیا مصیبت ہے۔“

”وہی تمہاری آپا جان..... نہیں نہیں صرف آپا..... آپا.....!“

”جان نہیں.....؟“ دوسری طرف سے سوال کیا گیا۔

”قاسم کا چہرہ بگڑ گیا اور اس نے حلق کے بل کہا۔“ نہیں.....!“

”خیر چلو..... اس وقت بور کرنے کا مقصد.....؟“

”ایک نئی ترقیب.....!“

”کا ہے کی ترکیب.....!“

”ہم تم دونوں مل کر درزی کی دوکان قریلیں.....!“ قاسم نے کہا اور دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کرنے کی آواز سنی۔

”بند فر دیا سالے نے۔“ وہ پرتشویش لہجے میں بڑبڑایا اور نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔

”ابے پاگل تو نہیں ہو گیا۔“ دوسری طرف سے حمید دہاڑا۔

”اے تو کھفا ہوئے کی کیا بات ہے۔“ قاسم نے گھگھکیا کر کہا۔ ”پوری بات تو سن لو۔“

قوی فون میں گھس کر تم پر چڑھ تو نہیں بیٹھوں گا۔“



حمید ریسپور رکھ کر ہنستا ہوا مڑا..... دروازے میں فریدی کھڑا اُسے عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”عالباب یہ بالکل ہی پاگل ہو جائے گا۔“ حمید بولا۔

”کیا کہہ رہا تھا.....؟“

”شرکت میں درزی کی دوکان کرلو..... لیڈیز ٹیلرنگ شاپ..... کہتا ہے میں نے بیوی کو راضی کر لیا ہے وہ کل سے مجھے کپڑے کاٹنا سکھائے گی۔“

”پھر کیا خیال ہے تمہارا.....؟“

حمید اس کے لہجے کی سنجیدگی پر چونک پڑا۔ آنکھیں پھاڑ کر نیچے سے اوپر تک جائزہ لینے کے بعد کچھ کہنے ہی والا تھا کہ فریدی ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”اُسے اتفاق ہی کہنا چاہئے کہ قاسم نے بھی تمہارے لئے وہی سوچا جو میں سوچ رہا تھا۔“

”اوہ تو کیا آپ کی شرکت میں دوکان رکھنی پڑے گی۔“ حمید نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”نہیں تنہا..... ویسے قاسم کو بھی شریک کرنا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اس طرح تمہارا جی بھی بہلتا رہے گا۔“

حمید نے سوچا آج بڑے اچھے موڈ میں نظر آ رہے ہیں حضرت! کیا قصہ ہے.....؟ وہ لا پرواہی سے شانوں کو جنبش دے کر دوسرے دروازے کی طرف مڑا ہی تھا کہ فریدی بولا۔

”ظہر..... تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔“

حمید نے اس کی طرف مرکز طویل سانس لی اور ہونٹ بھیج لئے۔

”دوکان ویل فرنٹڈ ہے..... چار عدد پاور مشینیں ہیں اور بھی جو لوازمات ہوتے ہیں سب ہی موجود ملیں گے۔“

حمید نے ایک بار پھر اُسے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ فریدی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نظر آئی لیکن اس سے بھی نہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس وقت سنجیدہ نہیں ہے۔

”یعنی..... یعنی..... کہ آپ.....!“

”ہاں..... عزیز القدر..... میں سنجیدہ ہوں۔“

”اور اس گھٹیا کام کی نگرانی میرے سپرد ہوگی۔“

”تم سے زیادہ قابل اعتماد آدمی کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔“ فریدی پھر مسکرایا۔

”عزت افزائی کا شکریہ۔“ حمید حلق کے بل کر رہا تھا۔

”کیوں.....؟ کیا بات ہے۔ کیا تم کچھ پیار ہو۔ میں تو سمجھا تھا کہ تمہارے مذاق کی چیز ہے۔“

”یعنی میں خواتین کا ٹیلر ماسٹر بن بیٹھوں گا۔“

فریدی نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرکوا ثباتی جنبش دی۔

”اور یہ میرے مذاق کی چیز ہے۔!“ حمید نے جھلائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”قاسم کچم شیم ہے..... لیکن عقل نہیں رکھتا۔ تم مختصر ہو لیکن عقلمندی کے ساتھ..... اس کے

علاوہ اور کیا فرق ہے تم دونوں میں۔“

”شکریہ۔“ حمید نے خشک لہجے میں کہا۔ چند لمحے خاموش رہا پھر پوچھا۔ ”اور کچھ۔“

”کل تمہیں کاریگروں کا انٹرویو لینا ہے وہیں دوکان پر۔ کارخانہ حال ہی میں قائم ہوا

ہے۔ چار آدمی تو مشینوں پر کام کرنے کے لئے ہوں گے دو آدمی کٹنگ کے لئے۔ دو بازار

دیکھنے والے اور تم فیبر..... صرف زنانہ ملبوسات کا کارخانہ..... آج کے سارے بڑے

اخبارات میں اشتہار آئے ہیں۔“

”میں نہیں سمجھ سکتا۔“

”کیا نہیں سمجھ سکتے۔“

”اگر یہ اسکیم کسی قسم کی تفتیش سے تعلق رکھتی ہے تو اچانک آج ہی یہ بم مجھ پر کیوں پھٹا..... یعنی کل ہی مجھے انٹرویو لینے ہے..... دو دن پہلے ہی بتا دیا ہوتا۔ کل اتوار ہے۔ اگر میرے کچھ ایجنٹ منٹس ہوئے تو۔“

”کوئی ایجنٹ منٹ نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں۔“

”آپ یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتے ہیں۔“

”مجھے علم ہے۔ تمہارے بارے میں کیا نہیں جانتا۔“

”میں کل دن بھر شہر سے باہر رہوں گا۔“

”اس کا فیصلہ تم نے ابھی اور اسی وقت کیا ہے۔ پہلے سے کوئی پروگرام نہیں تھا۔“

”کچھ بھی سہی..... میں تو.....!“

”کل اتوار ہی سہی لیکن تم ڈیوٹی پر ہو۔“

”اے خدائے لم یزل.....!“ حمید چھت کی طرف ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”اب ان کی بھی ڈیوٹی کہیں لگوا ہی دے..... کچھوں تک کے جوڑے لگائے ہیں تو نے..... مگر ان کی باریکوں دیر اتنی کر دی۔“

”کل ٹھیک گیارہ بجے..... مارشٹن روڈ..... شاپ نمبر گیارہ.....!“ فریدی دروازے کی طرف مڑتا ہوا بولا۔

وہ جا چکا تھا اور حمید سر تھامے بیٹھا سوچ رہا تھا کہ آیا اسی شکل و صورت میں اُسے یہ نامعقول ڈیوٹی انجام دینی پڑے گی۔

کئی ماہ سے کوئی خاص کام حصے میں نہیں آیا تھا۔ اُس نے سوچا شاید اب اس کی کسر نکلنے والی ہے۔

لیکن یہ درزی خانے کی کیوں سوچھی۔ اس کی دانست میں تو اس دوران میں سرے سے کوئی ایسا کیس آیا ہی نہیں تھا جس کے لئے اس قسم کے کھڑاگ کرنے پڑتے۔

وہ وہاں سے اٹھ کر لائبریری میں آیا۔ آج کے کئی اخبار میز پر پڑے ہوئے تھے۔

”ضرورت ہے۔“ کے کالموں پر نظر دوڑانی شروع کی اور بالآخر وہ اشتہار مل ہی گیا۔ انداز کہہ رہا تھا کہ کئی دن سے شائع ہوتا رہا ہے۔

ٹپ ٹاپ لیڈر نیلرز کو کچھ کاریگروں اور کٹرز کی ضرورت تھی۔ پتہ وہی تھا جو کچھ دیر قبل فریدی نے بتایا تھا۔ شاپ نمبر گیارہ مارشٹن روڈ۔

”بھنگی بھی بننا پڑے گا کسی روز۔“ حمید بڑبڑاتا ہوا لائبریری سے نکل آیا۔

بہر حال یہ رات تو میری ہے۔ اس نے سوچا۔ اُوہ..... قاسم کیوں نہ اُسے بھی اسی راہ پر لگایا جائے۔ وقت اچھا گزرے گا۔

کچھ دیر بعد اس نے قاسم کے فون کے نمبر ڈائل کئے۔ دوسری طرف سے اُس کی آواز سن لینے کے بعد اس نے کہا۔ ”اب تمہیں اپنی نجی دوکان کھولنے کی ضرورت نہیں۔ اختیارات کے وائٹ والے کالم میں دیکھو۔ مارشٹن روڈ کی شاپ نمبر گیارہ میں ٹپ ٹاپ نیلرز ہیں۔ انہیں کاریگروں کی ضرورت ہے۔ کل گیارہ بجے وہ انٹرویو لیں گے۔ عرضی لے کر چلے آتا۔“

”مغر..... مغر..... ابھی تو مجھے فچھ بھی نہیں آتا۔ یعنی کہ کپڑا کاٹنا وغیرہ۔“

”رہے نہ گھامڑ ہی..... ابے ساری رات پڑی ہے..... بیوی سے سیکھ لے..... فی الحال جپیر اور شلوار کافی ہوں گے۔“

”اچھا..... اچھا..... مغر..... میں نو قری قروں غاقیے..... مطلب یہ کہ ابا جان۔“

”بھیس بدل دیا جائے گا..... بس کل صبح ہی صبح کسی طرح نکل بھاگو۔“ حمید نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔



”یہ تو گھلے والی بات ہے۔“ قاسم اپنی ہنسی روک کر بڑبڑایا۔

پھر اُس نے اُس کے کمرے کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنی اور اُس کے چہرے پر مایوسی کے بادل چھا گئے۔

لیکن پھر یک بیک آنکھیں چمک اٹھیں۔

”وہ مارا..... قاسم بن گیا۔“ وہ دیدے چمکا چمکا کر بڑبڑاتا رہا۔ ”اتنی دیر جاگی ہے۔ اب دس بجے سے پہلے نہیں اٹھ سکے گی۔ بس منہ اندھیرے نقل بھاغوں غا..... پتہ بھی نہ چلے گا چپاتی بنیم تو.....!“

اور یہی ہوا بھی۔ وہ اپنے چٹکیاں لے لے کر جاگتا رہا۔ ساڑھے پانچ بجے چپ چاپ کوشی سے نکلا اور کچھ دور پیدل چلنے کے بعد ایک ٹیکسی پکڑ لی۔ پھر یہ اور بات ہے کہ ڈرائیور کو فریدی کی کوشی کا پتہ بتا کر پچھلی سیٹ پر خراٹے لینے لگا ہو۔ اب ذہن پر قابو ہی نہیں رہ گیا تھا۔ ٹیکسی کا انجن راستے بھراتا زیادہ شور مچاتا آیا تھا کہ قاسم کے خراٹے ڈرائیور کے کانوں میں نہیں پڑے تھے۔

لہذا فریدی کی کوشی کے قریب پہنچ کر جب اس نے ٹیکسی روکی تو بُری طرح بوکھلا گیا۔ قاسم ہی کی طرح اُس کے خراٹے بھی عجیب تھے۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دو کتے ایک دوسرے پر جھپٹ پڑنے سے پہلے غرارہے ہوں۔

ٹیکسی باہر ہی اس لئے روکنی پڑی تھی کہ پھاٹک بند تھا۔

”صاحب..... صاحب۔“ اس نے قاسم کو آواز دی۔ لیکن قاسم کو ہوش کہاں۔ پوری رات جاگتے رہنے کے بعد سویا تھا۔ نیند بھی بے ہوشی ہی کی طرح ہوئی تھی۔ وہ غل غپاڑے کو کب خاطر میں لاتا۔ ڈرائیور نے کئی بار آوازیں دیں۔ لیکن صرف خراٹے سنتا رہا۔ آخر اس نے ہاتھ بڑھا کر اُسے جھنجھوڑنا شروع کیا۔

ایک بار خراٹے رک گئے۔ قاسم نے منہ چلاتے ہوئے ”غاؤں غاؤں“ کہا اور پھر خراٹے شروع کر دیئے۔

ذہنی جھٹکے

”میں کہتی ہوں تمہیں آخر ہو کیا گیا ہے۔“ قاسم کی بیوی چنچنائی۔

”بس شلوار کاٹنا اور سکھا دو۔“

”تمن بچ رہے ہیں..... گھڑی کی طرف بھی دیکھو.....!“

”بب..... بس..... جلدی سے سیکھ لوں گا۔ ٹانگیں ہی ٹانگیں تو ہوتی ہیں اس میں۔“

”میں کہتی ہوں تمہیں یہ سوچھی کیسے.....؟“

”پھر وقت کیسے کٹے غاسالا.....!“

”تو یہ وقت کاٹنے کے لئے رت جگا ہو رہا ہے۔“

”غاں..... غاں.....!“

”ایسی کی تیمی..... میں تو سونے جا رہی ہوں۔“

”کس کی ایسی کی تیمی..... میری.....؟“ قاسم نے غرا کر پوچھا۔

”سب کی ایسی کی تیمی.....!“ قاسم کی بیوی نے نیند کی جھونک میں کہا۔

”یعنی ابا جان قی بھی.....!“

”ہاں.....!“ نیم غنودہ ذہن کا جواب تھا۔

قاسم نے اتنے زور سے تہقہ لگایا کہ وہ پوری طرح ہوش میں آ گئی۔

”کیوں دھاڑیں مار رہے ہو.....!“ وہ غصیل آواز میں بولی۔

”ابا جان..... بابا بابا..... ہی ہی ہی۔“

”کہاں..... کدھر.....؟“ وہ بوکھلا کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔

قاسم ہنستا ہی رہا..... اور وہ جھلا کر کمرے سے چلی گئی۔

”کیا مصیبت ہے۔“ ڈرائیور بے بسی سے بڑبڑایا اور پھر اُسے جھنجھوڑنے لگا۔ لیکن نتیجہ معلوم۔ صرف اتنا ہوتا کہ چند لمحوں کے لئے خرائٹے رک جاتے اور ”غاؤں غاؤں“ شروع ہو جاتی۔ ہاتھ پیر اس طرح ہلتے جیسے کوئی ضدی بچہ کسی بات پر پھیل کر پھل رہا ہو۔

جب ٹیکسی ڈرائیور کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو اُس نے زور زور سے ہارن بجانا شروع کر دیا۔ لیکن قاسم کی نیند نہ ٹوٹی..... فریدی لان پر چہل قدمی کر رہا تھا۔ ہارن کی مسلسل آوازیں سن کر پھانک کے قریب آیا۔

اب کسی قدر اُجالا پھیل گیا تھا۔

ڈرائیور نے فریدی سے کہا۔ ”صاحب یہ یہاں آئے تھے اب سو گئے ہیں تو اٹھتے ہی نہیں کسی طرح۔“

”یہاں آئے تھے۔“

”جی ہاں..... یہیں کا پتہ بتایا تھا۔“

فریدی پھانک کھول کر باہر آیا۔ قاسم پر نظر پڑتے ہی طویل سانس لے کر بولا۔ ”اندر لے چلو گاڑی۔“

حمید شائد ابھی تک سو ہی رہا تھا۔ گاڑی کمپاؤنڈ سے گزر کر پورچ میں آڑکی۔

فریدی نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر پہلے تو قاسم کو بخجھوڑ کر اٹھانے کی کوشش کی پھر بائیں کان کے نیچے انگوٹھے سے دباؤ ڈالا۔

”ارے باپ رے۔“ یک یک قاسم دھاڑ کر سیدھا ہو بیٹھا اور پھر عجیب طرح کی آوازیں اس کے حلق سے نکلنے لگیں۔ جن میں خوفزدگی اور بوکھلاہٹ دونوں ہی شامل تھیں۔

”جج..... جی..... غوپ..... ہی ہی ہی۔“

”کیا بات ہے؟“

”میں سو گیا تھا شائد۔“

”تو اب نیچے تو اتر آؤ۔“

”جج..... جی ہاں..... غاں.....!“

قاسم نے ٹیکسی سے اتر کر کرایہ ادا کیا۔

ذہن اب پوری طرح جاگ اٹھا تھا اور قاسم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس وقت آنے اور اس طرح ٹیکسی میں سو رہنے کی وجہ کیا بتائے گا۔

”سب خیریت ہے۔“ فریدی نے نرم لہجے میں کہا۔

”اجی کھیریت ویریت کہاں۔“ قاسم نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔ ”بڑی مصیبت میں پڑ گیا ہوں۔“

”کیسی مصیبت.....!“

”بڑے بڑے خواب دکھائی دیتے ہیں۔ رات بھر نیند نہیں آتی۔“

”خوب..... بتاؤ میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں۔“

”آپ میرے لئے..... ہی ہی ہی..... قیامتوں فچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“

”بہر حال آئے تو کسی مقصد ہی کے تحت ہو گے۔“

”جی غاں..... وہ حمید بھائی۔“

”اوہ تو اُن خوابوں کا تعلق اُسی سے ہے۔“

”جی غاں..... غاپ..... سن نہیں۔“

”وہ ابھی سو رہا ہے۔“

”میں التجا کروں غا.....!“

”کیا اُس نے تمہیں باایا تھا۔“

”جی ہاں..... جی ہاں۔“

”کیوں.....؟“

”پپ پتہ نہیں..... جی ہاں..... بب بالکل پتہ نہیں۔“

”تو اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو.....؟“

یہ عمارت دوسری جنگ عظیم کے دوران بنائی گئی تھی۔ اس سڑک سے فوجی گاڑیوں کے قافلے گزر کر اندرون ملک جاتے تھے اور ہر پچاس میل پر ایسی ایک عمارت ضرور ملتی تھی۔

بعد میں ان میں سے کچھ تو منہدم ہو گئی تھیں اور کچھ محکمہ جنگلات کے کام آئی تھیں۔ لیکن یہ عمارت عرفان نے بڑی کوششوں کے بعد خرید لی تھی۔ وہ ایک کمرشل آرٹس تھا۔ جب شہر کے ہنگاموں سے اکتا جاتا تو ادھر ہی کارخ کرتا۔ شہر میں اس کا اچھا خاصا کاروبار تھا تجارتی حلقوں میں اس کا کام بہت مقبول تھا۔

جنگل کے دوران قیام میں وہ خالص آرٹ کے نکتہ نظر سے پینٹنگ بھی کیا کرتا تھا اور یہ پینٹنگس یا تو اُس کے ڈرائنگ روم کی زینت بنتیں یا مخصوص دوستوں میں تقسیم ہو جاتیں۔ وہ انہیں فروخت نہیں کرتا تھا۔ اس کا مقولہ تھا کہ وہ تخلیقات جو کسی جذباتی لگاؤ کا نتیجہ ہوں ترازو میں نہیں تل سکتیں۔ ان کی اصل قیمت ذوق سلیم ہوتا ہے۔

ان دنوں بھی وہ تجارتی کاموں سے تھک کر یہاں اس ویرانے میں آ پڑا تھا اور کیڑوں پر ایک اچھوتے خیال کو رنگوں میں مقید کرنے کی کوشش جاری تھی۔

وہ ایک خوش شکل اور خوش لباس آدمی تھا۔ عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ چند اصولوں کے تحت زندگی بسر کرنے کا قائل تھا۔ اپنے دوسرے ہم پیشہ لوگوں کی طرح لاابالی پن کا شکار نہیں تھا۔ تجارتی کاموں سے اتنا کمالیتا تھا کہ اس کے متعلقین اطمینان اور آسائش کی زندگی بسر کرتے تھے۔

شہر سے یہاں تک وہ اپنی چھوٹی سی اسٹیشن وگن میں آتا تھا اور جتنے دن قیام کرنے کا ارادہ ہوتا اسی کی مناسبت سے ضروریات زندگی بھی اس کے ساتھ ہوتیں، روزمرہ کے کام بھی خود ہی انجام دیتا تھا۔ اگر اس کے لئے مددگار کو بھی ساتھ لاتا تو تنہائی کیسے برقرار رہتی۔ تنہائی جو اس کے منفرد تخلیقی کارناموں کی ماں تھی۔ تنہائی جو اس کی تفریح بھی تھی اور آرام جان بھی۔

حسب معمول وہ آج بھی طلوع آفتاب سے پہلے ہی بیدار ہوا تھا اور ضروریات سے فارغ ہو کر اب اسٹودو پر چائے کے لئے پانی رکھنے جا رہا تھا۔

”حق..... قید خانے سے نقل بھاغا ہوں۔“ قاسم نے جلدی سے کہا۔ پھر سنبھل کر زیر لب بڑبڑایا۔ ”ارے باپ رے یہ کیا کہہ دیا۔“

”ہوں.....؟“

”جی قچہ نہیں۔“

”کس قید خانے سے نکل بھاگے ہو۔“

”مجھے بہت زور سے نیند لگ رہی ہے..... یاد نہیں کہ ابھی میں نے کیا کہا تھا۔“

”جی..... ہاں.....!“

”اور یہ کس قید خانے کا تذکرہ تھا۔“

”پتہ نہیں۔“ قاسم تھوک نکل کر بولا۔ ”مجھے یاد نہیں۔“

”میرا خیال ہے کہ آج شاید اُس سے تمہاری ملاقات نہ ہو سکے۔ وہ بہت مشغول رہے گا۔“

”تو پھر بلایا قیوں تھا.....؟“ قاسم جھنجھلا گیا۔

”ہوں..... اچھا.....!“ فریدی کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”بہتر یہی ہے کہ تم بھی کچھ دیر سو لو۔“

”الاقسم..... میرا بھی یہی جی چاہتا ہے۔“

”تو آؤ میرے ساتھ۔“ فریدی نے دروازے کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔



عرفان کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ سڑک کے اُس پار دور تک بکھرے ہوئے سرسبز درخت کھر کی ہلکی سی چادر میں لپٹے ہوئے تھے۔ سڑک سناں پڑی تھی اور یہ چھوٹی سی عمارت جس کی ایک کھڑکی سے عرفان باہر دیکھ رہا تھا اس ویرانے میں بڑی عجیب سی لگ رہی تھی۔ دور دور تک آبادی کا نام و نشان تک نہیں تھا۔

جسم پر اسکرٹ اور بلاؤز تھے۔ پیروں میں اسٹاکنکس ضرور تھے لیکن جوتے نہ ارد۔
 عرفان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُسے ہوش میں کس طرح لائے۔ پتہ نہیں کہاں چوٹ
 آئی ہو۔ ہڈیوں کو گزند پہنچنے کا احتمال تھا۔ دیوار کافی بلند تھی۔

کچھ دیر بعد وہ کسمائی۔ زبان بھی ہلی تھی اور آواز میں ایک بامعنی لفظ کی تکرار تھی۔
 ”زنجیر..... زنجیر.....!“

اور پھر سکوت طاری ہو گیا تھا۔ آنکھوں کے پوٹے متحرک تھے۔ لیکن وہ کھلی نہیں تھیں۔
 بالکل ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ گہری نیند میں بڑبڑا کر پھر خاموش ہو گئی ہو۔
 عرفان دم بخود کھڑا رہا۔

وہ صورت سے یوریشین لگ رہی تھی۔ لیکن لفظ ”زنجیر“ کی تکرار اردو ہی میں ہوئی تھی۔
 لہجہ بھی دیسیوں ہی جیسا تھا۔

تقریباً بیس منٹ بعد وہ پوری طرح ہوش میں آ گئی۔ بوکھلا کر چاروں طرف دیکھ کر
 کراہتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔

”میں..... لک..... کہاں ہوں۔“

”آپ..... آپ.....!“ عرفان کی سمجھ میں نہ آیا کہ اُسے کیا بتائے۔

”اُوہ..... خدا کے لئے مجھے بچائیے۔“ وہ کہتی ہوئی اچھل کر پلنگ سے اتر آئی۔ ”مجھے
 کہیں چھپائیے..... وہ بھیڑیا یہاں ضرور آئے گا۔“

”کون.....؟“

”مجھے چھپائیے..... میں پھر بتاؤں گی۔ یہ جگہ اُس کی نظر سے پوشیدہ نہ رہ سکے گی۔“

”مم..... میں کہاں چھپاؤں؟“

”میرے ہینڈ بیگ..... میرے جوتے..... میرا کوٹ.....!“

”وہ سب وہیں صحن میں پڑے ہوئے ہیں۔“ عرفان نے کہا۔

”انہیں بھی چھپائیے..... مجھے بھی چھپائیے..... جلدی سے کچھ کیجئے۔ ورنہ آپ کو بعد

دفعتاً اُسے محسوس ہوا جیسے کمرے کے صحن میں کوئی وزنی چیز کافی بلندی سے گری ہو۔ وہ
 چونکا ہی تھا کہ اب پہلی آواز سے مشابہ کسی قدر ہلکی آواز سنائی دی۔

وہ تیزی سے صحن میں آیا اور اُس کے ہونٹ سیٹی بجانے کے سے انداز میں سکڑ کر رہ
 گئے۔ آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

وسط صحن میں چڑے کا ایک چھوٹا سا سوٹ کیس پڑا نظر آیا۔ اُس سے تھوڑے ہی فاصلے
 پر کاسنی رنگ کا ایک لیڈر زکوٹ بھی پڑا تھا۔

اس کی نظر سامنے والی دیوار کی طرف اٹھ گئی۔ جس کے عقب سے ایک انسانی سر ابھر کر
 آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا۔

عرفان کے ہونٹ کھل گئے آواز نہ نکلی..... یہ کوئی عورت تھی۔ دھندلے میں چہرہ صاف
 نظر نہیں آ رہا تھا۔ پتہ نہیں اس نے بھی عرفان کو دیکھ لیا تھا یا نہیں۔

پھر دیوار کے اوپر پہنچ کر اس نے صحن میں چھلانگ لگا دی۔
 دیوار کم از کم تیرہ فٹ ضرور اونچی رہی ہوگی۔

وہ اس طرح صحن میں آ گری تھی کہ خود سے اٹھنا محال ہی معلوم ہو رہا تھا۔ عرفان اس کی
 طرف جھپٹا۔

لیکن قریب پہنچتے پہنچتے چھلانگ لگانے والی کا جسم ساکت ہو چکا تھا۔

عرفان نے جھک کر دیکھا۔ سانس کی رفتار نارمل تھی۔

”بیہوش ہو گئی۔“ وہ آہستہ سے بڑبڑایا۔

نبض دیکھی وہ بھی معمول کے مطابق چل رہی تھی۔

بالآخر وہ اُسے کمرے میں اٹھا لایا۔ کمرے میں ابھی تک کیرو سین لیمپ روشن تھا۔

اب وہ اس کے خدو خال واضح طور پر دیکھ سکا۔

رنگت سے یوریشین معلوم ہوتی تھی۔ بال سرخی مائل بھورے تھے۔ جسم متناسب۔ عمر زیادہ

سے زیادہ چوبیس یا پچیس سال رہی ہوگی۔

میں افسوس ہوگا۔ وہ مجھے مار ڈالے گا۔“

”کون.....؟“

”خدا کے لئے وقت نہ ضائع کیجئے۔ رحم کیجئے میرے حال پر۔“

”یہاں..... یہی دو کمرے ہیں اور ایک کٹھری۔“

”مجھے اس میں مقفل کر دیجئے..... جلدی کیجئے۔ صحن کدھر ہے۔ میری چیزوں کو بھی اس

کی نظر میں نہ آنا چاہئے۔“

عرفان اُسے صحن میں لایا اور وہ مضطربانہ انداز میں اپنی چیزیں سمیٹنے لگی۔ کوٹ اٹھاتے ہی اُس میں لپٹے ہوئے بغیر ایڑیوں والے پاٹ جوتے نکل کر فرش پر آ رہے۔ وہ انہیں اٹھانے کے لئے پھر جھکی۔

”ٹھہریئے..... میں اٹھائے لیتا ہوں۔“ عرفان بولا۔

کچھ دیر بعد وہ اُس چھوٹی سے کٹھری میں بند کی جارہی تھی جس کا مصرف ہی آج تک عرفان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

کنڈی چڑھا کر عرفان نے اُس میں قفل لگا دیا۔

اس کی حیرت ابھی تک برقرار تھی۔

اس سنسان جنگل میں اُس لڑکی کا کیا کام..... بوریشین معلوم ہوتی تھی لیکن اردو کسی اہل زبان کی طرح بولتی تھی۔ اُسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس پوری گفتگو کے دوران انگریزی کا ایک لفظ بھی اس کی زبان سے نہیں نکلا تھا اور پھر بے ہوشی کے عالم میں بھی اردو ہی کے الفاظ زبان سے ادا ہونے کا مطلب یہی تھا کہ وہ بیداری کی حالت میں سرے سے انگریزی بولتی ہی نہیں۔ ورنہ اپنے یہاں کے دوغلی نسل والے سفید قاموں کی ثانوی زبان تو اردو ہو سکتی لیکن روزانہ زندگی میں وہ انگریزی ہی بولتے ہیں۔

ابھی وہ اسی الجھن میں تھا کہ کوئی باہر سے دروازہ پیٹنے لگا۔

”یہاں کون ہے..... دروازہ کھولو.....!“ ایک گونجیلی اور بھاری آواز بھی آئی۔

عرفان کی رگوں میں خون کی روانی تیز ہو گئی۔

”کون ہے.....؟“ خود اُس نے اونچی آواز میں پوچھا۔

”ہے..... دروازہ کھولو.....!“ وہی آواز پھر آئی۔

عرفان کمرے سے گذر کر صدر دروازے تک آیا اور کانپتے ہوئے ہاتھ سے کنڈی کھول دی۔ کوئی دروازے کو دھکا دیتا ہوا اندر گھس آیا۔ اگر عرفان اچھل کر پیچھے نہ ہٹ گیا ہوتا تو پیشانی یقیناً زخمی ہو جاتی۔

”یہ کیا لغویت ہے.....!“ اُس نے غصیلی آواز میں کہا۔

”یہاں کوئی لڑکی آئی ہے۔“ آنے والے نے غرا کر پوچھا۔

”کیسی لڑکی..... تم کون ہو اور اس طرح.....!“

”خاموش رہو..... صرف میری بات کا جواب دو۔“ آنے والے نے کہا۔

عرفان نے اُسے نیچے سے اوپر تک دیکھا۔ خاصے تن و توش کا آدمی تھا۔ جڑے بھاری تھے اور پیشانی کی وریدیں ابھری ہوئی تھیں۔

”کیا میں تم سے پوچھ سکتا ہوں کہ تم اس طرح یہاں کیوں گھس آئے۔“ عرفان نے اپنے لہجے میں سختی پیدا کر کے کہا۔ وہ خائف نہیں تھا۔

”میں پوچھ رہا ہوں یہاں کوئی لڑکی آئی ہے۔“

”نہیں..... یہاں میں تنہا رہتا ہوں۔“

”میں خود دیکھنا چاہتا ہوں.....!“ وہ آگے بڑھتا ہوا بولا۔

”ٹھہرو۔“ وہ آگے بڑھ کر کمرے کے دروازے کے درمیان حائل ہوتا ہوا بولا۔ ”میں جنگل میں مقیم ضرور ہوں لیکن جنگل کے قانون کے آگے سر نہیں جھکا سکتا۔“

”اوہ.....!“ اجنبی ایک قدم پیچھے ہٹ کر اُسے گھورنے لگا۔

پہلے تو اُس کے چہرے پر کڑھکی نظر آئی پھر آہستہ آہستہ وہ کڑھکی ایک لمبی سی مسکراہٹ میں تبدیل ہو گئی۔ دہانہ آدھے گالوں تک پھیل گیا تھا اور دانت نظر آنے لگے تھے۔ عرفان

”نہیں۔“ اس بار عرفان نے بہت زیادہ حیرت ظاہر کی۔

”دراصل ہماری فرم زیورات کی تجارت کرتی ہے۔ یہ لڑکی ہمارے شوروم میں سیلز گرل

تھی اور جواہرات کا کاونٹر اس کے سپرد تھا۔ لاکھوں کی مالیت کے جواہرات لے اڑی ہے۔“

”اوہ.....!“ عرفان سوچ میں پڑ گیا کہ اُسے کیا کرنا چاہئے۔

کچھ دیر خاموشی رہی پھر اس نے کہا۔ ”اس دیرانے میں اس عمارت کے علاوہ اور کوئی ایسی

جگہ نظر نہیں آتی جہاں وہ پناہ لے سکے۔ ہو سکتا ہے بھوک اور پیاس اُسے ادھر آنے پر مجبور کرے۔“

”ممکن ہے..... ممکن ہے.....؟“ عرفان مضطربانہ انداز میں بولا۔

”تو پھر مجھے یہیں ٹھہرنا چاہئے اور اس طرح کہ اُسے علم نہ ہونے پائے اور یہ عمارت اس

کے لئے چوہ دان بن جائے۔“

”جی..... ای..... کیا مطلب.....؟“

”ایک چور کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے میرے ہاتھ بٹائیے۔“

”لع..... یعنی..... کہ آپ یہاں قیام کریں گے۔“

”ہاں..... کیا حرج ہے۔ میں آپ کے مشاغل میں حارج نہیں ہوں گا۔ ویسے بھی مجھے

مصوری سے لگاؤ ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ لیکن کیا اُسے کچھ اور آدمی بھی تلاش کر رہے ہیں۔“

”نہیں..... صرف میں ہی۔“

”تب تو یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ادھر ہی کا رخ کرے ممکن ہے کسی اور طرف نکل

جائے۔ اگر دو چار اور بھی اس جنگل کی نگرانی کر رہے ہوتے تب تو آپ کا یہاں قیام کرنا یقیناً

مفید ثابت ہوتا۔“

”مجھ سے بحث نہ کرو سمجھے..... میں چاہتا تھا کہ مجھے سختی نہ کرنی پڑے۔ لیکن اگر تم مجھے

اس پر مجبور کرتے رہے تو.....!“

”اوہ..... یہ بات ہے۔“ عرفان اٹھتا ہوا بولا۔

فیصلہ نہ کر پایا کہ یہ مسکراہٹ تھی یا کسی کھکھنے کتے نے دانت نکالے تھے۔

”میں اطمینان کرنا چاہتا ہوں۔“ اس بار اجنبی نے کسی قدر نرم لہجے میں کہا۔

”سنئے جناب۔“ عرفان ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”میں شہر سے یہاں ہمیشہ تنہا آتا ہوں اور اس

قسم کا آرٹسٹ نہیں ہوں جیسے عام طور پر ہوتے ہیں۔ مجھے لڑکیوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔“

”اوہ..... تو تم آرٹسٹ ہو۔“

عرفان نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سر کو اثباتی جنبش دی۔

”میرا مطلب تھا کہ یہاں اچانک کوئی لڑکی تو نہیں آئی۔“

”یہاں اچانک!“ عرفان نے لہجے میں تحیر پیدا کر کے کہا۔ ”اس جنگل میں۔“

”یہاں..... یہاں..... کیا تم نہیں جانتے کہ یہاں سے پانچ میل کے فاصلے پر ایک

ریلوے لائن بھی گذرتی ہے۔“

”میں نہیں جانتا۔“ عرفان بولا۔

”وہ دراصل بہت بڑی مالیت کے زیورات چرا کر بھاگی ہے۔ بذریعہ ریلوے ٹرین ادھر

ہی آئی تھی۔ ایک دیہاتی اٹیشن پر اترنے کی خبر ملی تھی۔ خیال ہے کہ اُس نے انہیں جنگلوں میں

پناہ لی ہے۔“

”اوہ..... آئیے..... بیٹھے.....“ عرفان نے کمرے میں داخل ہو کر کرسیوں کی طرف

اشارہ کر کے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے..... اگر آپ پہلے ہی بتا دیتے تو۔“

”کوئی بات نہیں ہے..... اس لڑکی کی وجہ سے ہمیں بہت پریشانیاں اٹھانی پڑی

ہیں..... اس لئے۔“

”ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے۔“ عرفان سر ہلا کر بولا۔ ”گھریلو ملازمائیں بڑی پریشانیوں کا

باعث بن جاتی ہیں۔“

”آپ غلط سمجھے ہیں۔ وہ کوئی گھریلو ملازمہ نہیں۔ ایک خوش چمکن اور جواں سال یوریشین

ہے۔“

”بیٹھ جاؤ۔“ اجنبی غرایا۔

اور عرفان اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا ریوالبور دیکھ رہا تھا جس کا رخ اسی کی طرف تھا۔

خون کی لکیر

حمید نے آئینے میں شکل دیکھی اور پائپ کا کش لے کر مخصوص انداز میں ہونٹوں سے دھواں نکالتا رہا۔ اُسے اپنی ننھی سی فرنج کٹ ڈاڑھی گراں نہیں گذر رہی تھی۔ باریک ترشی ہوئی مونچھیں بھی کسی قدر آرنٹک بنی تھیں۔ آنکھوں پر ریم لیس فریم والی عینک..... یہ میک اپ اس نے خود ہی کیا تھا۔

کارخانہ بہر حال جم گیا تھا۔ کچھ لڑکیاں آئی تھیں انٹرویو کے لئے۔ حمید کو اس سلسلے میں فریدی سے کوئی ہدایت نہیں ملی تھی کہ کاریگروں کے انتخاب میں کسی خاص صنف کا خیال رکھا جائے لہذا اس چھوٹ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے ایک بھی مرد کاریگر کا انتخاب نہیں کیا تھا۔ ایک لڑکی تو اُسے اتنی اچھی لگی تھی کہ لڑ بھڑ کر اس کا انتخاب تو یقیناً کرتا۔ کنگ کے لئے ایک معمر اور بہت تجربہ کار عورت رکھی گئی تھی۔

کارخانہ تو قائم ہو گیا تھا۔ لیکن سوال تھا کام کا فوراً ہی کام بھی کہاں سے پک پڑتا۔ اس وقت حمید بحیثیت منیجر ان لڑکیوں کو کچھ ہدایات دیتے دیتے خاموش ہو گیا تھا اور پائپ کو راکھ دان میں خالی کر کے تازہ تمباکو بھرتے ہوئے سوچا تھا کاش قاسم کو بھی اس دھندے میں شامل کرنے کی اجازت ملی ہوتی۔

وہ بے چارا اسی کے لئے رات بھر جاگتا رہا تھا۔ لباس تراشی کی مشق بہم پہنچائی تھی اور منہ اندھیرے اس کے پاس دوڑا آیا تھا۔ لیکن فریدی نے اپنی خواب گاہ میں سلا کر اس کی بیوی کو نوں کر دیا تھا کہ وہ وہاں سو رہا ہے۔ لیکن جب تک نیند پوری نہ کر لے اُسے جگایا نہیں جاسکے گا۔

حمید کو گیارہ بجے ٹیلنگ ہاؤس میں کاریگروں کا انٹرویو لینا تھا اس لئے اُسے اس کے بیدار ہونے سے پہلے ہی چلا جانا پڑا تھا۔ اب اس وقت وہ سوچ رہا تھا کہ اگر کہیں سے قاسم ہاتھ لگے تو جی بھی پہلے۔ ورنہ یہ ٹیلنگ شاپ تو اُس کی زندگی تباہ کر ڈالے گی۔

لڑکیاں سیدھی سادھی معلوم ہوتی تھیں۔ وہ جو زیادہ پسند آئی تھی اپنے رویے میں کسی قدر شوخی کی جھلکیاں ضرور رکھتی تھی۔ لیکن مقام بھی معلوم ہوتی تھی۔ پھر پہلا دن ہی تو تھا۔ ادھر یہ احساس کہ اسے اُن لڑکیوں پر بالادستی حاصل ہے اور یہی احساس تفریح کر کر کے دینے کے لئے کافی تھا۔

اُسے تو عموماً ایسی لڑکیوں سے دلچسپی ہوتی تھی جو اُس کی پہنچ سے باہر ہوں اور ان تک پہنچنے کے لئے اُسے خاصی جدوجہد کرنی پڑے۔

بہر حال مبر کے علاوہ چارہ ہی کیا تھا۔

دفعتاً اُس نے محسوس کیا کہ وہ لڑکی جو اُسے زیادہ پسند آئی ہے کچھ کہنا چاہتی ہے۔

”کیا بات ہے؟ کیا مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو؟“

”جی ہاں..... بشرطیکہ آپ اسے پسند فرمائیں۔“

”کیا پسند فرماؤں.....؟“

”مطلب یہ کہ.....!“

”بات کم سے کم الفاظ میں ہونی چاہئے۔“

”ایک مرد کسز بھی ضروری ہے یہاں کے لئے.....!“

”کیوں.....؟“

”اس لئے کہ یہاں صرف خواتین کے ملبوسات تیار کئے جائیں گے۔“

”میں اب بھی نہیں سمجھ سکتا کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو۔“

”نفسیاتی نکتہ نظر سے اس مسئلے پر غور کیجئے۔“

”اب درزی خانے میں بھی نفسیات چلے گی۔“ حمید نے کسی قدر غصیلے لہجے میں کہا۔

”ہاں جناب..... زندگی کے ہر شعبے میں نفسیات کو دخل ہے؟“

”تو پھر یہاں کپڑے سینے کیوں آئی ہو۔ کسی کالج وائج کی لیکچرر شپ کے لئے دوڑ دھوپ کی ہوتی۔“

”سخت نفرت ہے اس زندگی سے ورنہ آپ کی اطلاع کے لئے میں نے پچھلے ہی سال نفسیات میں ایم اے کیا ہے۔“

”تو پھر آپ اس درزی خانے ہی کو کلاس روم بنا کر رکھ دیں گی۔“

”مجھے دستکاری سے دلچسپی ہے۔“

”تو پھر نفسیات میں کیوں جھک مارتی رہی تھیں۔“

”اوہ..... ٹھہریے۔ وہ دیکھئے کچھ خواتین ادھر آ رہی ہیں۔ کم سے کم اجرت بتائیے۔“

”میں نے ٹیلرنگ میں ڈاکٹریٹ لی تھی۔“ حمید نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

تین عورتیں دوکان میں داخل ہوئیں۔ مختلف ملبوسات کی اجرتوں کے بارے میں پوچھتی رہیں اور جلد ہی واپس آنے کا وعدہ کر کے واپس چلی گئیں۔

حمید نے دیکھا کہ وہ لڑکی منہ پر دوپٹہ رکھ کر ہنس رہی ہے۔

اس کا نام رضیہ تھا۔

”کیا یہ بھی کوئی نفسیاتی لمحہ ہے۔“ حمید نے برا سامنہ بنا کر پوچھا۔

”آپ ان سے بالکل کسی پروفیسر کے انداز میں گفتگو کر رہے تھے۔“

”میں پیرس کی ایک بہت بڑی دوکان پر کام کر چکا ہوں۔“ حمید نے فخریہ لہجے میں کہا۔

”اوہ..... لیکن میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ آپ جسوں کی پینکشن کے شوق میں اس طرح در بدر ہوئے ہیں۔“

”کیا مطلب..... ہائیں۔“ حمید نے آنکھیں نکالیں۔ ”پہلے ہی دن اتنی بے تکلفی..... میں اسے پسند نہیں کرتا۔“

”معافی چاہتی ہوں جناب..... نفسیاتی مسائل زبان پر ضرور آ جاتے ہیں۔ آخر ایم اے

کیا تھا نفسیات میں اور میں تو یہاں تک کہہ سکتی ہوں کہ آپ کا غصہ قطعی مصنوعی ہے۔ آپ نے پسند فرمائی ہے میری بے تکلفی۔“

”ارے..... ارے.....!“

”اگر سینے کا کپڑا ہوتا تو میری زبان اس ”حجامیت“ سے باز رہتی۔“

”حجامیت..... میں نہیں سمجھا۔“

”حجام سے بنائی ہے۔ درزی کی قینچی خاموشی سے چلتی ہے اور حجام کی قینچی کے ساتھ زبان بھی چلتی رہتی ہے۔“

”معلوم ہوتا ہے کہ تم مجھے دوبارہ لوہڑ پر انٹری میں داخل کراؤ گی۔“

”ویسے آپ بھی مجھے خوش مزاج ہی معلوم ہوتے ہیں۔“

”محترمہ..... محترمہ..... آپ میری ماتحتی میں کام کریں گی اسے نہ بھولئے۔“

”یہ بھی نفسیاتی۔“

”جنم میں گنی نفسیات..... اب خاموش رہو۔“

”اتنی جلدی غصہ آ جانے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔“ وہ پر تفکر لہجے میں بڑبڑائی۔ ”غالباً بچپن کا کوئی کو مپلکس.....!“

پھر حمید سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ ”کیا آپ کے والدین سخت گیر تھے۔“

”اٹھائی گیر تھے..... تم سے مطلب.....؟“

”لیکن کمال ہے کہ غصے کے عالم میں بھی آپ اس قسم کے ٹکڑے لگا سکتے ہیں۔ بہت ذہین آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ سخت گیر..... اٹھائی گیر..... واہ سبحان اللہ۔“

”میں کہتا ہوں اب چپ بھی رہو۔“

”دوسری لڑکیاں انہیں حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ کبھی کبھی کسی کو اپنی بے ساختہ ہنسی پر قابو پانے کے لئے دوسری طرف بھی مڑ جانا پڑتا۔“

”دفعۃً معر عورت بولی۔“ ”تم واقعی بہت بولتی ہو۔ یہ مناسب نہیں۔ صاحب ٹھیک تو کہتے

عرفان خاموش رہا۔ وہ اب بھی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ اُسے کیا کرنا چاہئے۔ لڑکی کے بارے میں اُسے بتائے یا نہ بتائے۔ لیکن وہ آخر کتنی دیر اس چھوٹی سی کوٹھری میں بند رہ سکے گی۔ اگر یہ آدمی ریوالور کے زور پر یہاں رہ ہی پڑا تو لڑکی کی موجودگی کتنی دیر چھپی رہ سکے گی۔

”تم کیا سوچنے لگے۔“ اجنبی غرایا۔

”کچھ نہیں.....!“

”کیا اب مجھے یہ ریوالور ہاتھ ہی میں لئے رہنا پڑے گا۔“

”آپ اسے جیب میں رکھ لیجئے.....!“ عرفان نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن شریف آدمی ریوالور تو نہیں لئے پھرتے۔“

اجنبی نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”کیا تم محکمہ پولیس کے لوگوں کو شریف نہیں سمجھتے۔“

”پولیس..... اُوہ.....!“ عرفان نے طویل سانس لے کر کہا اور اپنے ہاتھ نیچے گرا دیئے۔ چند لمحے خاموش رہ کر بولا۔ ”تب تو..... تب تو مجھے آپ کے ناشتے کا انتظام کرنا چاہئے۔“

”خوب..... یہ اتنی دیر میں پہلی کام کی ہوئی ہے۔ میں رات سے بھوکا ہوں میرے دوست۔“

اس نے ریوالور جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

”ناشتہ مجھے خود ہی تیار کرنا پڑے گا۔“

”ہم دونوں مل کر کریں گے۔“ اجنبی جلدی سے بولا۔

عرفان سوچ میں پڑ گیا اگر وہ اس مقفل کوٹھری کے بارے میں سوال کر بیٹھا تو کیا ہوگا۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں باورچی خانے میں نظر آئے۔ وہ عرفان سے کہہ رہا تھا۔ ”میں پراٹھے بہت اچھے پکا سکتا ہوں۔“

”اور میں انڈے تلنے کا ماہر ہوں۔“ عرفان نے پھکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔

”تم یہاں اس دیرانے میں کیوں آئے ہو۔“

”کبھی کبھی چلا آتا ہوں کچھ دنوں کے لئے..... ہر آدمی کو کبھی کبھی سکون کی تلاش ضرور ہوتی ہے۔“

ہیں..... تم چاہے جتنی قابل ہو تمہیں ان کی ماتحتی میں کام کرنا ہے۔“

”ارے تو تمہیں کیوں الجھن ہو رہی ہے۔“ رضیہ اُس کی طرف مڑی۔

”ارے میرے منہ نہ لگنا۔ میں نے نفسیات و نفسیات نہیں پڑھی لیکن بولتوں کو چپ کر دینا اچھی طرح جانتی ہوں۔“

”صورت ہی سے ظاہر ہے۔“

”اچھا..... بڑی آئی صورت والی..... جھوٹا پھوک دوں گی.....!“

”اے زبان سنبھال کے.....!“

”چل چکی دوکان۔“ حمید بے بسی سے بولا۔ ”خدا کے لئے خاموش رہو۔ ورنہ یہ گوشت کی دوکان مشہور ہو جائے گی۔“

”اس بڑھیا کو چپ کرائیے۔“ رضیہ بولی۔

”اے لڑکی ہوش میں ہے یا نہیں۔“ معمر عورت رضیہ کی طرف جھپٹی لیکن حمید ان کے درمیان آ گیا۔

”میں کہہ رہا ہوں تم دونوں ہی خاموش رہو ورنہ ابھی ایک دن کی تنخواہ دے کر رخصت کر دوں گا۔ اُوہ..... دیکھو..... وہ خواتین واپس آ رہی ہیں۔ غالباً کپڑا خرید لائیں۔“

دونوں ہی خاموش ہو کر سڑک کی طرف متوجہ ہو گئیں۔



عرفان دم بخود رہ گیا تھا۔

چپ چاپ اس نے ہاتھ اوپر اٹھا دیئے اور خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔

”میں یہیں قیام کروں گا۔“ اجنبی ایک ایک لفظ پر زور دیتا ہوا بولا۔

”اور اگر یہاں لٹ جاؤ تو۔“

”ارے ہوتا ہی کیا ہے میرے پاس۔ جو کچھ بھی ہوگا خود ہی نکال کر لوٹنے والے کے حوالے کر دوں گا۔“

”تصویریں بناتے ہو۔“

”ہاں مصوری میرا پیشہ ہے۔“

”ویسے یہ جگہ بڑی پُر فضا ہے۔ اگر ہم دونوں دوست بن گئے تو میں بھی کبھی کبھی آبا کروں گا۔“

”ضرور..... ضرور.....!“ عرفان نے سر ہلا کر کہا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر وہ باہر ہی کے کمرے میں آ بیٹھے۔ اجنبی مقفل کوٹھری کے قریب سے بھی گزرا تھا لیکن اس کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔

ناشتے کے بعد وہ ایک بدلا ہوا آدمی نظر آتا رہا تھا۔

ادھر عرفان سوچ رہا تھا کہ وہ لڑکی بھی بھوکی ہوگی۔ آخر اس کے لئے کیا کیا جائے؟ پتہ نہیں کیوں وہ اُسے چور تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھا۔

”میں پچھلی رات جاگتا رہا ہوں.....!“ دفعتاً اجنبی بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”کیا یہ ممکن ہے کہ تم اس معاملے میں بھی میری مدد کرو۔“

”میں نہیں سمجھا۔“

”اگر میں کچھ دیر کے لئے سو جاؤں تو تم اس کا خیال رکھو گے۔“

”کس کا.....؟“

”اوہ..... اتنی جلدی بھول گئے۔ میں اس چور لڑکی کے بارے میں کہہ رہا تھا۔“

”ارے ہاں..... اچھا تو میں کس طرح خیال رکھوں گا۔“

”اگر وہ یہاں پناہ لینا چاہے تو اُسے اندر آنے دینا۔ پھر میں دیکھ لوں گا۔ لیکن اسے اس

کی اطلاع نہ ہونے پائے کہ کوئی اس کی تلاش میں یہاں پہلے ہی سے موجود ہے۔“

”بہت اچھا.....!“

”تو پھر مجھے وہ جگہ دکھاؤ جہاں مجھے سونا ہے۔“ اجنبی اٹھتا ہوا بولا۔

نشت کے کمرے کے برابر ہی وہ کمرہ تھا اور وہاں صرف ایک ہی بستر تھا۔ عرفان اُسے وہاں لایا۔

پھر شاید دس ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ اُس کے خزانے گونجنے لگے۔ وہ چپ چاپ اٹھا دے پاؤں چلتا ہوا کمرے کے دروازے تک آیا اور آہستگی سے پٹ کھینچ کر بند کئے اور دروازے کو باہر سے بولٹ کر دیا۔ دوسری طرف نکاسی کی کوئی راہ نہیں تھی۔ لہذا اطمینان تھا کہ اگر وہ جاگ بھی پڑا تو اس کی مدد کے بغیر کمرے سے باہر نہیں نکل سکے گا۔

اب عرفان اس کی کوٹھری کی طرف جا رہا تھا جہاں وہ لڑکی بند تھی۔

قفل کھولا..... لڑکی جھپٹ کر دروازے کے قریب آ گئی۔

”کک..... کیا وہ چلا گیا.....؟“ اس نے آہستہ سے پوچھا۔

”نہیں..... دوسرے کمرے میں سو رہا ہے۔“

”کیوں؟ کیا آپ اُسے پہلے سے جانتے تھے؟“ لڑکی کی آواز کانپ رہی تھی۔

”ہرگز نہیں۔ وہ تو زبردستی دھرتا دے بیٹھا ہے۔ کہتا تھا کہ تم ادھر ضرور آؤ گی پناہ لینے کیلئے۔“

”اوہ..... پھر آپ نے کیا کیا.....؟“

”مجبوری تھی۔ اس نے ریوالور نکال لیا تھا۔ جسمانی قوت میں بھی شاید مجھ پر حاوی ہے۔“

”آپ نے اچھا کیا.....؟ لیکن اُس نے میرے بارے میں آپ کو کیا بتایا۔“

”اُسے چھوڑو۔ پہلے تم ناشتہ کرلو۔ پتہ نہیں کب سے بھوکی ہو۔ ارے ہاں تمہاری چوٹ اب کیسی ہے۔“

”درد ہے بائیں پیر میں۔“

”میرا خیال ہے کہ تم اس کوٹھری تک محدود رہو۔ میں تمہارے لئے کچھ لاؤں۔“

”وہ کہاں سو رہا ہے۔“

دروازے کی طرف بھاگا۔

اس کی اسٹیشن ویگن بڑی تیز رفتاری سے شہر کی جانب چلی جا رہی تھی۔ وہ دیوانہ وار اس کے پیچھے دوڑ پڑا۔



ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

حمید نے ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف سے فریدی کی آواز آئی۔ ”کیا تم کسی عرفان آرٹ کو جانتے ہو۔“

”عرفان..... یاد نہیں آتا..... کچھ اور بھی بتائیے۔“

”تم کبھی قاسم کو کسی آرٹ کے پاس لے گئے تھے۔“

”اوہ..... اچھا ہاں۔ ایک بار اُسے مصوری کا خطبہ ہوا تھا۔ میں نے کہا تھا اگر سیکھنا ہی ہے تو چلو کسی آرٹ سے ملو ادوں۔ مقصد یہ تھا کہ بیچارے آرٹ ہی کا بھلا ہو جائے گا۔“

”تو تم عرفان کو اچھی طرح جانتے ہو۔“

”بس جان پہچان کی حد تک..... وہ جانتا ہے کہ میں کون ہوں۔“

”جان پہچان کس سلسلے میں ہوئی تھی۔“

”کوئی خاص بات ہے کیا.....؟“

”میری بات کا جواب دو۔“

”مجھے یاد نہیں کہ کب اور کہاں اُس سے متعارف ہوا تھا۔ اس کے بعد جب بھی کہیں ملاقات ہوئی وہ محض مزاح پر ہی تک محدود رہی۔“

”تم اس کے بارے میں اور کیا جانتے ہو۔“

”کمرے میں۔ میں نے باہر سے دروازہ بولٹ کر دیا ہے۔“

”آپ نے بہت اچھا کیا۔ آپ بہت اچھے آدمی ہیں۔“

”وہ کہہ رہا تھا کہ اس کا تعلق محکمہ پولیس سے ہے۔“

”وہ جھوٹا ہے اور تب تو اُس نے میرے بارے میں کوئی ایسی ہی کہانی سنائی ہوگی جس سے آپ مجھے ایک مفروضہ سمجھیں۔“

”ہاں..... ایسی ہی کوئی بات تھی۔ بہر حال اب تم کچھ کھا پی لو۔“ وہ اُسے وہیں چھوڑ کر باورچی خانے میں چلا آیا۔

فرانینگ بین کومنی کے تیل کے چولہے پر رکھتے ہوئے اس نے سوچا یہ لڑکی چور ہرگز نہیں ہو سکتی۔ پتہ نہیں کیا معاملہ ہے۔ اور وہ سُر کا بچہ بھی محکمہ پولیس سے متعلق نہیں معلوم ہوتا۔ پھر اب اُسے کیا کرنا چاہئے۔

پراٹھے گرم کرنے کے بعد دو تین انڈے بھی فرانینگ بین میں توڑے۔ اس میں تقریباً دس پندرہ منٹ صرف ہوئے تھے۔

کونٹری میں واپس آیا لیکن وہ وہاں نہیں تھی۔ ناشتے کی ٹرے وہیں چھوڑ کر وہ کمرے کی طرف چھینٹا۔ سونے والے کمرے کا دروازہ کھلا نظر آیا۔

پیروں تلے سے گویا زمین نکل گئی۔ سر چکرانے لگا۔ تو گویا وہ خود ہی موت کے منہ میں جا کو دی تھی۔

وہ تیزی سے اس کمرے کی طرف بڑھا اور..... اور.....!

”اوہ.....؟“ وہ جہاں تک تھا وہیں رہ گیا۔

اجنبی پلنگ کے نیچے منہ کے بل پڑا نظر آیا اور خون کی ایک متحرک لکیر اُس کے نیچے سے نکل کر دیوار کی جڑ تک پہنچ رہی تھی۔ عرفان کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اب وہ خود اس جگہ سے بل بھی نہ سکے گا۔ اسی حالت میں کئی منٹ گزر گئے۔

پھر دفعتاً اس نے باہر کسی موٹر کا انجن اشارت ہونے کی آواز سنی اور بے تحاشہ بیرونی

”کیا قاسم کی کسی حماقت کی داستان آپ تک پہنچی ہے۔“

”میں تم سے کیا پوچھ رہا ہوں۔“

”میں اپنے حواس میں نہیں ہوں۔ یہ خواتین بار بار آپس میں لڑ پڑتی ہیں۔ ہاں تو آپ

نے کیا پوچھا تھا.....؟“

”تم عرفان کے بارے میں کیا جانتے ہو۔“

”کچھ بھی نہیں..... قاسم سے پیچھا چھڑانے کیلئے اُسکے حوالے کر دیا تھا، اور بس.....!“

”خیر..... تم ٹھیک سات بجے دوکان بند کر کے پرسنٹن کے چوراہے پر مجھے مل جاؤ سات

بج کر پندرہ منٹ پر.....!“

”یعنی دن بھر کی اس تھکن کے باوجود بھی.....!“

دوسری طرف سے کوئی جواب ملنے کے بجائے سلسلہ منقطع ہونے کی آواز سنائی دی۔

حمید ریسیور رکھ کر سر تھامے ہوئے کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔

”کوئی خاص پریشانی جناب۔“ رضیہ نے چمک کر پوچھا۔

حمید کچھ نہ بولا۔

”کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتی ہوں جناب۔ دوسروں کی الجھن کے حل تلاش کرنا

میری باہی ہے جناب.....!“

”فی الحال میری سب سے بڑی الجھن تم ہو۔ باس تمہارے تقرر کی منظوری دے چکا ہے

..... اس لئے مجبور ہے۔ ورنہ..... ورنہ.....!“

”ورنہ آپ مجھے اس ملازمت سے پہلے ہی دن سبکدوش کر دیتے۔“

”نہیں میں تمہارے لئے کچھ اور سوچتا۔“

”میرا خیال ہے کہ آپ سوچتے تو کچھ بھی نہیں۔“

”کیا مطلب.....؟“

”اب یہی دیکھئے کہ اس وقت بھی آپ کے چہرے پر جھلاہٹ کے آثار ہیں۔ وہ لوگ

جو زیادہ سوچنے کے عادی ہوتے ہیں انہیں جھلاہٹ کا مظاہرہ کرنے کی فرصت کہاں۔“

”میں پھر کہوں گا کہ یہ نفسیات کی کلاس نہیں بلکہ درزی خانہ ہے۔“

”میں پھر یہی عرض کروں گی کہ نفسیات.....!“

”ارے بابا..... بس.....!“ حمید میز پر ہاتھ مار کر دہاڑا۔ ”میں بھی آدمی ہی ہوں پتھر کی

دیوار نہیں ہوں۔“

”آپ آدمی ہیں..... اسی لئے تو نفسیات.....!“

حمید نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور معمر عورت دوسری لڑکیوں کی طرف دیکھ کر

آہستہ سے بولی۔ ”اتراتے ہی نہیں بنتا پجاری سے۔“

”ارے تم نے پھر بکو اس کی.....!“ رضیہ اس کی طرف پلٹی۔

”صاحب..... بس اب حد ہو چکی۔“ معمر عورت نے حمید سے کہا۔ ”میں یہیں اس سے

نپٹ لوں گی۔ پھر اب کچھ نہ کہئے گا۔“

”ہاتھ پائی کرو گی تم.....!“ رضیہ اوپری ہونٹ بھیج کر بولی۔

”خاموش..... خاموش.....!“ حمید نے میز کھٹکھٹائی۔

”مجھے سے تو جناب ایسی نوکری نہیں ہو سکے گی۔!“ معمر عورت نے حمید سے کہا۔ ”جہاں

کل کی لوٹیاں میرے منہ آئیں۔“

”ارے تو احسان کیا ہے کسی پر چھوڑ جاؤ.....!“ رضیہ تڑ سے بولی۔ ”ایسی ہی نازک

دماغ تھیں تو گھر سے باہر کیوں نکلی تھیں۔“

”آپ سن رہے ہیں۔“ معمر عورت نے حمید کو مخاطب کیا۔

حمید نے بے بسی سے سر کو اثباتی جنبش دی۔

”اور آپ کچھ نہیں کہیں گے اسے.....؟“

”میں..... بھلا میں عورتوں کے معاملات میں کیسے دخل انداز ہو سکتا ہوں۔“

”اچھا تو جناب! میں چلی، کنگ کرنے والے کی بالادستی ہر کارخانے میں تسلیم کی جاتی

ہے۔ یہاں رہ کر میں اپنی بے عزتی نہیں کراؤں گی جاری ہوں۔“ معمر عورت نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے پر آکھڑی ہوئی۔

”اوہو..... یہ مطلب نہیں.....!“ حمید گڑبڑا گیا۔

”نہیں جناب..... شکریہ..... میں ایک پل کے لئے بھی نہیں رک سکتی۔“

”تو یہ جو کچھ آیا ہے اُسے کون کاٹے گا.....؟“

”میں کاٹ لوں گی۔“ رضیہ تڑ سے بولی۔ ”آپ فکر نہ کیجئے۔“

”تم سے تو میں اچھی طرح سمجھوں گی۔“ معمر عورت نے اُسے گھونہ دکھا کر کہا۔

”یا خدا..... کیا خواتین میں بھی غنہ گردی فروغ پاری ہے۔“ حمید چھت کی طرف دیکھ کر بولا۔

معمر عورت دوکان کے نیچے اتر گئی۔

”یہ تم نے کیا کیا.....؟“ حمید نے رضیہ سے کہا۔

”آپ کی ایک غلطی کی اصلاح کی ہے۔ اب جلدی سے ایک مرد کٹر کا انتظام کیجئے۔

ورنہ دوکان ہرگز نہ چلے گی۔ خواتین ادھر کا رخ نہ کریں گی۔“

”ارے تو کیا تم اسے نفسیات خانہ ہی بنا کر رکھ دو گی۔“

”بھئیار خانہ بننے سے بہتر ہے کہ نفسیات خانہ ہی بنے۔ فی الحال میں ان کپڑوں کی

کننگ کئے دیتی ہوں۔ لیکن آپ آج ہی ایک مرد کٹر کا انتظام کیجئے۔ خوش پوش اور خوش شکل

ہونا چاہئے۔ خوش مزاج بھی ہو تو کیا کہنا۔ تاکہ ناپ لیتے وقت لطیفے اور چٹکے بھی چھیڑ سکے۔

نفسیاتی نکتہ نظر سے۔“

”بس بس.....!“ حمید ہاتھ اٹھا کر غرایا۔

اندھیرے میں

فریدی کی لٹکن شمال کی جانب بڑھ رہی تھی۔ سڑک سنان تھی۔ اس لئے رفتار بھی خاصی

تیز تھی۔

حمید ٹھیک سوا سات بجے پرنسٹن کے چوراہے پر پہنچ گیا تھا۔ لٹکن وہیں ایک جانب کھڑی

ملی تھی۔ فریدی اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھا تھا۔ پچھلی سیٹ پر بھی کوئی تھا جس کی شکل اندھیرے

میں دکھائی نہیں دی تھی۔

حمید گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔

اُسے قطعی علم نہ ہو سکا کہ جانا کہاں ہے۔

راتے میں حمید نے آہستہ سے پوچھا۔

”پچھلی سیٹ پر کون ہے۔“

”عرفان آرٹسٹ.....؟“

”اوہ..... تو کیا.....؟“

”ہاں یہ حضرت تمہارے ہی حوالے سے مجھ سے ملے تھے۔“

”کوئی خاص بات.....؟“

”جہاں جا رہے ہیں وہیں پہنچ کر معانے کی نوعیت کا اندازہ ہو سکے گا۔“ پھر بات جہاں

کی تھاں رہ گئی تھی۔

منزل مقصود حمید کے توقعات کے خلاف نکلی۔ عمارت کے چاروں طرف جنگل بکھرے

ہوئے تھے۔

فریدی نے ٹارچ روشن کی اور وہ آگے بڑھنے لگے۔ عمارت میں بھی اندھیرا تھا۔ عرفان

نے کیروسین لیپ روشن کیا۔

”اُدھر اس کمرے میں جناب۔“ عرفان نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”وہ دوسرے کمرے میں آئے۔“

”میرے خدا.....؟“ عرفان نے عجیب سی آواز میں کہا اور ہونٹوں کی طرح فریدی کی

طرف دیکھنے لگا۔

”ہوں..... کہاں ہے وہ لاش؟“ فریدی کا لہجہ پرسکون تھا۔

”مم..... میں کیا بتاؤں جناب..... وہ یہیں پڑی تھی اور خون بہہ بہہ کر اس دیوار تک پہنچ رہا تھا۔“

کیرو سین لیپ کی روشنی دھندلی تھی۔ فریدی نے پھر ٹارچ روشن کی اور جھک کر کچے فرش کا جائزہ لیا۔

پھر کچھ دیر بعد سیدھے ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”وہ لڑکی کہاں تھی؟“

”ادھر اکٹری میں..... چلے میں دکھاؤں.....!“ عرفان بولا۔ اس کی آواز شدت سے کانپ رہی تھی۔

حمید الجھن میں مبتلا ہو گیا تھا۔ آخر قصہ کیا ہے۔ ادھوری باتوں سے اتنا اندازہ تو ہو ہی گیا تھا کہ وہاں کچھ دیر پہلے کوئی لاش تھی۔ پھر کسی لڑکی کا تذکرہ ہوا۔

تو کیا وہ لاش کسی لڑکی کی تھی؟

اب وہ ایک چھوٹی سی کوٹھری میں داخل ہوئے۔

”اندازاً وہ یہاں کتنی دیر تک بند رہی ہوگی۔“ فریدی نے عرفان سے پوچھا۔

”شائد ڈیڑھ گھنٹے.....!“

”آپ نے فائر کی آواز سنی تھی؟“

”جی نہیں..... اسی پر تو حیرت ہے..... اگر اس کمرے میں فائر ہوا ہوتا تو باورچی خانے

میں اس کی آواز ضرور سنی جاسکتی۔“

”لیکن مرنے والے کی چیخ تو سنی ہی ہوگی۔“

”ہرگز نہیں جناب..... اگر چیخ کی آواز سن لی ہوتی تو اپنی گاڑی سے بھی ہاتھ نہ دھونا پڑتا۔“

”آپ شہر تک کیسے پہنچے تھے۔“ فریدی نے پوچھا۔ اس کی نظریں کوٹھری کا جائزہ لینے

میں مصروف تھیں۔

”مجھے ہوش نہیں کہ کتنی دور تک اپنی وین کے پیچھے دوڑا تھا۔ ویسے میری رفتار خاصی تیز

تھی۔ کیونکہ وین کافی دور تک مجھے نظر آتی رہی تھی۔ پھر میں تھک کر گر گیا تھا۔ گھٹنٹا ہوا سڑک کے کنارے جا پڑا۔ پتہ نہیں کتنی دیر بعد ادھر سے ایک لوڈنگ ٹرک گذرا تھا۔ میری درخواست پر ڈرائیور نے مجھے شہر پہنچانا منظور کر لیا۔“

”ٹرک کا نمبر یاد ہے آپ کو.....؟“

”مجھے اس کا ہوش کہاں تھا جناب۔“

”اپنی گاڑی کی گمشدگی کی رپورٹ تو درج کرا ہی دی ہوگی۔“

”نہیں جناب..... میں نے آپ کے علاوہ اور کسی کو بھی یہ واقعہ نہیں بتایا۔ میں جانتا تھا

کہ صرف آپ ہی مجھے کسی قسم کے الزام سے بچاسکیں گے۔“

”خیر..... اب میں وہ دیوار دیکھنا چاہتا ہوں جس پر سے اس نے صحن میں چھلانگ لگائی تھی۔“

”ادھر سے تشریف لائیے جناب۔“ عرفان کوٹھری سے نکل کر ایک طرف ہٹا ہوا بولا۔

دیوار پر ٹارچ کی روشنی کا دائرہ ریٹکتا رہا۔ عرفان نے اُسے بتایا کہ سوٹ کیس اور کوٹ

کہاں گرے تھے اور کس طرح ان کے گرنے کی آوازیں سن کر وہ صحن میں آیا تھا۔

”اوہ تو کیا کوئی لڑکی کو دی تھی دیوار پر سے۔“ حمید نے متحیرانہ لہجے میں کہا۔

”جی ہاں جناب.....!“

حمید منہ چلا کر رہ گیا۔ فریدی ٹارچ کی روشنی میں گرد و پیش کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر بولا۔

”دیوار کے اُس طرف کیا ہے؟“

”کچھ بھی نہیں..... جنگل ہے.....؟“

”دیوار پر وہ کس طرح چڑھی ہوگی بلندی خاصی ہے۔“

”میں اس طرف آج تک گیا ہی نہیں۔“

”خیر..... اب دیکھے لیتے ہیں۔“

مکان کی پشت پر پہنچنے کے لئے انہیں کھنی جھاڑیوں کے درمیان سے گزرنا پڑا۔ بھائیں

بھائیں کرتے ہوئے تاریک جنگل کے لئے ٹارچ کی روشنی ناکافی سی لگ رہی تھی۔

حمید کے ہاتھوں میں کئی جگہ کاٹے چھ گئے۔

”کیا یہ آپ کی مستقل قیام گاہ ہے عرفان صاحب۔“ اس نے جھنجھلا کر پوچھا۔

”نہیں جناب..... کبھی کبھی تبدیل آب و ہوا کی غرض سے یہاں چلا آتا ہوں۔“

”زبان تک بدل جاتی ہوگی یہاں تو.....؟“

”میں نہیں سمجھا جناب۔“

”مثال کے طور پر اس وقت میرا بھونکنے کو جی چاہتا ہے۔“ حمید نے جھلائے ہوئے لہجے

میں کہا۔

”ہوں..... اُوہ.....!“ اس نے فریدی کی آواز سنی۔ ”وہ دیکھئے..... دیوار پر چڑھنا تو

بے حد آسان ہے۔ دیکھئے کتنی اینٹیں نکلی ہوئی ہیں۔“

پھر وہ ادھر ادھر دیکھتا ہوا آگے بڑھا۔ ٹھیک دیوار کے نیچے پہنچ کر اس نے مارچ کارن

ان دونوں کی جانب پھیر دیا۔

دونوں کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ لیکن حمید نے محسوس کیا جیسے اُس نے پھرتی سے جھک

کر کوئی چیز اٹھائی ہو۔

کچھ دیر بعد وہ پھر مکان کے اندر واپس آئے۔

”تو پھر آپ کیا چاہتے ہیں۔“ فریدی نے عرفان سے پوچھا۔

”مم..... میں کیا بتاؤں جناب..... وہ لاش.....!“

حمید نے دیکھا کہ فریدی نے جیب سے ہلکی جھکڑیوں کا جوڑا نکال لیا ہے۔

”آپ کو عدالت میں اس کی جواب دہی کرنی پڑے گی کہ آپ نے میرا قیمتی وقت کیوں

ضائع کرایا تھا۔“

”مم..... میں.....؟“

”جھکڑیاں پہن لیجئے۔“

”مم..... میں..... خدا کی قسم میں بے قصور ہوں۔“

”تو پھر دکھائیے نا..... وہ لاش کہاں ہے؟“

”اب..... مم..... میں کیا بتاؤں۔ میری عدم موجودگی میں کسی نے اُسے یہاں سے ہٹا دیا۔“

”عدالت ہی میں ثابت کیجئے گا۔“ فریدی نے کہتے ہوئے جھکڑیاں لگادیں۔

”جناب..... جناب..... کرنل صاحب۔“

”مجبوری ہے..... قانون.....!“

”ایسا بُرا بتاؤ تو شاید کسی تھانے پر بھی نہ ہوتا۔“

”وہ اس سے زیادہ بُرا بتاؤ کرتے۔ ایسے حالات میں.....!“

”آخر قصہ کیا ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”قصہ بھی یہی بتائیں گے تمہیں۔ تم انہیں شہر لے جاؤ۔ اپنے محکمے کے لاک اپ میں رکھنا۔“

”سنئے تو سہی..... جناب.....!“ عرفان کے لہجے میں کسی قدر جھنجھلاہٹ تھی۔

”عرفان صاحب جو کچھ میں کر رہا ہوں اسی میں آپ کی عافیت ہے۔ محکمہ سراغ رسانی کا

لاک اپ آرام دہ ثابت ہوگا۔ سول پولیس کے لاک اپ سے بدرجہا بہتر..... اچھا شب بخیر.....!“

”کیا آپ ہمارے ساتھ نہیں جائیں گے۔“ حمید نے پوچھا۔

”بڑی ہر فضا جگہ ہے۔ صبح جیب بھجوا دینا۔ ہاں میں یہاں رات بسر کروں گا۔“

پھر فریدی نے مخصوص اشاروں میں اُسے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ عرفان سے اس

کی کہانی سن کر اُسی وقت پولیس میں دیدے اور یہ ظاہر کرے کہ عرفان کی کہانی باور نہیں کی گئی۔

لہذا اُسے اسی لئے حراست میں لیا گیا ہے کہ اُس حرکت کا اصل مقصد معلوم کیا جاسکے۔

واپسی پر حمید کارڈرائیو کر رہا تھا اور عرفان بھرائی ہوئی آواز میں اپنی کہانی سناتے سناتے

خاموش ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کہا۔ ”مجھ سے زبردست غلطی سرزد ہوئی ہے۔“

”کیسی غلطی.....؟“ حمید نے پوچھا۔

”لاش کو گھسیٹ کر جنگل میں پھینک آتا۔“ عرفان نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

”خیال اچھا ہے۔“

”آپ خود سوچئے..... کسی کو کیا پتہ چلتا..... میں نے خود ہی مصیبت مول لی ہے۔ یا بھئی
جیسے ہی عقل آگئی ہوتی۔ اس آدمی کو بتا دیتا کہ وہ کوٹھری میں موجود ہے کیونکہ وہ یقیناً چور تھی
نہ صرف چور بلکہ ایک سردمزاج قاتلہ تھی۔“

”یہ بھی ممکن تھا کہ تم اُس صورت میں اس لڑکی ہی کی لاش دیکھتے۔“
”ہرگز نہیں۔“

”اچھا تو پھر بتاؤ کہ وہ لاش کہاں غائب ہو گئی؟“
”یہی سوال تو مجھے بھی پاگل کئے دے رہا ہے۔“

”لاش غائب ہو جانے کا مطلب تو یہی ہو سکتا ہے کہ لاش کی تشہیر ہونے میں کسی راز کا
فاش ہو جانے کا خدشہ تھا۔“

”کسے خدشہ تھا.....؟“

”یہ آپ سوچ کر بتائیے۔“

”میں بتاؤں.....؟“ عرفان اچھل پڑا۔

”قطعاً.....!“

”میں کیا بتا سکتا ہوں۔ دونوں ہی میرے لئے اجنبی تھے۔“

”اکثر بد مزاج لوگوں کی بیویاں پڑوس کے آرٹسٹوں سے محبت کرنے لگتی ہیں۔ اب فرم
کیجئے ایسی ہی کوئی بیوی کسی آرٹسٹ کے پاس جاتی ہے۔ شوہر پہنچ جاتا ہے۔ ہاتھ پائی ہوا
ہے۔ شوہر ختم ہو جاتا ہے۔ لاش ٹھکانے لگا دی جاتی ہے۔ بیوی اپنی راہ لیتی ہے لیکن آرٹسٹ
صاحب کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ کمزور دل کے واقع ہوئے ہیں۔ ایک کہا
گڑھتے ہیں۔“

”بس..... بس..... خدا کے لئے بس کیجئے۔ نہ میں کمزور دل کا ہوں اور نہ پڑوس
بیویوں پر جان دیتا ہوں۔ اودہ..... میرے خدا..... میرے حالات کے چوکھٹے میں یہ کہانی
فٹ ہو سکتی ہے اور شاید آپ یہ کہیں کہ میں اچھی طرح کہانی کا تانا بانا نہیں بنا سکا۔ اسی

مجھے فائر کی آواز نہیں سنائی دی تھی۔“

”یہ قطعی ممکن ہے کہ تم فائر کی آواز نہ سن سکو۔ سائیلنسر لگے ہوئے ریوالور سے فائر کی
آواز نہیں نکلتی..... صرف گولی نکلتی ہے۔“

”بہر حال..... ہو سکتا ہے میں رات بھر میں پاگل ہو جاؤں۔“

”لیکن کہانی تو پاگل ہونے سے پہلے سنائی تھی۔“

”کیپٹن پلینز..... میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔ دیکھا جائے گا۔ میرا ضمیر مطمئن ہے۔“

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ میں بھی خاموش ہی رہنا چاہتا ہوں۔“

کار تیزی سے راستہ طے کر رہی تھی۔ دفعتاً حمید کو رفتار کم کر دینی پڑی۔

دور مخالف سمت میں کسی گاڑی کے ہیڈ لیمپ چمک رہے تھے۔

کچھ دیر بعد وہ گاڑی قریب سے گزر گئی۔ حمید نے دیکھا کہ عرفان گردن موڑ کر اُسے

دیکھنے جا رہا تھا۔

”خدا کی قسم.....!“ وہ اچھل پڑا۔ ”وہ میری دین تھی۔ موڑیے..... ادھر ہی موڑیے۔“

”خاموش بھی رہو یا..... اگر تمہاری کہانی پر یقین آ گیا ہوتا تو میں اپنی رات برباد

کرنے پر تیار نہ ہوتا۔“

”میں کہتا ہوں آپ غلطی کر رہے ہیں۔ اس گاڑی کا تعاقب کیجئے۔“

”اندھیرے میں گاڑی کیسے پہچان لی۔“

”نمبر..... نمبر پلیٹ تو روشن تھی۔ ٹی اے فور سکس تھری فور..... میری گاڑی کا نمبر ہے۔“

”کیپٹن پلینز.....!“

لیکن حمید پرواہ کے بغیر ایک سیلریٹر پر دباؤ بڑھاتا رہا۔ گاڑی پھر ہوا سے باتیں کرنے لگی تھی۔

”تم سب درندے ہو..... وحشی ہو..... مجھے پھانسی کے تختے تک لے جانے کی کوشش

کر رہے ہو۔“

عرفان چیخنے لگا۔

”لاش ملے بغیر تم پچانسی کے تختے تک نہیں پہنچ سکتے۔ مطمئن رہو۔“

”میں کہتا ہوں..... وہ میری گاڑی تھی۔“

”رہی ہوگی۔“ حمید نے لاپرواہی سے کہا۔ ”میرے چیف نے مجھ سے صرف یہ کہا تھا کہ

”تمہیں حوالات میں دے کر آرام سے سو جاؤں۔“

”سچ مچ درندے ہو.....!“

”ہمیں ہمارے فرائض سب کچھ بنا دیتے ہیں۔“

”میں کہتا ہوں.....!“

”کچھ دیر پہلے تم کہہ رہے تھے کہ خاموش رہنا چاہتے ہو۔“

عرفان سیٹ کی پشت گاہ سے نکل کر ہانپنے لگا۔

حمید نے دیر سے پائپ نہیں پیتا تھا۔ اُس نے سوچا کچھ دیر کے لئے رکنا چاہئے۔

ایک جگہ رفتار کم کر کے گاڑی سڑک کے کنارے اتار دی۔

”مسٹر عرفان حالانکہ قانوناً درست نہیں..... لیکن اگر تم سگریٹ وغیرہ پینا چاہو تو مجھے

اعتراض نہ ہوگا۔“

”شکریہ..... میں سگریٹ نہیں پیتا۔“ عرفان نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

حمید نے پائپ میں تمباکو بھرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے دیر سے پائپ نہیں پیا۔“

”کیپٹن..... تم نے مجھ پر ایک بہت بڑا الزام لگایا ہے۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ بے

وجہ بھی مر سکتا ہوں۔ لیکن یہ الزام کہ وہ کسی پڑوسی کی بیوی تھی۔ خدا کی پناہ..... اگر اس قسم کی

کوئی کہانی پولیس میں آئی تو مجھے خودکشی ہی کرنی پڑے گی۔“

”ارے تم کیسے آرٹسٹ ہو..... میں نے کئی آرٹسٹوں کو کہتے سنا ہے کہ اس قسم کے

اسکیڈل ان کے فن کو زندگی بخشتے ہیں۔“

”وہ بہرہ ور ہیں آرٹسٹ نہیں۔ کوئی بھی فن معصومیت اور پاکیزگی کے بغیر پروان نہیں

چڑھ سکتا۔“

”کیا تم نے کبھی کسی کو نہیں چاہا۔“

”چاہا ہے..... لیکن جسے چاہا ہے اُسے کبھی اس کا علم نہ ہو سکا۔“

”کیا بات ہوئی۔“

”اگر میں اس چاہت کو لذت اظہار کی نذر کر دیتا تو وہ میرے فن کی رگوں میں دوڑتا ہوا

گرم لہو نہ بن سکتی۔“

”واہ یا تم تو الفاظ میں بھی مصوری کر سکتے ہو۔“

”کیپٹن..... خدا کے لئے اس قسم کا کوئی اسکیڈل نہ بننے دیتا۔“

”ہوں.....!“ حمید طویل سانس لے کر بولا۔ ”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے اگر کسی

کو چاہا بھی ہے تو محض اپنے فن کی خاطر۔ لہذا تم نے اپنے فن کے علاوہ اور کسی کو نہیں چاہا۔“

”مختلف چاہتیں فن کو آگے بڑھانے کا ذریعہ بنتی رہی ہیں۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کسی

بھی درخت کو بڑھنے کے لئے کئی برس اتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔“

”بہت اچھا خیال ہے عرفان صاحب..... وہ جو آج کسی دوسرے کی بیوی بنی بیٹھی ہے

اس کا لہو بھی تمہارے فن میں شامل ہے۔“

”بیوی..... بیوی..... بیوی.....!“ وہ جھلا کر بولا۔ ”آخر یہ بیوی کیوں سوار ہوگئی ہے تم پر۔“

”ختم کرو..... چلو تسلیم کہ تمہارے فن میں کسی بکری کا لہو بھی شامل ہے۔“

”میں اب قطعی نہیں بولوں گا۔“ عرفان جھلا کر بولا۔

”ٹھیک ہے..... میں تمباکو نوشی بھی ختم کر چکا ہوں۔ اب ہم خاموشی سے اپنی منزل کی

طرف روانہ ہو جائیں گے۔“

انجن جاگا جاگا گاڑی جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

کچھ دیر بعد عرفان بڑبڑایا۔ ”میں کیسے یقین کر لوں کہ یہ ایک ڈراؤنا خواب نہیں ہے۔“

”تم شاید اونگھ رہے ہو۔ سو جاؤ۔“ حمید نے کہا اور ہونٹ بھیجنے لے۔

نہیں لگائی اور اب یہ احساس یقین کی شکل اختیار کر چکا تھا کہ اس وقت اس مکان میں اس کے علاوہ بھی اور کوئی موجود ہے۔

یہ خیال صحیح نکلا۔ ٹھیک دروازے کے قریب اس نے کسی آدمی کی تھیر زدہ سی آواز سنی۔ پھر کوئی کھار اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”یہاں کون ہے؟“ فریدی کچھ نہ بولا۔

پھر کوئی دروازے سے گذر کر کمرے کے وسط تک چلا گیا۔ یہ ایک طویل قامت اور چوڑے شانوں والا آدمی تھا۔

کمرے کے وسط میں رک کر پھر دروازے کی طرف مڑا۔ فریدی کے ريوالور کی نال اس کے سینے کا نشانہ لے رہی تھی۔ ”اوہ.....!“ آنے والے کے حلق سے خوفزدہ سی آواز نکلی۔

”اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔“ فریدی کی تیز قسم کی سرگوشی کمرے میں گونجی۔

”مم..... میں..... مطلب یہ کہ.....!“ اُس نے ہکلاتے ہوئے اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔ ”میں تمہیں وقت دے سکتا ہوں؟“ فریدی بولا۔

”وقت لگ..... کیا وقت.....؟“

”اس طرح یہاں داخل ہونے کے جواز میں کچھ کہنے کے لئے؟“

اُس نے خوفزدہ سی ہنسی کے ساتھ کہا۔ ”اُس امریکن ٹورسٹ نے کہا تھا کہ وہ مکان اس وقت خالی ہوگا..... لال..... لیکن مجھے لیپ کی روشنی نظر آئی..... اور.....؟“

”یہ جواز تو نہ ہوا.....!“

”مم..... مطلب یہ کہ..... میں یہاں اس کا پرس تلاش کرنے آیا ہوں جس میں اس کا پاسپورٹ اور ضروری کاغذات تھے۔“

”تو پھر کرو تلاش..... میں تمہاری مدد کروں گا۔“

”میرا خیال ہے کہ.....!“ وہ طویل سانس لے کر خاموش ہو گیا۔



کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اچانک اس طرح گھٹا اٹھے گی اور موسلا دھار بارش شروع ہو جائے گی۔ فریدی کو باہر کی فضا کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ تو انہیں دونوں کمروں تک محدود ہو کر گیا تھا۔

کیرو سین لیپ کی ناکافی روشنی میں خواب گاہ کی ایک ایک انچ زمین کا جائزہ لینے کے بعد وہ سگار سگا کر آرام کرسی میں نیم دراز ہو جانے کا ارادہ کر رہی رہا تھا کہ بارش کے شور سے فضا گونجنے لگی تھی۔

لیکھت بڑی بڑی بوندیں آئی تھیں اور پھر اُن کا زور بڑھتا ہی گیا تھا۔

اس نے سگار سگا کر روشنی کم کر دی اور آرام کرسی کی پشت گاہ سے ٹک گیا۔

عرفان کی کہانی کے بارے میں وہ اب تک کوئی صحیح رائے قائم نہیں کر سکا تھا۔ سب سے پہلے تو وہ یہی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آخر اس ویرانے میں آرام کرنے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ شہر کے آس پاس بہتری ایسی جگہیں تھیں جہاں وہ ذہنی سکون حاصل کر سکتا۔

وہ آنکھیں بند کئے کرسی پر نیم دراز تھا۔ سگار کے جلتے ہوئے سرے سے دھوئیں کی پتا سی لکیر نکل کر فضا میں بل کھا رہی تھی۔

دفعۃً وہ چونک کر سیدھا بیٹھ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے کسی قسم کی آواز سنی ہو۔ حالانکہ فضا بالکل بارش کے شور سے گونج رہی تھی۔

پھر وہ بڑی پھرتی سے اٹھا اور کھلے ہوئے دروازے کی اوٹ میں دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ سامنے چھوٹی میز پر کیرو سین لیپ جھکی لو سے روشن تھا۔

دفعۃً فریدی کی جیب سے ريوالور بھی نکل آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی نادیدہ دشمن کے اچانک حملے کا منتظر ہو۔

بارش کے زور میں کمی نہیں ہوئی تھی۔ اسے یاد آیا کہ اس نے صدر دروازے کی کنڈی

”کیا خیال ہے.....؟“ فریدی نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا اور وہ آنکھیں چرانے لگا۔ جوان آدمی تھا۔ عمر زیادہ سے زیادہ پچیس سال رہی ہوگی۔ صورت سے بُرا آدمی نہیں معلوم ہوتا تھا۔

”شاید میں کسی جال میں پھنس گیا ہوں.....؟“

”اس کی وضاحت زیادہ مناسب ہوگی۔“

”کیا آج آپ نے کسی امریکن ٹورسٹ خاتون کو یہاں مدعو کیا تھا۔“

”کہے جاؤ..... جہاں غلطی کرو گے میں ٹوک دوں گا۔“

”میں کچھ نہیں جانتا کیا چکر ہے..... آج چار بجے شام کو..... ہوٹل ڈی فرانس میں چائے پی رہا تھا۔ وہ آئی اور میری ہی میز کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھتی ہوئی بولی۔ میں تمہارے دیس میں اجنبی ہوں۔ تارجام سے آئی ہوں۔ اب یہاں سے سیدھی اپنے وطن واپس جاؤں گی۔ میں نے کہا آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ پھر میں نے اس سے استدعا کی کہ وہ میرے ساتھ چائے پیئے۔ اس نے کہا میں اس پر مجبور ہوں کیونکہ اپنا پرس کھو بیٹھی ہوں جس میں نہ صرف ایک بڑی رقم تھی بلکہ سفر سے متعلق ضروری کاغذات بھی تھے۔ میں نے افسوس ظاہر کیا اور اُسے اپنے ساتھ قیام کرنے کی دعوت بھی دی۔ جو بلا عذر قبول کر لی گئی۔ میں سید اسٹریٹ کے ایک فلیٹ میں تنہا رہتا ہوں۔ بہر حال میں اُسے اپنے فلیٹ لے گیا۔ وہ ایک انٹیشن وگن میں سفر کر رہی تھی۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ وہ انٹیشن وگن تارجام سے بہت سستی خریدی تھی اور وطن واپس جاتے وقت وہ اُسے مجھے تحفہً دے جائے گی۔ خیر میں تو محض انسان ہمدردی کے تحت اُس کی مدد کرنے پر آمادہ ہوا تھا۔ میرے فلیٹ میں پہنچ کر اُس نے بتایا کہ اگر میں اُس کی مدد کروں تو شاید وہ اپنا پرس حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ اُس کے بیان کے مطابق وہ تارجام سے ایک آدمی کے ساتھ شہر جانے کے لئے روانہ ہوئی تھی۔ جو اُسے کچھ دیر کے لئے اس مکان میں لایا تھا اور دوپہر کا کھانا انہوں نے یہیں بیٹھ کر کھایا تھا اور پھر شہر کے لئے روانہ ہو گئے تھے۔ شہر میں وہ ایک جگہ اتر گیا تھا۔ وہ اس کا پیہ نہیں جانتی۔ نام بھی یاد نہیں رہا۔ مجھے

اس نے بتایا کہ مکان اس وقت مقفل ہوگا۔ میں نے کہا میں تالا توڑ سکوں گا۔ بہر حال اس کا خیال تھا کہ پرس یا تو اس مکان میں کہیں گر گیا یا مکان کی پشت والے جنگل میں جہاں وہ کچھ دیر کے لئے گئے تھے۔ خدا را بتائیے کیا آپ وہی آدمی ہیں۔ اس مکان کے مالک۔ یا مجھ سے کوئی جرم سرزد ہوا ہے۔“

فریدی کچھ نہ بولا۔ وہ خاموشی سے اس کی آنکھوں میں دیکھے جا رہا تھا۔

سراغ

بارش تو شہر میں بھی ہوئی تھی۔ لیکن ایسی شدید نہیں جیسی کچھ دیر پیشتر فریدی جھیل چکا تھا۔ اس وقت وہ دونوں شہر میں داخل ہو رہے تھے۔ فریدی نے دین کے نمبروں سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ عرفان ہی کی ہو سکتی ہے۔ لیکن فی الحال اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ لاک اپ تک جا کر اس کی مزید تصدیق کر سکتا۔

فریدی کے ساتھ جو نو جوان سفر کر رہا تھا اس نے اپنا نام طارق بتایا تھا۔

سید اسٹریٹ میں پہنچ کر فریدی نے گاڑی روک دی۔ وہ خود ہی ڈرائیو کرتا رہا تھا۔

”میرے ساتھ آئیے۔“ طارق نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔

فریدی نے اب تک اُسے اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔

دونوں گاڑی سے اتر کر ایک عمارت میں داخل ہوئے۔ طارق پر وحشت سی طاری تھی۔ چلتے وقت اس کے قدم ڈمگ رہے تھے۔ ایک فلیٹ کے سامنے رک کر اس نے دروازے پر دستک دینی چاہی لیکن ہاتھ لگتے ہی دروازہ کھلتا چلا گیا۔ سامنے والا کمرہ بالکل خالی تھا۔

”آپ کہاں ہیں محترمہ؟“ طارق نے کمرے میں داخل ہو کر آواز دی۔ جملہ انگریزی میں ادا کیا گیا تھا۔ لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ اُس نے پھر پکارا اور آگے بڑھتا چلا گیا۔ دوسرا

”خدا کیلئے مجھے بتائیے جناب ورنہ میرا مستقبل تباہ ہو جائے گا۔ سول سروس کا امتحان دیا تھا۔
 بڑی اچھی پوزیشن میں پاس ہوا ہوں۔ اب وائیو ارہ گیا ہے۔ کرنل صاحب..... مجھے بچائیے۔“
 وہ بڑی طرح گڑگڑا رہا تھا۔
 ”اچھی بات ہے۔ میں دیکھوں گا۔ لیکن تم مجھے مطلع کئے بغیر شہر نہیں چھوڑو گے۔ سمجھے۔“
 ”ہرگز نہیں..... یقین کیجئے جناب۔“
 ”اگر وہ شہر میں کہیں بھی نظر آجائے مجھ سے فون پر رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرنا۔ کارڈ
 پر وہ نمبر درج ہیں جن پر میں مل سکوں گا۔ محض تمہارا کیریئر خراب ہو جانے کے خیال سے تمہیں
 چھوڑ رہا ہوں۔ ورنہ اس کا کوئی جواز نہیں۔ کیونکہ ایک مسروقہ کار تمہارے قبضے میں رہی ہے۔“
 ”میں ہمیشہ احسان مند رہوں گا جناب۔ آپ پولیس والوں سے مختلف ہیں۔“
 ”گاڑی میں لے جا رہا ہوں۔“

”بہت بہتر جناب۔“

پھر وہ فریدی کی درخواست کرنے کے لئے سڑک تک آیا تھا۔ فلیٹ سے باہر آنے سے قبل
 فریدی نے ایک بار پھر فلیٹ کے گوشے گوشے کا جائزہ لیا تھا۔
 ”ہائیں..... لگ..... گاڑی..... گاڑی کہاں گئی۔“ وہ بوکھلا کر چاروں طرف دیکھتا ہوا
 بولا۔ ”یہیں تو کھڑی کی تھی۔“

”وہ دور تک کسی گاڑی کا پتہ نہیں تھا۔“

”تم فلیٹ میں واپس جاؤ۔“ فریدی نے اس سے کہا۔

”یقین کیجئے جناب۔“

”مجھے یقین ہے۔“

وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے مڑا اور عمارت کی طرف چلا گیا۔

پھر تقریباً دس منٹ بعد فریدی کو ایک خالی ٹیکسی ملی تھی۔

گھر واپس آیا تھا تو دوسری حقائق پذیرائی کے لئے موجود تھیں۔

دروازہ کھولا۔ اسی طرح فلیٹ کے تینوں کمرے دیکھ ڈالے لیکن لڑکی کا کہیں پتہ نہ تھا۔

”اب فرمائیے؟“ فریدی نے سرد لہجے میں کہا۔

”کک..... کیا..... عرض کروں..... سمجھ میں نہیں آتا۔“

”فرض کیجئے آپ کو پرس مل بھی جاتا تو.....!“

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر ایک کرسی پر بیٹھتا ہوا بولا۔

”بھلا قانون کو اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے کہ آپ کی سمجھ میں کچھ آتا بھی ہے یا نہیں۔“

”پھر بتائیے..... میں کیا کروں۔“

”چپ چاپ میرے ساتھ حوالات تک چلئے۔ کیونکہ آج اس مکان میں ایک قتل ہو چکا

ہے اور وہ دین چوری کی ہے جو آپ کو بخشنی جانے والی تھی۔“

”آپ مجھے خواہ مخواہ خوفزدہ کر رہے ہیں۔“

”اگر وہ کوئی امریکن ٹورسٹ ہوتی تو آپ سے بھیک مانگنے کی بجائے سیدھی اپنے

سفارت خانے کا رخ کرتی۔“

”میں نے بھی یہی سوچا تھا۔ لیکن پھر خیال آیا تھا کہ اُسے اپنا پرس مل جانے کی توقع ہے

اسی لئے ابھی سفارت خانے سے رجوع نہیں کرنا چاہتی۔“

”بہر حال یہ دین جس پر تم سفر کرتے رہے ہو ایک جگہ سے چرا لی گئی تھی۔“

”آپ کون ہیں۔ کیا آپ اس مکان کے مالک نہیں ہیں؟“

فریدی نے اپنا کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

”کرنل اے کے فریدی۔“ اس نے بہ آواز بلند اُسے پڑھا اور ہکا بکارہ گیا۔

”لے..... یعنی..... اس نے تم کو نگل کر کہا۔“ میں کسی بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔“

”یقیناً.....!“

کچھ دیر تک کمرے کی فضا پر سکوت طاری رہا پھر فریدی نے کہا۔ ”تم گردن تک دلدل

میں پھنس گئے ہو۔“

”قی میں اس طرح گھر جاؤں گا۔“ قاسم نے حیرت سے کہا۔
 ”کیا حرج ہے..... بیوی سے بھی اس میک اپ کی داد وصول کر لاؤ۔“
 ”سالی دغ کر جل جائے گی۔“

”اسی لئے تو کہہ رہا ہوں۔ جلد بھنے گی تو تم اپنے دل میں ٹھنڈک محسوس کرو گے۔“
 ”اور اگر اُس نے ابا جان کو فون کر دیا تو.....؟“

”تم ٹھکرو پٹو گے اور وہ اپنے دل میں ٹھنڈک محسوس کرے گی۔“
 ”اے جاؤ..... سالے وہی ڈوب جانے والا مشورہ دو گے۔“
 ”مجھے نیند آ رہی ہے قاسم.....!“ حمید اٹھتا ہوا بولا۔

”میں بھی یہیں آرام پھر ماؤں گی۔“ قاسم نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔
 ”تمہارے ساز کا کوئی بستر موجود نہیں ہے۔“
 ”دو بستر مال کر قائم چل جائے گا۔“

پھر حمید اُسے وہیں چھوڑ کر اپنی خواب گاہ کی طرف چھپتا تھا۔ قاسم نے اُس کا تعاقب ضرور کیا لیکن وہ اُسے کافی پیچھے چھوڑتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور دروازہ بند کر کے بولٹ کر دیا۔

کچھ دیر تک قاسم دروازہ پیٹتا رہا پھر سناٹا چھا گیا۔

اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔ حمید نے ریسور اٹھایا۔ دوسری طرف سے فریدی کی آواز آئی۔ ”یہ کیا تقویت پھیلائی ہے تم نے۔“

”خدا کی قسم میں آج میں نے نہیں بلایا۔ خود ہی آیا تھا۔ کہنے لگا میں نے شلوار میں الاسٹک ڈالنا بھی سیکھ لیا ہے۔ اب ٹپ ٹاپ ٹیلرز کے یہاں نوکری دلوادو۔ میں نے کہا وہاں صرف عورتیں کام کرتی ہیں۔ کہنے لگا تمہارے لئے کیا مشکل ہے۔ بنا دو مجھے عورت۔ ٹھیک اسی وقت ایک نیا خیال آیا۔ آپ بھی سنئے۔ ممکن ہے آپ بھی اس سے متفق ہوں۔ دوکان کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنا پڑے گا۔ اس کا اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں کہ قاسم کو ماڈل بنایا جائے۔“

برآمدے میں ایک اتنی لمبی چوڑی عورت نظر آئی کہ وہ ہکا بکارہ گیا اور اس عورت کی ہنسی ہی ہی ”تو کسی طرح رکنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ حمید ایک اسٹول پر کسی بت کی طرح بے ہم و حرکت بیٹھا تھا۔

”یہ کیا بیہودگی ہے۔“ فریدی نے جھلاہٹ میں حمید کو مخاطب کیا۔ لیکن اُس کی پوزیشن میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ دیدے تک پتھر ائے ہوئے سے معلوم ہوتے تھے۔

دفعتاً فریدی نے اس کی گردن دبوچی اور اسٹول سے اٹھا دیا۔
 ”انہیں معاف کر دیجئے۔“ گرانڈیل عورت بولی۔ ”میں نے کہا تھا ان سے۔“
 ”نہیں بتا رہے تھے عورت۔“

”تم یہاں آئے کیوں تھے؟“ فریدی اس پر الٹ پڑا۔
 ”میں اپنی جندگی سے تنگ آ گیا ہوں!“ عورت بولی۔
 ”آگئی ہوں بے.....!“ حمید نے تصحیح کی۔

”ہوں..... تو زندگی سے تنگ آ کر سازشی باندھ لی ہے۔“
 ”جی غاں.....!“

”بچے بھی پیدا کرے گا۔“ حمید نے گرہ لگائی اور بے تعلقی سے چھت کی طرف دیکھنے لگا۔
 ”اے مجاہد نہ اڑاؤ میرا۔“

”قاسم کہیں تم پاگل نہ ہو جانا۔“ فریدی بولا۔
 ”اللہ کرے میں تو مر ہی جاؤں۔“

”چھاتی پر دو ہتھوڑ چلا کر۔“ حمید نے کسی فلم ڈائریکٹر کی طرح ہانک لگائی اور قاسم نے سچ وہ جملہ اسی حرکت کے ساتھ دوبارہ ادا کیا۔

فریدی حمید کو خوشنظر سے گھورتا ہوا اندر چلا گیا۔
 ”اے تو ان کا قیام بگڑتا ہے۔“ قاسم نے حمید سے پوچھا۔
 ”اب جاؤ مجھے نیند آ رہی ہے۔“

ایسی کیم شیم عورت آج تک نہ دیکھی گئی ہوگی۔ غرارہ سوٹ پہنا کر عین دروازے پر کھڑا کر دوں گا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بورڈ ہوگا۔ جس پر تحریر ہوگا۔ میرے لمبوسات کی فنگ آسان نہیں۔ لیکن یہ دیکھئے۔“

دوسری طرف سے فریدی کی زہریلی سی ہنسی سنائی دی اور اس نے کہا۔ ”تو تمہیں یقین آ گیا ہے کہ میں پیشہ تبدیل کرنا چاہتا ہوں۔“

”نفسیاتی نکتہ نظر سے ممکن ہے۔“ حمید نے رضیہ کی نقل اتارنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”اتنی زبردست فاقہ کشی کے بعد لمبے دسترخوان کی سوچھے گی۔“

”بکومت..... سنجیدگی سے سنو..... وہ لڑکی جس کا تذکرہ تم نے کیا تھا بہت ذہین معلوم ہوتی ہے لہذا تمہیں ایک مرد کٹر کا بھی انتظام کرنا ہے۔ لیکن وہ قاسم نہیں ہوگا۔ ہو سکتا ہے کل کوئی مرد کٹر بھی ملازمت کی تلاش میں تمہارے پاس پہنچے۔ اس بار مت چو کنا۔ پہلے ہی تمہیں ایک مرد کٹر ضرور رکھنا چاہئے تھا۔ خیر.....! البتہ قاسم کے ماڈل بنائے جانے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن اس پر تمہاری شخصیت ہرگز نہ ظاہر ہونی چاہئے۔“

”میں سمجھتا ہوں..... لیکن کیا آپ اس ذہین لڑکی کو مجھ پر مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے سوچا تھا آج اُسے چھٹی دے دوں گا۔“

”ایسا ہرگز مت کرنا کیونکہ اس بیٹے میں تم قطعی نئے ہو۔“

”آپ کی اطلاع کے لئے..... وہ لڑکی بھی ماہر نفسیات ہے۔“

”تب تو ہر قسم کی بنجیہ گری کرے گی۔ بہر حال اُسے رہنا ہے۔ قاسم سارے گھر میں آ بیٹھی۔“

دندان تا پھر رہا ہے۔ اس کے لئے کوئی انتظام کرو۔“

”جہنم میں جاؤ۔“ فریدی نے دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا اور حمید نے لمبی تانی۔ دوسری صبح وہ قاسم کو سوتا چھوڑ کر گھر سے نکل گیا۔ لیکن اس کے نام ایک پرچہ چھوڑ جانے میں غفلت نہیں کی تھی۔ اُس نے اُسے ہدایت دی تھی کہ وہ زنانہ لباس میں ٹھیک دس بجے پ

ٹاپ ٹیلرز کی دوکان پر پہنچ جائے۔ ساتھ ہی فریدی سے کہتا گیا تھا کہ میک اپ وہی کر دے تو بہتر ہے اور پلاسٹک میک اپ ہی اس کے خاں دار گالوں کی اصلیت چھپا سکے گا۔“

گھر سے جلد بھاگنے کے باوجود بھی دوکان پر کسی قدر دیر سے پہنچا۔ لڑکیاں دوکان کے سامنے منتظر تھیں۔ رضیہ چمک کر بولی۔ ”بہت دیر سے تشریف لائے ہیں آپ۔ دوکان کی کنجی میرے پاس بھی ہونی چاہئے۔“

”صرف دس منٹ دیر سے آیا ہوں۔“

”دس منٹ بہت ہوتے ہیں۔“

”پیشہ آبا سپہ گری رہا ہے۔ سمجھیں..... کسی پشت میں کوئی خیاط نہیں ہوا۔ یہ تو مقدر کی بات ہے کہ لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد ٹیلرنگ شاپ کی منجری جسے میں آئی ہے۔“

”ایک نفسیاتی کمزوری..... آپ اس بیٹے کو ذلیل سمجھتے ہیں۔ احساس برتری کا شکار یہ مرض آدمی کو پاگل پن تک لے جاسکتا ہے۔“

”دوکان کھولنے دو گی یا.....!“ حمید جھلاہٹ میں اس سے آگے نہ کہہ سکا۔

”جی جی..... یہ غصہ آپ کو لے ڈوبے گا.....!“

”اب خاموش رہو۔“

حمید نے دوکان کھولی۔ سب اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئیں۔ لیکن رضیہ حمید کے پاس آ بیٹھی۔

”کیوں.....؟“ حمید نے پھاڑ کھانے والے لمبے میں پوچھا۔

”کام ہوگا تو مشین پر جا بیٹھوں گی۔“

”اور کام نہ ہونے پر اس کی اور ہالنگ کرو گی۔“ حمید نے اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”یہ بھی ضروری ہے..... ورنہ آپ پورے کاروبار کو غرق کر دیں گے۔“

”باس کو مجھ پر اطمینان ہے۔ تم فکر نہ کرو۔“

”لیفٹیننٹ کرنل صاحب یہ میدان جنگ نہیں ہے۔ درزی کی دوکان ہے، مشینیں کاٹن ہے۔ نمبر نوٹ فرمائیے۔ کے اے ایف ایک تین چار چھ۔“
پریڈ نہیں کرتیں انہیں چلانا پڑتا ہے۔“

”میرا اندازہ ہے کہ تم زبان کے علاوہ اور کچھ نہیں چلا سکتیں۔“
”کبھی کبھی ہاتھ بھی چلتے ہیں۔“
”بدمیزی برداشت کرنا میرے بس سے باہر ہے۔“

”لیکن قیافہ کہتا ہے کہ آپ عورتوں کے سلسلے میں سب کچھ برداشت کر سکتے ہیں۔“
”صرف عورتوں کے سلسلے میں۔ نفسیات کی کتابوں کی الماری میری دانست میں سوختی ہے۔“

”اتنی گاڑی اردو نہ بولے۔ میں نے نفسیات انگریزی میں پڑھی تھی۔“
”جنم میں گئی نفسیات.....!“ حیدر میز پر ہاتھ مار کر بولا۔ ”تم ہٹو یہاں سے۔“

”پھر وہ اس وقت کس لئے آئی تھی۔“
”یہی معلوم کرنے کے لئے کہ پرس ملایا نہیں۔ قفل توڑنے میں کوئی دشواری تو پیش نہیں

”آئی تھی۔ میں نے کہا پرس تو نہیں ملا۔ قفل بھی آسانی سے ٹوٹ گیا تھا۔ لیکن خود میرا ایک کام نکل گیا۔ اگر میں اتفاقاً اس سڑک سے نہ گزرتا تو میرے ایک عزیز کو سخت پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ وہ انہیں اطراف میں شکار کھیلنے گئے تھے۔ انکی جیب خراب ہو گئی تھی۔ جنگل میں بھٹکتے پھر رہے تھے۔ مستزاد یہ کہ بارش بھی ہونے لگی تھی۔ بہر حال میری وجہ سے شہر تک پہنچ سکے۔“

”تم بہت ذہین معلوم ہوتے ہو طارق..... تم نے بہت اچھا کیا۔ لیکن تمہیں اس کا خیال

فون کی گھنٹی بجی۔ فریدی نے ریسپور اٹھایا۔ دوسری طرف سے کسی نے اس سے منٹ کیسے آیا تھا۔“
کرنے کی خواہش ظاہر کی۔

”آپ کون ہیں.....؟“ فریدی نے پوچھا۔
”طارق..... کرنل صاحب سے بس اتنا کہہ دیجئے۔“

”طارق..... اؤہ..... یہ میں ہی ہوں۔“
”کرنل صاحب..... ابھی وہ پھر آئی تھی۔ لیکن گاڑی کارنگ بدلا ہوا تھا۔ ویسے

یقین ہے کہ یہ وہی دین تھی جس میں ہم نے پچھلی رات سفر کیا تھا۔ نمبر پلیٹ بھی بدل دی۔ امیدواروں میں کم از کم اتنی سوجھ بوجھ تو ہونی ہی چاہئے۔“

”لا جواب.....!“ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”اب کس بات کی رہ گئی ہے کہ میں بھی ساری پلیٹ کراس نکا ہفتیجی میں شامل ہو جاؤں۔ ارے دماغ چاٹ کر رکھ دیا ہے اس ماہر نفسیات نے میرا۔ پتہ نہیں یہ کس سنہ عیسوی کے گناہوں کی سزائیں رہی ہے۔“

”حوصلہ بلند رکھو..... جیت تمہاری ہوگی۔“

”اگر میں باقی بچا تو۔“

”بہت دل برداشتہ معلوم ہوتے ہو۔“

”ایسا ویسا.....؟“

”تمہیں کیا تکلیف ہے۔“

”لو وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ بے نگ و نام ہے۔ صاحب اس سے بہتر تو یہ تھا کہ آپ مجھے ایک بھینس خرید دیتے اور مین خود خرید لیتا۔“

”عرفان والی کہانی کی سیٹنگ کے سلسلے میں مبارک باد قبول کرو۔“

”پسند آئی۔“

”بہت زیادہ..... اچھا دیکھو تمہیں خصوصیت سے ایک لڑکی کو ذہن میں رکھنا ہے۔ صورت سے غیر ملکی معلوم ہوتی ہے۔ کسی سفید نسل سے متعلق۔ امریکی لہجے میں انگریزی بولتی ہے اور اردو پر بھی کسی اہل زبان ہی کی طرح قادر ہے۔ بال اخروٹ کی رنگت کے ہیں۔ ٹھوڑی پر بائیں جانب ابھرا ہوا سرخ رنگ کا تل ہے۔ بالوں کی رنگت تبدیل کی جاسکتی ہے اور سرخ رنگ والا تل بھی سیاہی اختیار کر سکتا ہے۔“

”پھر.....!“

”ایک اصول بناؤ..... غیر ملکی عورتوں کے ملبوسات کی پینائش تم خود ہی کرو گے۔“

”اب آپ میری قبر کی ٹاپ بھی ملاحظہ فرمائیے..... لمبائی چھ فٹ اور چوڑائی ڈھائی فٹ.....!“

”حکومت سنجیدگی سے سنو..... قریب سے تم اندازہ کر سکو گے کہ تل کی رنگت تبدیل کی گئی ہے۔“

”یقیناً..... یقیناً..... اچھا تو پھر تمہارے اس جواب پر اس نے کیا کہا۔“

”کچھ نہیں۔ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتے رہنے کے بعد بولی تھی کہ اب اُسے سفارت خانہ سے دوبارہ مغز چینی کرنی پڑے گی۔ میں نے اپنی خدمات پیش کی تھیں۔ مسکرا کر شکریہ ادا تھا۔ میں نے پوچھا تھا کیا وہ پھر ملے گی جواب میں اس نے کہا تھا بشرط فرصت اور چلی گئی تھی بس مجھ سے ایک غلطی ہوئی ہے جناب..... کہ میں نے اس کا موجودہ پتہ نہ پوچھا۔“

”کوئی بات نہیں۔ بہر حال تم نے بروقت مجھے اطلاع دی اس کا شکریہ۔ میرے اچھے معاون ثابت ہوئے ہو۔“

فریدی نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر کسی کے نمبر ڈائیکل کے طارق کے بتائے ہوئے گاڑی کے نمبر دہراتے ہوئے کہا ”وین کی چھت سرمئی ہے اور حصہ سیاہ۔ خاص طور پر نظر رکھی جائے۔ ریڈیو کارز کو اطلاع دے دو۔“

سلسلہ منقطع کر کے اس نے سگار سلگایا اور سامنے رکھے ہوئے فائیل کی ورق گردانی کرنے لگا۔

اس کی دانست میں اس عورت نے طارق پر نہ صرف پچھلی رات والے واقعات کا راز معلوم کرنا چاہا تھا بلکہ اس کا اندازہ لگانے کی کوشش کی تھی۔ اس واقعہ کے بعد عرفان گزری۔ کیا وہ پولیس تک خود ہی جا پہنچا ہوگا۔

ویسے عرفان کی کہانی تو آج کے اخبارات کا خاص موضوع تھی اور کھلے ہوئے الفاظ اس کے حراست میں لئے جانے کی تشہیر کی گئی تھی۔

لیکن ساتھ ہی محکمہ سراخ رسانی کے ذمہ دار آفیسروں کا یہ نظریہ بھی بیان کیا گیا تھا کہ کس قسم کی پیش بندی بھی ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ وہاں سرے سے کسی لاش کا وجود ہی نہ ہو۔ ایسی کوئی عورت عرفان سے نہ نکرائی۔ فریدی کو اس خبر کی ترتیب پسند آئی تھی۔ اس نے کی محنت کی داد دینے کے لئے فون پر دوکان کے نمبر ڈائیکل کئے۔

”کہو دوکاندار کی کیسی ہو رہی ہے۔“

”ارے تو یہی دوکان کس حکیم نے لکھ دی ہے نئے میں..... ارے خدا عارت کر۔“
 تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر آواز آئی۔
 ”تمہیں نفیات کی بچی۔“

”ہیلو.....!“

”کیا بک رہے ہو.....؟“

”ہاں..... کہو.....!“ فریدی بولا۔

”وہ ساری میں لمبوس ہے۔ آنکھوں پر تاریک شیشوں کی عینک ہے۔ چہرے کی رنگت سفید..... بالوں کا رنگ سیاہ۔“

”اب وہ کدھر جارہی ہے۔“

”عابد روڈ سے تھرٹین اسٹریٹ میں مڑی ہے۔“

”اچھا..... اس ریڈیو کار کو اطلاع دو کہ میں تین منٹ بعد اس سے براہ راست رابطہ قائم کر لوں گا۔ سوچ آں رکھے۔“

ٹیلی فون کا سلسلہ منقطع کر کے وہ اٹھا اور کمرے سے نکل کر پارکنگ شید کی طرف چل پڑا۔
 ایک ریڈیو کار کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھتے ہوئے بڑی تیزی سے انجن اسٹارٹ کیا اور
 ریڈیو کا سوئچ آن کر کے مائیک میں کہا۔

”ہیلو..... ہیلو..... فریدی اسپیکنگ.....!“

”لیں سر.....!“

”دوسری طرف سے آواز آئی۔“

”پریزنٹ پوزیشن.....!“

”وہ سے پول ہوٹل میں داخل ہوئی ہے جناب.....!“

”سوچ آں رکھو.....!“

”اوکے سر.....!“

فریدی نے کار بیک کر کے پارکنگ شید سے نکالی اور اُسے پھانک سے گزارتا ہوا سڑک پر آگیا۔

ریڈیو کا سوئچ کھلا ہوا تھا۔

”اس وقت وہ گاڑی مغرب کی سمت عابد روڈ پر جارہی ہے۔ نمبر وہی ہیں جو ہمیں۔“

”تھے لیکن باڈی پورا کا پورا سرمئی ہے۔“

”کون ڈرائیو کر رہا ہے؟“

”کوئی عورت.....!“

”غیر ملکی ہے۔“

”نہیں جناب..... مقامی ہی معلوم ہوتی ہے۔“

”کس بناء پر مقامی معلوم ہوتی ہے۔“

”یہ معلوم کرنا پڑے گا۔ ہم نے ایک ریڈیو کار سے رابطہ قائم کر رکھا ہے۔“

”میں ہولڈ ان کئے ہوں۔“

کار کا حادثہ

ایک ہفتہ کے اندر ہی اندر اتنا کام آ گیا کہ حمید کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ اس کی دکان میں وقت پر اُن کا پورا ہونا محال ہی تھا۔ رضیہ جھپکتی رہتی۔ اس کی بوکھلاہٹوں کا مضحکہ اڑاتا وہ تاؤ کھاتا۔

قاسم بھی بدستور موجود تھا۔ دوکان کی چلبلی کا باعث وہی تو تھا۔ ایک سرخ و سپید لمب عورت جو عورتوں کو اس طرح ندیدے پن سے گھورتی کہ وہ جھینپ کر دوسری طرف دیکھنے لگے اور اس کے دانت نکل پڑتے۔

دروازے کے قریب کھڑا ہوتا۔ جسم پر کبھی ساری ہوتی اور کبھی غرارہ سوٹ۔ چلبلی کا اٹھائے کبھی کبھی بسورتا بھی دکھائی دیتا۔ ہاتھ دکھ جاتے لیکن حمید کا حکم تھا کہ ایک گھنٹے کے اندر ہی سے وہ اپنے ہاتھوں کی پوزیشن بدل سکے گا۔

آج صبح ہی صبح دونوں میں جھڑپ بھی ہوئی تھی۔ حمید نے کہا تھا کہ وہ اُس کا دھڑکے گا۔ اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

”یہ قیسے ممکن ہے..... میں تو نہیں..... جاؤں غا..... ارر..... غی.....!“

”بورڈ ادھر رکھ دو۔“ حمید نے ڈانٹ کر کہا تھا۔

”ابھی تو چھ ہوا ہی نہیں بورڈ کیسے رکھ دوں۔“

”کیا نہیں ہوا.....!“

”مطلب یہ کہ دھندا ابھی چلا کہاں ہے؟“

”بس اتنی ہی چلبلی کافی ہے۔“

”قون قہتا ہے.....!“ قاسم نے اس طرح کہا تھا جیسے اس سلسلے میں وہ خود بھی کوئی

رکھتا ہو۔

”ارے دماغ تو نہیں چل گیا تمہارا۔“

”ختم کیجئے۔“ رضیہ بیچ بچاؤ کی غرض سے بولی تھی۔ ”کچھ دن اور سہی آخر آپ اتنا

گھبراتے کیوں ہیں..... نفسیاتی نکتہ نظر سے۔“

”نفسیاتی نقطہ نظر کی ایسی کی تھیسی۔ تم کیوں دخل اندازی کر رہی ہو۔“

”میں یہی مناسب سمجھتی ہوں کہ یہ ماڈل کچھ دنوں اور کام کرے اس کے بعد میں خود اس

کے لئے کوئی دوسرا کام تلاش کروں گی۔ مجھے ہمدردی ہے اس بیچاری سے.....!“

”ہے نا.....!“ قاسم کی بانٹھیں کھل گئیں۔

رضیہ پھر فراروں کے گلے بنانے لگی تھی۔ وہ صرف گلے ہی بناتی تھی۔ خود کو اس کی

اپیشلسٹ کہتی تھی۔

اس وقت وہ بیکار بیٹھی۔ پیشانی پر سلوٹیں تھیں اور ہونٹ کسی قدر سکرے نظر آ رہے تھے۔

دوسری لڑکیاں اپنے اپنے کاموں میں مشغول تھیں۔ کٹر سامنے پڑے ہوئے کپڑے پر

نشانات لگا رہا تھا اور حمید دانتوں میں پائپ دبائے پر تفکر انداز میں قاسم کا جائزہ لے رہا تھا جس نے

ابھی ابھی پوزیشن تبدیل کی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ قاسم اسے پہچان لے تو اس کا رویہ کیا ہوگا۔

ویسے قاسم کی وجہ سے ایک الجھن بڑھ گئی تھی۔ وہ تھی اس کی ذہنی رو..... جس کے تحت وہ

خود کو کبھی مذکر بولتا تھا اور کبھی مؤنث! حمید کا خیال تھا کہ رضیہ اس کے بارے میں مطمئن نہیں۔

پھر زمانہ اور مردانہ آوازوں میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ قاسم بھلا اپنی آواز پر قابو

کیسے پاسکتا جب کہ ذہن ہی قابو میں نہیں تھا۔

بہر حال حمید کے لئے ایک پریشان کن مسئلہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اب قاسم کو چلتا کرے۔

”دکان کی خاصی چلبلی ہو چکی تھی اور وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس دکان کے قیام کا مقصد کچ

مچ تجارت ہی ہوگا۔ کسی خاص اسکیم کے تحت ہی ایسا ہوا تھا۔

فریدی کی پرانی عادت تھی کہ تفتیش کے دوران میں کسی خاص نتیجے پر پہنچنے بغیر اپنے بعض

انعام کی وضاحت نہیں کرتا تھا۔

حمید خیالات کی رو میں بہتا رہا۔

”جی ہاں..... تیار ہیں.....!“ حمید کی بجائے رضیہ نے جواب دیا اور اٹھ کر شوکیس سے ایک جوڑا نکالا۔

عورت کچھ دیر تک جوڑے کا جائزہ لیتی رہی پھر کھٹکھٹاتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”موریاں بنائی ہیں شلوار کی یا مونگ کے پاؤں پہلے ہیں۔“

”میں نہیں سمجھی محترمہ.....!“

”بکرم ہے اس میں.....؟“ عورت غرائی۔

”جی ہاں.....؟“ رضیہ نے کہا۔

”یہ سراسر بکواس ہے.....!“ عورت نے حمید کو مخاطب کیا۔

”وہ کیا جانیں۔“ رضیہ بولی۔ ”موریاں میں نے بنائی تھیں۔“

”تب تو بہتر یہی ہوگا کہ تم نہ بنایا کرو۔“

”کیا میں ادھیڑ کر دکھاؤں بکرم آپ کو۔“ رضیہ نے بھی کسی قدر تیز ہو کر کہا۔

”نہیں نہیں تم خاموش رہو۔ ممکن ہے یہ خاتون درست کہہ رہی ہوں۔“ حمید جلدی سے

بول پڑا۔ ”آپ کل لے لیجئے گا محترمہ۔ میں دوسرا بکرم رکھوا دوں گا۔ وہ کیا کہتے ہیں گھوڑے

کی دم کے بالوں والا۔“

”اور ستیا ناس کرو گے۔“

”اچھا پھر جیسے آپ فرمائیں۔“

”میں کہتی ہوں اس میں بکرم نہیں ہے۔ یہ لڑکی جھوٹ بولتی ہے۔“

”بہت ہو چکا۔“ رضیہ تیور بدل کر بولی۔ ”بہتر ہے آئندہ آپ کسی اور سے سلوائیں۔“

”ارے ارے..... دماغ تو نہیں چل گیا۔“ حمید بوکھلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ”معاف فرمائیے

گا..... بات دراصل یہ ہے کہ یہ لڑکی نفسیات کا شکار ہے۔ میں ان موریوں کو دوبارہ بنواؤں گا۔“

”میں تو ہرگز نہیں بنناؤں گی۔“

”تم پھر بولیں۔“ حمید کوچ کوچ غصہ آگیا تھا۔

”اے مجھے اس طرح کیا گھور رہی ہو.....؟“ اس نے رضیہ کی آواز سنی اور چونک پڑا۔

قاسم کے دانت نکل پڑے تھے اور وہ اب بھی رضیہ ہی کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

”ادھر کیوں دیکھ رہی ہو۔“ حمید نے قاسم کو لاکارا۔

”آئیں پھوڑ دو.....!“ قاسم جل کر بولا۔ ”تموں نہ دیخوں.....!“

”پتھر ماروں گی سر پھٹ جائے گا۔“ رضیہ چنچنائی۔

”نفسیاتی پتھر.....!“ حمید سر ہلا کر بولا۔

”ہاں..... ہاں..... نفسیاتی.....!“ رضیہ بھٹا کر بولی۔ ”اس حرام زادی کی جنس بدل

جائے گی۔ دیکھئے گا.....!“

”قیا..... قہا..... حرام زادی.....!“ قاسم نے غصیلے لہجے میں کہا۔ پھر فہنس پڑا اور بولا۔

”جو حرام زادی ہو وہ بُرا مانے.....!“

”خاموش رہو..... خاموش رہو.....!“ حمید جلدی سے بول پڑا۔ ”یہ درزی خانہ ہے

بھٹیاری خانہ نہیں۔“

قاسم ہنستا رہا۔

رضیہ حمید سے بولی۔ ”اب یہاں یا میں رہوں گی یا یہ.....!“

”اے واہ بی بی۔“ قاسم نے ناک پر انگلی رکھ کر لپکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”ابھی

میری ترچھداری کر رہی تھیں اور اب آپ سے باہر ہو گئیں۔ اللہ تیری کدورت۔“

”یہ میرا فیصلہ ہے جناب.....!“ رضیہ نے حمید سے کہا۔

”نفسیاتی نکتہ نظر سے.....!“ حمید نے کہا۔

”میں سنجیدگی سے کہہ رہی ہوں اور آپ بھی سنجیدگی سے سنئے۔“

حمید جواب نہیں دے پایا تھا کہ ایک گاہک دوکان میں داخل ہوئی۔ ادھیڑ عمر کی پردھان

عورت تھی۔ لمبی قریبی ماڈل کی ایک گاڑی سے اُتری تھی۔

”میرے کپڑے.....!“ اس نے حمید سے کہا۔

”کیا میں الو کا پٹھا ہوں۔“ حمید جھلاہٹ میں سر سے پاؤں تک بل کر رہ گیا۔

”میں اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتی۔“

”میں بھی نہیں کہہ سکتی۔“ قاسم نے شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”یقین اگر مجھے

یہاں سے نکالا گیا تو کہنا ہی پڑے گا۔“

”سٹ اپ.....!“

رضیہ نے قاسم کو اشارہ کیا کہ وہ خاموش رہے۔ بات اس کی سمجھ میں بھی آگئی اور وہ

ہوٹ بھینچے ہوئے سڑک کی جانب مڑ گیا۔

اس کے بعد سناٹا چھا گیا تھا۔

حمید کچھ دیر تک بے حس و حرکت بیٹھا رہا پھر پاپ میں تمباکو بھرنے لگا۔ دو تین کش لینے

کے بعد اُسے خیال آیا کہ وہ درزی نہیں بلکہ محکمہ سراغ رسانی کا ایک ذمہ دار آفیسر ہے اور چونکہ

یہ کسی قسم کا ذراہم ہی ہے اس لئے کبھی کبھی اس قسم کا نیچرل ٹچ اُسے ناگوار نہ گذرنا چاہئے۔

اس نے رضیہ کی طرف دیکھا جو مشین کے قریب سر جھکائے بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔

پاپ کے مزید دو تین کش غصے کو بالکل ہی زائل کر دینے میں ممدو معاون ثابت ہوئے

اور اس نے مسکرا کر کہا۔ ”اگر تم نفسیاتی نکتہ نظر سے اپنے الفاظ واپس لے لو تو میں.....!“

”میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں۔“ رضیہ نے سراٹھا کر کہا۔

”الاقسم بالکل بہت بے وقوف ہو تم.....!“ قاسم بے ساختہ بول پڑا۔ ”میں تو اپنے

الطبع واپس نہیں لوں غی۔“

حمید اُسے نظر انداز کر کے بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ بکرم والا کام تم فرزانہ ہی کے سپرد کر دو۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”ہت تیری کی.....!“ قاسم نے پیلیٹی بورڈ پھینک کر اپنی رانوں پر دو ہتھ پڑا دیا اور چند

لحے رضیہ کو گھورتے رہنے کے بعد بولا۔ ”بہت بجدل ہو..... الفاظ بھی واپس لئے اور اب کوئی

”تم ایسے بدتمیز لوگوں کو رکھتے ہی کیوں ہو۔“ عورت نے رضیہ کو خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

”اے.....!“ دفعہ قاسم کی لاکر سناکی دی۔ ”بدتمیز و بدتمیز نہ کہنا اچھا..... نہیں تو.....!“

”تم سب بے ہودہ ہو۔“ عورت نے پیر پٹخ کر کہا۔ ”اُسے ٹھیک کرو۔ اچھا میں کل اپ

ملازم کو بھیجوں گی..... تیار ملے۔“

”جی بہت اچھا محترمہ.....!“ حمید نے بڑے ادب سے کہا۔

عورت رضیہ کو خونخوار نظروں سے گھورتی ہوئی چلی گئی۔

حمید اس وقت قطعی بھول گیا تھا وہ حقیقتاً کون ہے۔ رضیہ پر اس شدت سے غصہ آیا تھا

اُس میں اور ایک درزی خانے کے بھڑکے ہوئے منظم میں کوئی فرق نہیں رہ گیا تھا۔

”میں اب تمہیں نہیں برداشت کر سکتا۔“ وہ غصہ سے ہانپتا ہوا بولا۔

”ہم دونوں تو رختا پڑے گا.....!“ قاسم باہر سے غرایا۔

”تم چپ رہو۔“

”اے..... جہان سنبھال کے..... ورنہ اٹھاؤں گا کرسی سے اور توڑ مروڑ کر سڑک

پھینک دوں غا..... غی..... غی.....!“

”آپ لوگ جھگڑا نہ کریں۔“ ایک لڑکی بڑے نرم لہجے میں بولی۔ ”بکرم کا کام اب

کیا کروں گی۔ میرے کام سے آج تک کسی کو بھی شکایت نہیں ہوئی۔“

اس لڑکی کا نام فرزانہ تھا۔ بہت ہی کم سن تھی۔ حمید نے تو ابھی تک اُسے قہقہہ لگانے

نہیں دیکھا تھا۔ بہت زیادہ ہنسی کی بات ہوتی تو بس ہونٹوں میں خفیف سا کھنچاؤ پیدا ہو

جسے مسکراہٹ بھی سمجھا جاسکتا تھا اور دوسرے ہنسنے والوں کی بے عقلی پر ماتم بھی۔

”نہیں..... اس گدھی کی بچی کی موریوں میں تو بکرم میں ہی رکھوں گی۔“ رضیہ

سکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اس کے بعد پھر جو چاہے انتظام ہو..... پلاسٹک کا بکرم رکھو

تاکہ پر لیں کرتے وقت مزہ آجائے بیگم صاحبہ کو۔“

اعتراف بھی نہیں ہے۔“

”ارے تم اپنا کام کرو میرے پیچھے کیوں پڑ گئیں ہوا.....!“

”اے جہاں سنبھال کے..... ہوا ہو گی تم.....!“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے..... تم تو باؤ ہو۔“ رضیہ ہنس پڑی۔

”یہ تم نے بورڈ کیوں گرا دیا۔“ حمید نے آنکھیں نکالیں۔

”ابھوس کے مارے.....!“ قاسم نے سزا سمانہ بنا کر جواب دیا۔

”اٹھاؤ بورڈ.....!“

قاسم نے جھک کر بورڈ اٹھایا۔ لیکن بورڈ سمیت دوبارہ سیدھے ہوتے وقت توازن:

نہ رکھ سکا..... چلا آیا منہ کے بل پیچھے۔

آس پاس کے لوگ دوڑ پڑے۔

لڑکیاں بے تحاشہ ہنس رہی تھیں اور قاسم چنگھاڑ رہا تھا۔ ”کھڑ دار جو قسی نے ہاتھ

دور ہٹو..... دور ہٹو..... میں کھداٹھ جاؤں غی..... غرے..... غرے..... باپ رلیخ.....“

بدقت تمام اٹھا اور بورڈ کو ایک کنارے رکھ کر دوکان کے اندر چلا آیا۔

”اب قسی کے منہ سے نہ پھوٹے غا کہ میں بھی جراسا آرام کر لوں۔“ وہ ہانپتا ہوا

ایک کرسی پر بیٹھ کر پہلے سے بھی زیادہ ہانپنے لگا۔

اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔ حمید اٹھ کر اندرونی کمرے میں چلا آیا۔

”ہیلو.....!“ ماؤتھ پیس پیس پائپ کا دھواں چھوڑتا ہوا بولا۔

”قاسم کو وہاں سے ہٹا دو۔“ دوسری طرف سے فریدی کی آواز آئی۔

”میرے بس سے باہر ہے۔ لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ میں صبح سے کوشش

ہوں کہ اب اس سے نجات مل جائے۔“

”میں ابھی بلوائے لیتا ہوں۔“

”شکریہ..... بہت بہت شکریہ۔“

”اور کوئی خاص بات.....؟“

”ابھی تک تو ایسی عورت نظر نہیں آئی جس کا تذکرہ کیا تھا آپ نے۔“

”اب اس کی فکر نہ کرو۔ اب وہ میری دسترس میں ہے۔“ فریدی نے کہا اور پھر سلسلہ

منقطع ہونے کی آواز آئی۔



اور وہ عورت تو چھلا وہ تھا۔ ادھر آئی اور ادھر گئی۔ ایک ہفتہ سے فریدی اس کی نگرانی کر رہا

تھا لیکن ابھی تک کسی کو بھی موقع نہ مل سکا تھا کہ قریب سے اس کی ٹھوڑی کے تل کا جائزہ لیتا۔

ویسے سیاہ رنگ کا تل دور سے بھی دیکھا جاسکتا تھا۔ بالوں میں لگا ہوا خضاب بھی اعلیٰ درجے کا

تھا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کے بالوں کی اصل رنگت سیاہ نہ ہوگی۔

اب وہ اُس دین میں بھی نہیں دیکھی جاتی تھی جس کے بارے میں شبہ تھا کہ وہ عرفان

آرٹسٹ کی ہو سکتی ہے۔ آج کل اس کے پاس سرخ رنگ کی چھوٹی سی اسپورٹ کار تھی۔

اس وقت بھی وہ سرخ رنگ کی گاڑی تار جام والی سڑک پر تیز رفتاری کے ریکارڈ توڑ رہی

تھی اور فریدی اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ اُسے علم تھا کہ وہ تار جام جائے گی۔

پچھلے دن اس کی نگرانی کرنے والوں نے اطلاع دی تھی کہ وہ ایک آدمی سے ملنے کے

لئے تار جام جائے گی۔ اطلاع دینے والے نے بہت قریب سے وہ گفتگو سنی تھی جس کے مطابق

”دونوں تار جام میں ملنے والے تھے۔“

فریدی کو اس کی قیام گاہ کا علم بھی تھا۔ اس ایک ہفتے کے دوران میں اس لڑکی کے سلسلے

میں بہت کچھ ہوا تھا۔ محکمہ سراغ رسانی کے ایک فوٹو گرافر نے اسپائی کیمرے سے اس کی تصویر

لی تھی۔ یہ تصویر عرفان کو دکھائی گئی۔ عرفان نے بتایا کہ وہ اس واردات والی لڑکی سے کسی قدر

مشابہت رکھتی ہے۔ بالوں کی رنگت اور تل کے بارے میں فریدی کو عرفان ہی نے بتایا تھا اور

سے زیادہ ڈیڑھ سو گزر رہا ہوگا۔ فریدی نے یہی رفتار قائم رکھی۔



طارق نے بھی اس کی تصدیق کی تھی۔ لیکن اسپائی کیمرہ تصویر میں تل کو واضح نہ کر سکا۔ فریدی خیال تھا کہ کسی قدر مشابہت والی بات کیمرے کے غلط زاویے کی بناء پر تھی۔ اگر زاویہ صحیح ہو تو عرفان اسے یقینی طور پر پہچان لیتا۔

بہر حال اب دیکھنا یہ تھا کہ وہ کرنا کیا چاہتی ہے۔ فی الحال اس کے خلاف عرفان کی شکایت کے علاوہ اور کوئی ثبوت نہیں تھا۔ وہ لاش بھی تو برآمد نہیں ہو سکی تھی۔

فریدی اس وقت ایک ایسی ریڈیو کار میں سفر کر رہا تھا جو بظاہر ریڈیو کار نہیں معلوم ہوتی تھی۔ دوسری ریڈیو کار اس سے ایک میل پیچھے تھی جس میں امرنگھ تھا۔ وہی اُسے ڈرائیو کر رہا تھا۔

اور یہ آج کوئی نئی بات نہیں تھی۔ پچھلے دو ماہ سے فریدی اپنی نگہداشت کے لئے کچھ ماتحتوں کو اپنے آس پاس ہی رکھتا رہا تھا۔ لیکن کسی کو اس کی وجہ نہیں بتائی تھی۔ حمید کو تو شائد اس کا بھی علم نہیں تھا کہ فریدی نے اس قسم کا کوئی انتظام کیا ہے؟

لڑکی کے بارے میں فریدی نے محسوس کیا تھا کہ وہ سچ مچ خائف ہے ورنہ وہ اس عمرانی کو طول نہ دیتا۔

دفعۃً ایک تیز رفتار گاڑی قریب سے آگے نکل گئی۔ اس کی رفتار سے معلوم ہوتا تھا کہ آگے جانے والی اسپورٹ کار کو بھی پیچھے ہی چھوڑ جائے گی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ گاڑی اسپورٹ کار کے برابر پہنچی اور اسپورٹ کار بے تحاشہ سڑک کے کنارے اترتی چلی گئی۔ فریدی نے اسے اٹلتے دیکھا۔ ساتھ ہی وہ مائیک میں چیخا۔ ”امرنگھ..... ہیلو..... امرنگھ۔“ اسپورٹ کار پر فائر ہوئے ہیں۔ وہ بائیں جانب کچے میں الٹ گئی ہے۔ اسے دیکھو۔ میں فائر کرنے والوں کا تعاقب کر رہا ہوں۔“

مائیک کو ہاتھ سے رکھتے ہوئے اس نے گیر بدل کر ایکسپلریٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔ آندھی اور طوفان کی طرح آگے بڑھتی رہی۔

اور پھر وہ گاڑی نظر آئی گئی جس سے فائر ہوئے تھے۔ اب دونوں کا درمیانی فاصلہ

ایک بڑی خوش لباس اور خوبصورت لڑکی قاسم سے سرگوشیاں کر رہی تھی۔ قاسم کافی نیچے جھک کر اپنا بالیاں کان اس کے منہ کے قریب لایا تھا۔ سرگوشیوں کے دوران میں وہ کبھی الوؤں کی طرح دیدے نچانے لگتا اور کبھی بے ساختہ اس کے دانت نکل پڑتے اور کسی بات کے اعتراف میں سر تو مستقل طور پر ہلے جا رہا تھا۔

حمید کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں اور کام کر نیوالی لڑکیاں بھی کچھ کم متحیر نہیں تھیں۔ دفعۃً قاسم سے سرگوشیاں کرنے والی لڑکی پیچھے ہٹی اور قاسم سیدھا ہوتا ہوا حمید کی طرف مڑا۔ اس کے ہونٹوں پر تنفر آمیز کھچاؤ صاف دیکھا جاسکتا تھا۔ لڑکی اب فٹ پاتھ پر دکھائی دی۔ قاسم چند لمحے حمید کو اسی طرح گھورتا رہا پھر آگے بڑھا اور اُس کے سامنے ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

”قرودو حساب..... ٹھیکے سے.....؟“ اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”وہ کون تھی.....؟“ حمید نے سنی ان سنی کر کے سوال کیا۔

”میری والدہ تھی..... تم سے مطلب۔“ کرودو میرا حساب..... میں جا رہا غری ہوں۔“

”کہاں جا رہی ہو۔“ رضیہ نے پوچھا۔

”دوسری جگہ..... تمہارا بھی انتظام کر دوں گی۔ یہ سالے اس کا بل نہیں ہیں کہ کوئی شرمچھ عورت ان کے یہاں قلم کرے۔“

”کیا کہتی ہو.....؟“ حمید غرایا۔

”اب کھاؤ قسم کہ تم سارا دن ان گریبوں کو نہیں گھورتے رہتے۔“

”کیوں بکواس کر رہی ہو۔“

”جہان سنبھالو منیر صاحب..... ورنہ چٹنی بنا کر رکھ دوں گا..... گی..... گی.....!“

”کر بھی دیجئے حساب.....!“ فرزانہ بول پڑی جو بہت کم سخن تھی اور کسی معاملہ میں آئی ہے۔ لہذا اس گاڑی کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ فریدی سوچ رہا تھا چلو کہاں تک جاؤ گے۔ خود اس کی گاڑی کی ٹینکی لبریز تھی اور کئی گیلن پٹرول ڈکے میں بھی موجود تھا۔

حمید نے سوچا خس کم جہاں پاک اور اس کا حساب کر کے جتنی رقم تھی حوالے کی۔ قاسم نے جاتے جاتے ساری لڑکیوں کو مخاطب کر کے کہا۔ ”دیکھو..... اس آدمی..... ہیلو..... ہیلو.....!“

فریدی نے بائیں ہاتھ سے مائیک اٹھا کر کہا۔ ”لیس اٹ از.....!“

”اے گولی نہیں لگی۔ کہیں کوئی زخم بھی نہیں ہے۔ بے ہوش ہے۔ گاڑی کے باڈی میں متعدد سوراخ ہیں۔ شاید انہوں نے ٹائی گن سے گولیاں برسائی تھیں۔ اب ہمارے لئے کیا حکم ہے۔“

”اسے طبی امداد پہنچانے کی کوشش کرو..... سختی سے نگرانی رہے..... اور مجھ سے بھی رابطہ قائم رکھو۔“

”پتہ نہیں یہ کون تھی..... اور کیا کہہ گئی کہ یک بیک دماغ ہی الٹ گیا بچاری کا.....“

ایک لڑکی بولی۔

”بہت بہتر جناب۔“

فریدی نے مائیک رکھ دیا۔ اب اس کا بایاں ہاتھ بھی اسٹیرنگ پر تھا۔

”کیوں جناب..... کیا آپ اس کے خیال سے متفق نہیں۔“ اس نے حمید سے کہا۔

”ہاں..... نفسیاتی نکتہ نظر سے۔“ حمید کا جواب تھا۔ لیکن خود اسے سخت الجھن تھی کہ آؤ

یک بیک یہ ہوا کیسے۔ وہ لڑکی کون تھی..... اور اس سے کیا کہتی رہی تھی۔

”سخت بد تمیز عورت تھی۔“ رضیہ ہنس کر بولی۔ ”بسیذہ جمع ہی اس کا تذکرہ کرنا مناسب ہو گا یا پھر عورت کے بجائے عورت کہلائی جاسکتی ہے۔“

دفعۃ حمید کو یاد آیا۔ فریدی نے کہا تھا کہ وہ قاسم کو بلوالے گا۔ تو پھر وہ لڑکی.....

..... ایسے ایسے چاند کے ٹکڑے بھی پڑے ہوئے ہیں اس تارک لذات کی جھولی میں۔ ”خدا.....“

میری تقصیر کیا تھی؟“

اس کی گاڑی نے رخ بدل کر ایسی پوزیشن اختیار کر لی تھی کہ وہ ایک پل کے لئے محفوظ

اگلی گاڑی والوں کو شاید احساس ہو گیا تھا کہ پیچھے نظر آنے والی گاڑی ان کے غائب ہو گیا۔ لیکن اس نے فائر کرنے والے کی بجائے اس کی گاڑی کے ٹائروں پر فائر کئے اور پھرتی



رکھ سکا۔ جھٹکے کے ساتھ گرے ہوئے آدمی پر آ پڑا۔

گردن پر اس کی گرفت بتدریج مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ ساتھ ہی یہ کوشش بھی جاری تھی کہ وہ فریدی کو نیچے گرا دے۔

ایک بیک فریدی نے اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا لیکن گردن کے مسلز کو بدستور اکڑائے رہا۔ اب دونوں ایک دوسرے کے مقابل زمین پر پڑے ہوئے زور آزمائی کر رہے تھے۔ وہ اسے نیچے گرا دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ خود فریدی ہی نے جسم ڈھیلا چھوڑ کر اس کے لئے موقع فراہم کیا تھا۔

ایک بیک اس کے حلق سے کریہہ سی آواز نکلی اور بتدریج فریدی کی گردن پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑتی گئی۔

فریدی کا داہنا ہاتھ اس کی ناک پر تھا۔

فریدی کی گردن چھوڑ کر وہ مچلا اور اٹھ کھڑا ہوا..... ناک سے خون کی دھار بہہ نکلی تھی۔ لیکن وہ بھر جھپٹ پڑا۔ پھر اس بار بھی اس کی ناک ہی پر قیامت ٹوٹی تھی۔

دونوں ہاتھوں سے ناک دبائے ہوئے گرا تو پھر نہ اٹھ سکا۔

ناک کے علاوہ کوئی عضو زخمی نہیں تھا۔ اس کے تو سرے سے گولی لگی ہی نہیں تھی۔ غالباً اس کا اندازہ ہو جانے کے بعد کہ تعاقب کرنے والا تنہا ہے اس نے فریدی سے نیٹ لینے کی سوچتی تھی۔

گولی سے زخمی ہونے والا اب بے ہوش ہو چکا تھا۔

”تم دونوں زیر حراست ہو۔“ فریدی نے اپنے شکار کو مخاطب کیا۔ جواب بھی چپت پڑا اس طرح پکلیں جھپکار رہا تھا جیسے اس کے چاروں طرف گہرا اندھیرا ہو۔ وہ کچھ نہ بولا۔ دونوں ہاتھ اب بھی ناک ہی پر جمے ہوئے تھے۔

سے نیچے چھلانگ لگا دی۔

حملہ آور کی گاڑی کے دونوں ٹائر بیکار ہو گئے تھے۔

اپنی گاڑی کی اوٹ لے کر فریدی نے بغلی ہولسٹر سے اعشاریہ چار پانچ کاربوالات..... بندوق گاڑی ہی میں رہ گئی تھی۔

دوسری گاڑی سے فائروں کی بوچھاڑ رک گئی۔

اب فریدی کی گاڑی سے اس کا فاصلہ بمشکل بیس بائیس گز رہا ہو گا۔ دفعتاً اس نے دیا کہ دو آدمیوں نے اس گاڑی سے چھلانگ لگائی اور مخالف سمت میں دوڑنے لگے۔

اس کا انجام

فریدی گاڑی کی اوٹ سے نکل کر انکی طرف چھینٹا۔ لیکن وہ ریوالور کی رینج سے باہر تھے۔ ”ٹھہر جاؤ..... ٹھہرو..... ورنہ فائر کر دوں گا۔“ فریدی نے انہیں آواز دی۔

لیکن وہ بدستور دوڑتے رہے۔ فریدی ملک الموت کی طرح ان کے پیچھے تھا اور پھر ہی اس کے اندازے کے مطابق وہ ریوالور کی رینج میں آئے ٹریگر پر ٹھہری ہوئی انگلی نے ”جمنش کی۔“

وہ دونوں لڑکھڑاتے ہوئے دو چار قدم دوڑے اور پھر ڈھیر ہو گئے۔

فریدی نے ان کے قریب پہنچ کر دیکھا کہ ایک تڑپ رہا ہے اور دوسرا بالکل بے حرکت ہے۔ تڑپنے والے کی ران میں گولی لگی تھی اور دوسرا اونداھا پڑا تھا۔

فریدی جھک کر اسے سیدھا کرنے کی کوشش کر رہی رہا تھا کہ اس کے دونوں ہاتھ اس کی گردن پر آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے گردن پوری طرح ان ہاتھوں کی گرفت میں آ گئی۔

فریدی اپنے ریوالور کو پہلے ہی ہولسٹر میں رکھ چکا تھا۔ بے دھیانی میں توازن برقرار

”پھر رکھ لیجئے منیجر صاحب۔“ قاسم گھگھیا کر بولا۔
”نہیں جاؤ۔“

”اچھا اگر میں مرد ہو جاؤں تو..... کپڑے کاٹنا بھی آتا ہے مجھے.....!“

”مرد ہو جاؤ..... کیا مطلب.....؟“ حمید نے بے انتہا حیرت ظاہر کی۔

”اور آپ کیا سمجھتے ہیں جناب کہ یہ عورت ہے۔“ رضیہ نے حقارت سے کہا۔

”کیا مطلب.....؟“ حمید اس کی طرف مڑا۔

”سچ کہتی ہوں بڑے بھولے ہیں آپ۔ کسی دہقانی دوشیزہ کی طرح..... کاش آپ کے

چہرے پر ڈاڑھی نہ ہوتی۔“

”یہ کیا مذاق ہے۔“ حمید جھلا کر کھڑا ہو گیا۔

”خفا ہونے کی بات نہیں۔ میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ یہ عورت نہیں ہے اور اب اس نے خود

ی مرد بن جانے کا سوال اٹھایا ہے۔“

”کیوں.....!“ حمید قاسم کی طرف دیکھ کر غریبا۔

قاسم پہلے تو ”ہی ہی ہی“ کرتا رہا پھر شرما کر بولا۔ ”الاقسم میں عورت نہیں ہوں۔

یہاں نو قری کرنے کے لئے..... ہی ہی ہی.....!“

”ہوں..... اچھا..... میں ابھی پولیس کو فون کرتا ہوں۔ تم لوگ دیکھتی رہو بھاگ کر

جانے نہ پائے۔“

”ارے..... یعنی..... ارے باپ رے..... اے سنو تو سہی..... الا قسم..... ہو ہو ہو۔“

حمید دوسرے کمرے کی طرف جھپٹا اور قاسم بدحواسی میں دوکان سے اتر کر سڑک کی طرف دوڑنے لگا۔

لڑکیاں ہکا بکا کھڑی تھیں۔ قاسم نے شاید ٹیکسی چھوڑی نہیں تھی۔

پتہ نہیں کس طرح ٹیکسی کا دروازہ کھول کر اس میں ”ٹھنڈ“ گیا۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا کہ

اس کے لئے لفظ ”ٹھنڈ“ ہی مناسب ہوگا۔



عین دروازے کے سامنے ایک ٹیکسی آ کر رکی اور حمید نے دیکھا کہ قاسم دروازہ کھول کر باہر آ رہا ہے۔

وہ خاموش بیٹھا رہا۔

قاسم مسکین سی صورت بنائے ہوئے دوکان میں داخل ہوا۔ لڑکیاں خاموشی سے اُسے دیکھتی رہیں۔

”میں اب اپنا حساب دینا چاہتی ہوں۔“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”کیا مطلب.....؟“

”مطلب یہ کہ میں پھر یہیں نو قری قروں غی۔“

”بھاگ جاؤ۔“

”الاقسم..... رحم قرو..... میرے حال پر..... وہ سالی چونا لگا گئی۔“

”کیوں کیا ہوا.....؟“ رضیہ نے حیرت ظاہر کی۔

”ارے..... وہ حرامزادی جو آئی تھی نا..... مسقا مسقا کر باتیں کر رہی تھی۔“

میرے ساتھ چلو..... میرے قارخانے میں قاسم قرو..... میرے ہی ساتھ رہنا بھی۔ میں اپنے

فلیٹ میں تنہا رہتی ہوں۔ بس میں گلوڑ ماری چلی گئی۔“

”گلوڑ ماری۔“ اس نے ایسے انداز میں کہا تھا کہ حمید کو ہنسی آ گئی۔

”تو پھر ہوا کیا.....؟“ رضیہ نے پوچھا۔

”پتہ بتایا تھا حرافہ نے لیکن وہ گلت تھا..... نہ کارخانہ ملا..... اور فلیٹ میں ایک مولیٰ

صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔“ کہنے لگے یہاں کوئی دردانہ بیگم نہیں رہتی۔ میں نے قہار بتی ہیں۔

بولے اچھی زبردستی ہے۔ پھر آس پاس والوں نے بتایا کہ مولیٰ صاحب وہاں تنہا رہتے ہیں۔“

”کان نہ دکھاؤ..... جاؤ یہاں سے۔“ حمید نے ہاتھ ہلا کر کہا۔

نیکی تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی۔

لوکی کو وہاں داخل کرایا ہے۔ اس بات کا خاص خیال رہے کہ اس عورت کو قتل کرنے کی کوشش

دوسرے کمرے میں حمید ٹیلی فون کے قریب دم بخود کھڑا تھا۔ اُسے علم تھا کہ قائم کی گئی تھی۔ لہذا اب اُسے زہر بھی دیا جاسکتا ہے۔“

بھاگا ہے۔ مقصد بھی یہی تھا۔

”اور پھر..... یہاں کا کیا ہوگا.....؟“

”رضیہ کو اپنے بعد ذمہ دار بنا کر چلے جاؤ۔“

”کیا آپ اُس سے مل چکے ہیں۔“

”بکواس مت کرو..... جو کہہ رہا ہوں کرو۔ وٹس آل.....!“

”دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہونے کی آواز سن کر حمید نے بھی ریسپور رکھ دیا۔

”کون ڈانٹ رہا تھا.....!“ رضیہ نے پوچھا۔

”کیا..... م.....!“ حمید صرف آنکھیں نکال کر رہ گیا۔ لفظ ”مطلب“ زبان سے نہ نکل سکا۔

”کوئی مطلب نہیں ہے..... ذرا آپ کے چہرے پر.....!“

”خاموش رہو۔ میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ میری عدم موجودگی میں یہاں کی

”نفسیاتی تجزیہ۔“ حمید اوپری ہونٹ بھیج کر غرایا۔ ”اب میرے نفسیاتی کفن دفن کی ساری ذمہ داری تم پر ہوگی۔“

”زہے نصیب..... جناب نے اس قابل سمجھا۔“

”میں کہتا ہوں زیادہ باتیں مت کیا کرو۔“

”نفسیاتی نکتہ نظر سے۔“

”شٹ اپ.....!“

ملازمت نہ دیتے۔“

”دلکش.....!“ حمید بُرا سامنہ بنا کر بولا۔ ”لاحول ولا قوۃ..... پھنکار برس رہی۔

چہرے پر۔“

وہ ابھی کچھ اور کہنا چاہتا کہ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ ریسپور اٹھا کر کان سے لگا۔

ہوئے ایک بار پھر اُس نے بُرا سامنہ بنایا۔

سول ہسپتال میں اُسے جزل وارڈ میں رکھا گیا تھا۔ ہو سکتا ہے یہ اسی خیال کے تحت ہوا

دوسری طرف سے فریدی کہہ رہا تھا۔ ”نور! سول ہسپتال پہنچ جاؤ۔ امر سنگھ نے ایک ہو کہ وہاں محفوظ رہے گی۔“



ڈاکٹر نے حمید کو بتایا وہ کئی بار ہوش میں آ کر غافل ہو چکی ہے۔ اس وقت بھی جاگ رہی تھی۔

امر سنگھ وہیں موجود تھا۔
”کیا چکر ہے.....؟“ حمید نے اس سے پوچھا۔

”پتہ نہیں..... میں حسب ہدایت اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا کہ کرنل صاحب اطلاع دی کہ ایک اسپورٹ کار آگے الٹ گئی ہے اُسے دیکھو.....!“
”کہاں ڈیوٹی انجام دے رہے تھے۔“

”مگرانی.....!“
”کس کی مگرانی.....!“

”کرنل صاحب کی۔“
”کیا..... مم..... مطلب.....!“ حمید کو رضیہ یاد آئی اور زبان لڑکھڑا گئی۔

”آپ نہیں جانتے۔“
”کیا نہیں جانتا۔“

”پچھلے دو ماہ سے کوئی نہ کوئی کرنل صاحب کے آس پاس موجود ہوتا ہے جب بھی وہ ہو گیا بلکہ یہ بھی محسوس ہوا کہ بالوں کی اصلی رنگت میں یہ چہرہ کچھ اور کسن نظر آتا ہوگا۔“
”نکلتے ہیں۔“

حمید اپنی گدی سہلانے لگا۔ حقیقتاً اُسے اس کا علم نہیں تھا۔
”یہ لڑکی کون ہے؟“

”یہ میں نہیں جانتا۔ البتہ یہ بتا سکتا ہوں کہ عرفان آرٹسٹ سے اس کا کوئی تعلق ضرور ہے۔“
”اوہ.....!“

”اُسے بلوایا گیا ہے..... اوہ..... وہ آئی گی۔“
راہداری کے سرے پر عرفان دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ ایک سادہ لباس والا بھی تھا۔

عرفان نے ہاتھ اٹھا کر حمید کو سلام کیا۔ امر سنگھ نے زخمی لڑکی تک اس کی رہنمائی کی۔

”وہی ہے..... خدا کی قسم وہی ہے۔“ عرفان بے ساختہ بولا۔ لیکن پھر کسی قدر انضام لال کے ساتھ کہا۔ ”مگر بال..... اس کے بال اخروٹ کی رنگت کے تھے۔“

”ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے۔“ امر سنگھ نے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔ ”چلو.....!“
”لیکن مجھے کب تک اس حال میں رہنا ہوگا۔“ عرفان بڑبڑایا۔

”اس کے ہوش میں آنے تک۔“ حمید بولا۔ ”بس اب جاؤ۔“
عرفان سادہ لباس والے کے ساتھ چلا گیا۔ امر سنگھ اور حمید بے ہوش لڑکی کے بستر کے قریب ہی ٹھہرے رہے۔

”اب آپ اسے دیکھئے گا۔“ امر سنگھ مسکرا کر بولا۔ ”میرا کام عرفان سے اس کی شناخت کرا دینے کے بعد ختم ہو گیا۔“

حمید نے لا پرواہی سے سر کو جنبش دی اور امر سنگھ باہر چلا گیا۔
لڑکی کے خدو خال دلکش تھے۔ ہر چند کے بالوں اور بھنوں کی سیاہ رنگت خضاب کی

مرہون منت تھی لیکن یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہمیشہ ہی سے اس کی عادی نہیں رہی ہے۔
حمید نے اخروٹ کی رنگت کے بالوں کا تصور کیا۔ اس سے نہ صرف دلکشی میں اضافہ

ہو گیا بلکہ یہ بھی محسوس ہوا کہ بالوں کی اصلی رنگت میں یہ چہرہ کچھ اور کسن نظر آتا ہوگا۔
بستر کے قریب پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے سوچا اگر وہ سچ مچ قاتلہ ہے

تو اُسے افسوس ہوگا۔
کچھ دیر بعد اس نے کراہتے ہوئے کروٹ لی اور آنکھیں کھول دیں۔ حمید نے محسوس کیا

کہ وہ اس کے چہرے پر نظر تو جمائے ہوئے ہے لیکن شاید واضح طور پر دیکھ نہیں سکتی۔
”کیا تمہیں کچھ چاہئے۔“ حمید نے آگے جھک کر آہستہ سے پوچھا۔

”مورفیا کا انجکشن..... میں اپنی ریڑھ کی ہڈی میں تکلیف محسوس کر رہی ہوں۔“ لڑکی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ زبان اردو ہی تھی اور لہجہ بالکل دیسیوں ہی جیسا تھا۔

حمید نے وارڈ کے سرے پر کھڑی ہوئی نرس کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔

”لیکن چہرے پر یہ کرب کے آثار.....؟“ حمید نے پرتشویش لہجے میں کہا۔
”سر میں درد ہے۔“

”میں ابھی ایک ٹیبلٹ اور مکچر بھجواتا ہوں۔“ ڈاکٹر نے اس کی نبض دیکھتے ہوئے کہا۔
”نہیں شکر یہ..... میں کچھ کھاؤں پیوؤں گی نہیں۔“
”میں نہیں سمجھا۔“

”میں دواؤں کی ضرورت نہیں محسوس کرتی۔“
”حفظ ماتقدم کے طور پر..... بعض اوقات اندرونی چوٹیں کئی دن بعد گل کھلاتی ہیں۔“
”جب کچھ ہوگا..... دیکھا جائے گا۔“

”ذہن پر بھی اثر معلوم ہوتا ہے۔“ حمید نے ڈاکٹر سے کہا۔
”ممکن ہے۔“ ڈاکٹر نے پرتشویش انداز میں سر کو جنبش دی۔
”اوہ..... تو کیا اب تم لوگ میرے ذہنی توازن کے بگڑ جانے کے امکانات پر غور کر رہے ہو۔ ارے میں صحیح الدماغ ہوں۔“

”بالکل..... بالکل.....!“ حمید سر ہلا کر بولا۔
”خیر میں دیکھوں گا.....!“ ڈاکٹر نے حمید سے کہا اور وارڈ سے چلا گیا۔
نرس پھر وارڈ کے سرے پر جا ٹھہری۔

لڑکی حمید کے چہرے پر نظر جمائے ہوئے پلکیں جھپکاتی رہی۔



”آخر یہ چکر کیا ہے۔“ حمید نے جھلا کر پوچھا۔
جواب میں فریدی صرف مسکرا کر رہ گیا۔

”اوہ..... نہیں.....!“ لڑکی پھر بولی۔ ”ہرگز نہیں۔ میں انکشش نہیں لوں گی۔ کی؟“
”دوانہیں پیوؤں گی۔“

حمید نے اس کی طرف پرتشویش نظروں سے دیکھتے ہوئے نرس سے کہا۔ ”ڈا“
”اوہ..... یہ ہوش میں آگئی ہے۔“
”پولیس کیس.....؟“ نرس نے پوچھا۔
”کیا تم مجھ سے بحث کرو گی۔“
”وہ..... دراصل ڈاکٹر.....!“
”جاؤ.....!“

نرس نے برا سامنہ بنایا اور وہاں سے چلی گئی۔
لڑکی آنکھیں پھاڑے حمید کو گھورتی رہی۔

”یہ نرس ابھی کیا کہہ رہی تھی۔“ اس نے حمید سے پوچھا۔ ”کیسا پولیس کیس.....؟“
”بکواس کر رہی تھی۔ تم اپنے ذہن کو نہ تھکاؤ۔“
”تم کون ہو.....؟“

”ایک ہمدرد.....!“
”میں کہاں تھی.....؟“

”ایک اسپورٹ کار کے نیچے جوالٹ گئی تھی۔“
”ہاں..... مجھے یاد ہے..... اچانک بریک فیل ہو گئے تھے۔“

حمید کو پورے واقعات کا علم نہیں تھا اس لئے وہ خاموش ہی رہا۔ لڑکی کے چہرے پر؟
تشویش کے آثار تھے۔

اتنے میں ڈاکٹر آ گیا۔

”یہ اپنی ریڑھ کی ہڈی میں تکلیف بتاتی ہیں۔“ حمید نے ڈاکٹر سے کہا۔
”نہیں..... نہیں..... وہ میرا وہم تھا۔“ لڑکی جلدی سے بولی۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”اوہ..... وہ..... خدا کی قسم ایسی لڑکی آج تک میری نظروں سے نہیں گزری تھی۔“
کھوپڑی چاٹ گئی۔“

”حالانکہ جناب نے ہی اس کا انتخاب فرمایا تھا۔“

”ان لڑکیوں میں اس سے زیادہ..... مطلب کہ..... کارآمد..... یعنی کہ کارگزار.....!“
”جی میں سمجھ گیا..... مزید وضاحت کی ضرورت نہیں۔“ فریدی نے خشک لہجے میں کہا۔
”سوال یہ ہے کہ آپ نے اُس پر اس حد تک اعتماد کیسے کر لیا۔“
”کس حد تک۔“

”یعنی کہ دوکان ہی اُسے سونپ دی۔“

”تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔ بھلا اس دوکان کی اہمیت ہی کیا ہے۔“

”بالکل خراب ہو گیا ہے۔ جب اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے تو..... یہ کھڑاگ.....
میرے خدا.....“ کہہ کر اُس نے برآمدے سے جو دوڑ لگائی تو ٹھیک اسی جگہ آ کر رکا جہاں
گاڑی کھڑی کی تھی۔

جھپٹ کر گاڑی میں بیٹھا۔ انجن اشارت کیا۔ گاڑی ریورس گیسر میں ڈالی اور پھانگ
سے نکل کر سڑک پر آ گیا۔

اور پھر گاڑی کا صخ دوسری طرف مڑی رہا تھا کہ فریدی کی آواز آئی۔

”ظہرو.....!“

اتنی دیر میں وہ بھی پھانگ تک پہنچ چکا تھا۔

”اُسے اچھی طرح ذہن نشین کر لو.....“ وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”اس لڑکی پر ٹامی گن سے
فائرنگ ہوئی تھی اور میں نے تمہیں اسی خدشے کے تحت سول ہسپتال بھیجا تھا کہ کہیں اسے زہر نہ
دے دیا جائے۔“

”میں جانتا ہوں۔“ حمید نے منہ میڑھا کر کے کہا اور اسکی گاڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

لیکن یہ مسئلہ ابھی تک ذہن میں صاف نہیں ہوا تھا کہ اگر اس لڑکی کے لئے اتنی ہی

”کم از کم مجھے اس لڑکی کے بارے میں تو معلوم ہونا ہی چاہئے جو میرے چارج پر
گئی ہے۔“

”تمہارے چارج میں جو لڑکی دی گئی ہے وہ ایک لڑکی ہے.....!“

”میں اُسے کریم ایک تو سمجھتا نہیں.....!“

”یہ لڑکی ایک اسپورٹ کار میں سفر کر رہی تھی۔ دوسری گاڑی سے اس پر گولیوں
مبوچھاڑ ہوئی۔ بچ کر نکل جانے کی کوشش میں کار قابو سے باہر ہو گئی اور کچے میں جا کر الٹ گئی
”لیکن وہ تو کہتی ہے بریک فیل ہو گئے تھے۔ سامنے سے آنے والی کسی گاڑی کو
کے لئے اس نے اسٹیرنگ بائیں جانب گھما دیا تھا۔“

”حالانکہ سامنے سڑک بالکل سنان تھی۔“

”اور یہ وہی لڑکی ہے جس کے بارے میں عرفان آرٹسٹ نے بتایا تھا۔“

”مجھے یہی اطلاع ملی ہے کہ عرفان نے اُسے شناخت کر لیا ہے۔“

”تو یہ وہی قاتلہ ہے.....؟“

فریدی کچھ نہ بولا۔ تھوڑی دیر کچھ سوچتے رہنے کے بعد کہا۔ ”تمہیں یقین ہے کہ
نے تمہاری باتوں پر یقین کر لیا ہے؟“

”یقین نہ کرتی تو میرے ساتھ چلی کیوں آتی۔“

”تم نے اُسے کہاں رکھا ہے؟“

”ایگل بیچ والے ہٹ میں۔“

”اور تم یہاں بیٹھے ہو۔“

”وہ مجھے زوج دے کر نہیں جاسکتی۔“ حمید نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”آخر یہ اطمینان کس بناء پر۔“

”میں ماہر ”لڑکیات“ ہوں۔“ حمید اکڑ کر بولا۔

”اسی لئے ایک ماہر نفسیات تمہیں خود کشی کی طرف لے جانے کا ارادہ رکھتی ہے۔“

”نہیں..... اس ہٹ کے مالکانہ حقوق تمہارے نام منتقل کرنے کے لئے آنا ہی پڑا۔“

”مجھے تنہا چھوڑ دو۔ ہٹ کا کرایہ جس شرح سے چاہو مقرر کر سکتے ہو۔“

”بڑے مزے کی باتیں کر رہی ہو تم تو.....!“

”تم کیا چاہتے ہو.....؟“

”ایک ہفتے بعد بتا سکوں گا۔“

”کیوں پریشان کر رہے ہو مجھے۔“

”تمہارے لئے ایک بھیانک اطلاع ہے۔“

”میرے لئے.....؟ کوئی بھیانک اطلاع ہے..... میں نہیں سمجھی۔“

”پولیس کو میری بھی تلاش ہے اور تمہاری بھی۔ تم نے تو بریک فیل ہونے کی کہانی سنا کر

جان چھڑائی تھی۔ لیکن میں کیا جواب دوں گا۔“

”پتہ نہیں تم کیا کہہ رہے ہو.....!“ لڑکی نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

حمید کمرے میں داخل ہوا۔ لڑکی نے دروازہ بند کر کے پھر چٹختی چڑھا دی۔

”بولو..... جلدی بتاؤ..... کیا بات ہے۔“

”پولیس کا خیال ہے کہ تم نے اصل واقعہ نہیں بتایا۔“

”پولیس جھک مارتی ہے۔“

”تمہاری گاڑی کے بریک فیل ہو گئے۔ تم نے سامنے سے آنے والی ایک گاڑی کو

پچانے کے لئے اپنی گاڑی سڑک کے نیچے اتار دی۔ تمہاری گاڑی الٹ گئی۔ لیکن الٹ جانے

کے بعد بھی اس کا انجن چلتا رہا تھا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ تم سڑک کے نیچے اترتے ہی انجن کا

سوچ آف کر دیتیں۔“

”ہاں..... ہونا تو یہی چاہئے تھا۔ لیکن میرے ہاتھ پیر پھول گئے تھے۔ اتنی زور ہو گئی

تھی کہ بینڈ بریک کو بھی نہ آزماسکی۔“

”چلو یہ بھی سہی..... لیکن پولیس کو تو اس پر تشویش ہے کہ گاڑی کا باڈی ٹامی گن کی

احتیاط کی ضرورت تھی تو وہ اس طرح اس کے حوالے کیوں کر دی گئی تھی۔

جب یہ یقین ہو گیا تھا کہ لڑکی کی حالت مخدوش نہیں ہے تو فریدی نے حمید کو ہدایت دی:

”تھی کہ وہ اسے اپنے ساتھ کہیں لے جائے لیکن اپنی اصلیت اس پر ظاہر نہ ہونے دے۔ لہذا

اسے ایگل بیچ والے ہٹ میں لے گیا تھا اور وہاں سے فریدی کو بذریعہ فون اس کی اطلاع دینا

چاہی تھی۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ فون کی لائن ہی ناکارہ ثابت ہوئی تھی۔

اس نے سوچا تھا کیوں نہ خود ہی جا کر اطلاع دے آئے۔ بعض مسائل پر فریدی نے

الجنا بھی تو تھا اور اب مزید الجھنیں لے کر دوبارہ ایگل بیچ کی طرف واپس جا رہا تھا۔

درزی خانہ بُری طرح ذہن پر سوار تھا۔ اگر یہ کسی تفتیش ہی کے سلسلے میں قائم کیا گیا تھا:

اصل معاملہ کیا ہوگا

یہی سب کچھ سوچتا اور پور ہوتا ہوا وہ ایگل بیچ تک جا پہنچا۔

ہٹ کے سامنے گاڑی کھڑی کی اور اتر کر برآمدے میں آ رہا۔

صدر دروازہ اندر سے بند تھا۔ کال بیل کا بٹن دبا یا۔ گھنٹی کی گونج اندر سنائی دی۔

اس نے پھر گھنٹی بجائی اور ساتھ ہی آواز بھی دی۔ ”ارے میں ہوں۔ ساجد۔“

”کون ساجد.....؟“ اندر سے لڑکی کی آواز.....

”وہی ساجد یعنی کہ وہ ساجد جو تمہیں یہاں لایا تھا۔“

”اوہ..... اچھا..... کیا بات ہے؟“

”ارے تو کیا دروازہ نہیں کھولو گی۔“

”میں تمہاری آواز نہیں پہچانتی۔ دروازہ بند ہونے کی وجہ سے شکل بھی نہیں دیکھ سکتی۔“

”دروازہ کھول کر میری شکل دیکھی جاسکتی ہے۔“

”اگر تم ہو تو واپسی کی کیا ضرورت تھی۔“

”کیا مطلب.....؟“

”مجھ پر احسان جتانے آئے ہو۔“

گولیوں سے چھلنی ہو کر، گھٹیا ہے۔“

لڑکی کے چہرے پر پہلے تو شکست خوردگی کے آثار نظر آئے پھر وہ ہنس پڑی۔
”اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔“ حمید نے حیرت ظاہر کی۔

”پولیس کی غلط فہمی پر ہنسی آ رہی ہے۔ گولیوں کے وہ نشانات کئی ماہ پرانے ہیں۔ میری بھائی نے اس پر نشانہ بازی کی مشق کی تھی اور وہ گولیاں فورٹی فائیو کیلبر کے ریوالور کی تھیں۔ ٹائی گن کی نہیں۔ میرا بھائی فوجی ہے۔ اکثر بہت زیادہ پی جانے کے بعد ایسی ہی حرکتیں کرتا ہے۔“
”ہو سکتا ہے..... لیکن کیا تم اس کی وضاحت کرنے کے لئے کو توالی تک چل سکو گی۔“

”میں کیوں جاؤں۔ میں تو ہرگز نہیں جاؤں گی۔“

”پھر میری گردن چھنے گی۔ کیونکہ میں نے اپنا بالکل صحیح نام اور پتہ لکھوایا تھا۔“

”تم تو بڑے ذہین آدمی معلوم ہوتے ہو۔ جواب دی کر لینا۔ ذہانت اور خوبصورتی مشکل

سے یکجا ہوتی ہیں۔“

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بڑے دلاؤ دیز انداز میں مسکرائی۔

”خدا یا..... رحم.....!“ حمید نے ٹھنڈی سانس لی۔

”کیوں کیا ہوا.....؟“

”کچھ نہیں! قدر دانی کا شکریہ۔ زندگی میں پہلی بار کسی خاتون کی زبانی اپنے لئے اے

الفاظ سنے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنے کفن دفن کا انتظام خود کروں یا اس کی ذمہ داری ظ

والوں پر ڈال دوں۔“

”سچ کہتی ہوں..... مذاق نہیں..... بڑے پیارے لگتے ہو۔“

”محترمہ میں اتنا زبردست اُلونہیں جتنا صورت سے معلوم ہوتا ہوں۔“

”تو اس میں خفا ہونے کی کیا بات ہے۔“

”پولیس کو کئی دن سے ایک ایسی لڑکی کی بھی تلاش ہے جس کے بال اخروٹ کی رنگ

کے ہیں۔ ٹھوڑی پر سرخ رنگ کا ایک اُبھرا ہوا تفل ہے۔“

”تو پھر میں کیا کروں.....!“ لڑکی نے متحیرانہ لہجے میں پوچھا۔

”یہ تمہیں نہیں معلوم کہ تمہارے سر کے پچھلے حصے کے تھوڑے سے بالوں کی اصلی رنگت نکل آئی ہے اور تم نے آئینہ کب سے نہیں دیکھا۔ تل پر جو تم نے سیاہی چڑھائی تھی وہ بھی اتر چکی ہے۔“

”نہیں.....!“ لڑکی تھوڑی پر ہاتھ رکھ کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

”اور..... ذرا اس لٹ کو بھی ملاحظہ کرو۔“ حمید نے اس کے سر کے پچھلے حصے کی لٹ آگے کی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔ ”اخروٹ کی رنگت۔“

”یہ..... یہ..... اررر..... تمہیں بھی..... غلط فہمی ہوئی ہے..... اور پپ..... پولیس کو بھی۔“ اس نے ہانپتے ہوئے کہا اور ایک اسٹول پر بیٹھ گئی۔

”کئی دن ہوئے میں نے اخبار میں کسی آرٹسٹ کی کہانی بھی دیکھی تھی اور اس کہانی کی ہیروئن کا طبعیتسے ان کے اخبارات میں شائع ہوا تھا۔“

”میں نے کوئی کہانی نہیں پڑھی۔“

”بہر حال تم مجھے بتاؤ کہ پھر تم کیا بلا ہو..... ظاہر ہے کہ آسمان سے تو ٹپکی نہ ہوگی۔ نہ زمین پھاڑ کر برآمد ہوئی ہوگی۔ بتاؤ کچھ اپنا اتا پتا۔“

”مم..... میرا نام سارہ رحمان ہے۔ نصیر آباد میں ایک انڈسٹریل ہوم چلاتی ہوں۔“

”انڈسٹریل ہوم.....!“ حمید اچھل پڑا۔

”ہاں..... سلائی وغیرہ کا کام سکھایا جاتا ہے اور تجارتی پینے پر بھی سلائی ہوتی ہے۔“

”یعنی کہ..... یعنی کہ..... درزی خانہ۔“

”ہاں..... درزی خانہ..... لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ درزی خانہ کے نام پر تم کچھ نروس سے ہو گئے ہو۔“

”نن..... نہیں تو..... میں تو خاندانی درزی ہوں۔“

”کیا مطلب.....؟“

”اپنے یہاں بھی کچھ اسی قسم کا کام ہوتا ہے۔ گارمنٹ فیکٹری۔“

”تھانوں کا کام ہے یا کٹ پیس کا.....!“

”ہم صرف ملٹری کے ٹھیکے لیتے ہیں۔“ حمید باپ میں تمباکو بھرتا ہوا بولا۔

پھر وہ خاموش ہو گئے۔

سارہ رحمان سر جھکائے کچھ سوچ رہی تھی اور حمید اُسے ایک ٹک دیکھے جارہا تھا۔

دفترا اس نے کہا۔ ”یہ سارہ رحمان کیسا نام ہے۔“

”میرے ماں انگریز تھی..... اور باپ دہلی..... میں یوریشین ہوں۔“

”تب تو تمہیں حق حاصل ہے جب چاہو انگریز بن جاؤ اور جب چاہو اس حد تک

بن جاؤ کہ بال بھی رنگ ڈالنا پڑیں۔“

”میں ایسی تبدیلیوں کی شائق ہوں۔“

”عرفان آرٹس والی کہانی کے بارے میں کیا کہتی ہو۔“

”میں نہیں جانتی کہ وہ کیا بلا ہے۔“

”لیکن حلیہ..... جو پولیس کی طرف سے جاری کیا گیا ہے؟“

”تصویر تو نہیں شائع ہوئی کہ تم اتنے وثوق کے ساتھ کہہ رہے ہو۔“

”مگر یہ سرخ رنگ کا تھل اور اخروٹ کی رنگت کے بال.....!“

”اس کی کوئی اہمیت نہیں۔“

”چلو بال تم نے خضاب سے رنگ لئے..... لیکن میں نے آج تک نہیں سنا کہ

خاتون نے اپنے تلوں کی رنگت میں تبدیلی کرنے کی کوشش کی ہو۔“

”لختہ بہ لختہ تبدیلیاں مجھے زیادہ خوش رکھتی ہیں۔“

”بس تو اب اپنے کان اکھاڑ کر ناک کی جگہ چپکاؤ اور ناک مجھے دے دو۔ میں

خنگ کر کے کسی شاعر کے مقبرے پر رکھ آؤں گا۔“

”اگر تم نے میری کسی طرح مدد کی ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میرا مضحکہ بھی اڑاؤ

”میں بتاؤں..... میری ایک تجویز ہے..... میں بھی مطمئن ہو جاؤں گا اور تم بھی اپنی

پوزیشن صاف کر سکو گی۔“

”میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتی۔“

”لیکن میری پوزیشن.....!“

”تمہارے لئے اس میں کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔“

”میں بتا چکا ہوں کہ ہسپتال میں میرا نام اور پتہ بھی لکھ لیا گیا تھا۔ جب تمہاری المی ہوئی

گاڑی میں گولیوں کے بنائے ہوئے سوراخ دیکھے گئے تو پولیس میری تلاش میں نکل کھڑی

ہوئی۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ میں تمہیں اپنی شہری قیام گاہ میں نہیں لے گیا تھا۔ اس ہٹ کے وجود کا

علم کسی کو بھی اس طرح نہیں کہ یہ میرے نام سے منسوب کیا جاسکے۔“

حمید نے محسوس کیا کہ اُس کے چہرے پر پائے جانے والے بے اطمینانی کے آثار

اپناک مٹ گئے ہیں اور ان کی جگہ بٹاشت نے لے لی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں اس نے جو

کچھ کہا اس کا مفہوم یہی ہو سکتا ہے کہ وہ بات اس کے لئے کسی خاص اہمیت کی حامل نہیں۔

حمید اُسے بغور دیکھتا رہا۔ دفعتاً دونوں کی نظریں ملیں اور وہ ہنس پڑی۔

”بہت مسرور نظر آ رہی ہو۔“

”اب میں کچھ دن اسی ہٹ میں گزاروں گی۔“

”شوق سے..... لیکن مجھے شہر چھوڑ کر کہیں اور چلا جانا پڑے گا۔“

”کیوں.....؟“

”ارے تو کیا پولیس سے اپنی جان نچاؤں گا۔“

”تم بھی یہیں رہو..... شہر کی طرف جاؤ ہی مت۔“

”لاپتہ ہو جاؤں۔“ حمید آنکھیں نکال کر بولا۔ ”اور میرے بھائی بند مجھے مردہ سمجھ کر

میرے کاروبار پر قبضہ کر لیں۔“

”وہ اس پر کچھ کہنے کی بجائے گنگنا نے لگی۔“

”آؤ ٹویٹ کریں۔“

بلد نمبر 32

97

سہمی ہوئی لڑکی

رہی ہے بڑی اچھی اردو بول رہی ہے۔ لیکن پچھلے ہفتے اس نے مجھے بتایا تھا کہ یہ ایک امریکن درست ہے۔ بال اس نے رنگ ڈالے ہیں ورنہ یہ اخروٹی رنگ کے تھے۔“

”یہ جھوٹ ہے۔“

داخل ہوا۔

جیسے ہی سارہ کی نظر اس پر پڑی بوکھلا کر اسٹول سے اٹھ گئی۔

”تت..... تم.....!“

”اور اس نے مجھے ایک طوفانی رات میں ایک خاص مہم پر بھیجا تھا۔ ایک ویران مکان

میں..... گھنے جنگل کے درمیان..... اس کے لئے۔“

اجنبی نے جیب سے ایک چرمی پرس نکالتے ہوئے کہا۔ جس کی ایک طرف کی سطح سنہری

تھی۔ سارہ بے ساختہ اس پر جھپٹ پڑی۔ پرس چھین لیا اور اُسے اپنے جہر کے گریبان میں

فلوٹی ہوئی پیچھے ہٹ آئی۔

کے سینے کا نشانہ لے رہا تھا۔

اجنبی جہاں تھا وہیں ٹھٹھک گیا۔

”اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔“ حمید غرایا۔

دفعۃ حمید کو پھر اسی دروازے کی طرف متوجہ ہو جانا پڑا جس سے اجنبی آیا تھا۔

عرفان آرٹسٹ..... یہ عرفان آرٹسٹ تھا۔

حمید سارہ کی طرف مڑا جس کا چہرہ بے حد زرد ہو چکا تھا۔

”بہی ہے..... وہ قاتلہ.....!“ عرفان ہاتھ اٹھا کر چیخا۔

پھر وہ بیرونی دروازے کی طرف جھپٹی ہی تھی کہ حمید نے چھلانگ لگائی اور دونوں کے

درمیان حائل ہو گیا۔

”بھاگو.....!“ اُس نے تیز قسم کی سرگوشی کی۔ ”اُن کے پیچھے پولیس بھی ہوگی۔“

”پیچھے ہٹو.....!“ حمید نے اُسے دھکا دیتے ہوئے کہا۔

”کیا کر رہے ہو تم۔“ وہ دانت پیس کر بولی۔ ”تم بھی پھنسو گے۔“

”پھنس جانا میری بابی ہے..... اور پھر جب.....!“ حمید بائیں آنکھ دبا کر مسکرایا۔

”یہ مذاق نہیں ہے۔“ وہ پھر گئی اور پھر دروازے کی طرف جھپٹی۔ حمید نے اس کے

حمید کی گرفت مضبوط تھی۔

”میں ایک پولیس آفیسر ہوں احق۔“ حمید نے اسے پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا۔

اجنبی نے جس کے چہرے پر ذہنی پراگندگی ظاہر ہو رہی تھی چپ چاپ ہاتھ اٹھا دیے

اور مڑ کر اس دروازے کی طرف دیکھتا رہا جس سے داخل ہوا تھا۔

”تم نے بغیر اجازت اندر آنے کی جرأت کیسے کی۔“ حمید نے اس سے پوچھا۔

لیکن وہ صرف اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔

”کیا پچھلا دروازہ تم نے کھولا تھا۔“ حمید نے سارہ سے پوچھا۔

”نہیں..... نہیں تو.....!“

”کیا تم نے قفل توڑا ہے۔“ وہ پھر اجنبی کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”یہ کون ہے.....؟“ حمید نے سارہ کو مخاطب کیا۔

”مم..... میں.....!“

”نہیں..... تم اس سے انکار نہیں کر سکو گی۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے اس کی آمد پر تہہ منوں ہاتھ پکڑ لئے اور وہ وحشیانہ انداز میں ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے اوپر گرنے لگی۔ لیکن کلائیوں

زبان سے ایسے الفاظ نکلے تھے جن میں حیرت بھی تھی اور شناسائی کا اعتراف بھی۔“

”یہ ایک فراڈ لڑکی ہے جناب۔“ اجنبی نے کہا۔ اس وقت یہ فراق اور شلوار میں

”اس نے دیکھتے ہی جھپٹ لیا تھا۔ اس وقت اسکے چہرے کے گریبان میں موجود ہے۔“

”ٹھیک ہے..... اب تم جاسکتے ہو۔“

”جب بھی کوئی ضرورت ہو آپ اسی فون نمبر پر یاد فرما سکتے ہیں۔“

”شکریہ۔“ فریدی نے کہا اور طارق باہر چلا گیا۔

فریدی نے ہاتھ اٹھا کر اپنے ماتحتوں کو کسی قسم کا اشارہ کیا اور پیچھے ہٹ کر دروازہ مقفل کرتے ہوئے اس طرح ساکت و سامت ہو گیا جیسے اچانک کوئی خاص بات یاد آئی ہو۔

سیدھا ہو کر چند لمحوں کے سوراخ کو گھورتا رہا پھر اندر جانے کے لئے مڑا۔

حمید سارہ کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مار رہا تھا اور عرفان اسٹریچر کے قریب کچھ ایسے انداز میں کھڑا تھا جیسے خود اس سے کوئی بہت بڑی خطا سرزد ہوئی ہو۔

”وہ کھڑکی کھول دو.....!“ فریدی نے بائیں جانب والی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

حمید سے پہلے عرفان کھڑکی کی طرف جھپٹا تھا۔

”ابھی کچھ دیر پہلے کسی قدر ہوش کے آثار نظر آئے تھے۔ لیکن اب پھر غافل ہو گئی ہے۔“

”جی.....!“ فریدی سارہ کے چہرے پر نظر جمائے ہوئے بولا۔ لہجہ طنزیہ تھا۔ حمید چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”بے ہوشی خطرناک صورت اختیار کر چکی ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”ذرا قینچی تو لاؤ۔“

”قینچی.....!“ حمید نے حیرت سے کہا۔

”ہاں سر کے سارے بال اتارنے پڑیں گے۔ ورنہ خدشہ ہے کہ کہیں یہ بے ہوشی پاگل بن کی شکل میں نہ ختم ہو۔“

”اچھا..... اچھا.....!“ حمید نے معنی خیز انداز میں سر ہلا کر کہا۔ تیز قدموں سے چلتا ہوا ”سرسے کمرے میں چلا گیا۔“

سارہ کے جسم کو جنبش ہوئی پھر ہلکی سی کراہ نکلی۔ آہستہ آہستہ آنکھیں کھلیں اور بالآخر پھیل کر رہ گئیں۔

”پپ..... پولیس.....!“

اس کے ہاتھ لکھت ڈھیلے پڑ گئے اور حمید کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ توازن کی حیرت ہو۔ کمر میں ہاتھ دے کر سنبھال نہ لیتا تو یقینی طور پر اس کے ساتھ ہی خود بھی گر رہا ہوتا۔

سارہ کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔

حمید نے عرفان سے کہا۔ ”وہ اسٹریچر بچھا دو۔“

اسے اسٹریچر پر لٹا دیا گیا۔ بے ہوش ہو گئی تھی۔

دانت اتنی سختی سے ایک دوسرے پر جمتے تھے کہ جبڑوں کی وریدیں ابھر آئی تھیں۔



ہٹ کے باہر تھوڑے فاصلے پر محکمہ سراغ رسانی کے بہترین نشانہ باز موجود تھے۔

اس طرح پھیلا یا گیا تھا کہ مشکل ہی سے ان کے بارے میں کسی کو کسی قسم کا شبہ ہو سکتا۔

اور فریدی ہٹ کے عقبی دروازے میں کھڑا دور دور تک کا جائزہ لے رہا تھا۔

دور بین لنک رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ دور بین آنکھوں کی قریب لاتے ہوئے اس کا رخ

طرف پھیر دیتا۔

کچھ دیر بعد پشت پر قدموں کی چاپ سن کر مڑا۔

”اوہ..... طارق..... کیا بات ہے؟“

”وہ بے ہوش ہو گئی ہے جناب۔“ لمبے آدمی نے جواب دیا۔

”میرے اسسٹنٹ نے کیا برتاؤ کیا تمہارے ساتھ.....؟“

”ارے صاحب انہوں نے تو ریوالور نکال لیا تھا۔“

”ہوں تو..... وہ بے ہوش ہو گئی۔ پرس کہاں ہے۔“

”لیکن وہ تمہیں کیوں مار ڈالنا چاہتا تھا۔“

”جیسا بھی دوں تو اس سے کیا فائدہ.....؟“

”تم ایک ذمہ دار آفیسر کو بیان دے رہی ہو۔“ حمید ناخنگوار لہجے میں بولا۔

”آفیسر..... ہونہہ.....!“ وہ بُرا سامنہ بنا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

”ہونہہ کا کیا مطلب.....!“ حمید گرجا۔

”میں موت کے منہ سے بہت قریب ہوں۔“ سارہ نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”اس لئے

سنو۔ تم سب ناکارہ اور غیر ذمہ دار ہو۔ تمہاری آنکھوں کے سامنے بڑی سے بڑی غیر قانونی

حرکتیں ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن تمہارے کانوں پر جوں تک نہیں رنگتی۔ یا تم مجرموں سے خائف

ہوتے ہو یا لمبی رشوتیں لے کر چشم پوشی کرتے ہو یا اس لئے پہلو تہی کرتے ہو کہ تم سے بھی

بڑے کسی آفیسر کی سفارش تمہارے ہاتھ روک دے گی۔“

”یہ تو تم سچ کہہ رہی ہو۔“ فریدی آہستہ سے بولا۔

سارا اور زیادہ جوش و خروش کا مظاہرہ کرنے لگی۔

”گولڈن ایرو تنظیم کے لئے تم نے کیا کیا..... مجھے بتاؤ کیا وہ تنظیم پوری قوم کو تباہی کی

طرف نہیں لے جا رہی۔ ملک کا کون سا ایسا شہر ہے جہاں اس کا کاروبار نہ چل رہا ہو۔“

”گولڈن ایرو..... مگر وہ تو محض کہانی ہے۔“ فریدی نے کسی قدر حیرت ظاہر کرتے

”اس شریف آدمی کے مکان میں جوئی سڑک کے کنارے جنگل کے درمیان واقع ہے۔“ ہوئے کہا۔

”تو ان کا بیان صحیح تھا.....؟“

”ہاں..... بالکل.....!“

”لیکن ہمیں تو وہاں کوئی لاش نہیں ملی۔“

”لاش کے بارے میں بھی یہی بتائیں گے۔ وہ سو رہا تھا۔ کوٹ اتار کر کرسی پر ڈال دیا۔“

تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ کوٹ کی جیب میں ریوالتور ضرور ہوگا۔ میں نے ریوالتور نکال کر دل کی باج

سینے پر رکھا اور ٹریگر دبا دیا۔ یہ بھی میری خوش قسمتی تھی کہ ریوالتور میں سائیکلنر لگا ہوا تھا اس لئے

فائر کی آواز نہیں ہوئی تھی ورنہ میں اتنی آسانی سے فرار نہ ہو سکتی۔“

”افسوس کہ آپ لوگ ایک بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔“

جنگ کی تھی۔“

”خوب.....!“ فریدی مسکرایا۔ لہجہ ایسا ہی تھا جیسے اس طفلانہ خیال کی تصحیک کرنا مقصود ہو۔

سارہ اور زیادہ تیز ہو کر بولی۔ ”میں خود اسی تنظیم کی ماری ہوئی ہوں۔ میں جو اسی تنظیم

”نہیں.....؟“

ایک رکن بھی ہوں۔“

”ہوں..... ہوں..... ہوگا.....؟“ فریدی نے اکتاہٹ کا اظہار کیا۔

”تنظیم کے سربراہ کو شبہ ہو گیا ہے کہ میں اس سے واقف ہوں۔ اس لئے وہ مجھے کوئی علم نہیں۔“

کرادینا چاہتا ہے۔ رزم خان اور اس کے تین گرگے میرے پیچھے تھے۔ رزم خان کو تو میں۔ ”آپ سے.....!“ وہ بوکھلا کر کھڑی ہو گئی۔

”تم مجھ سے کیوں ملنا چاہتی تھیں۔“

”موت کی نیند سلا دیا اور گرگوں کے بارے میں نہیں جانتی کہ ان کا کیا حشر ہوا۔“

وہ خاموش ہو کر حمید کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر ہاتھ اٹھا کر بولی۔ ”ہاں میری کار کی بازو

گولیوں سے چھلنی ہو گئی..... کسی نے دوسری گاڑی سے مجھ پر فائرنگ کی تھی۔ لہذا جب

جان بچا کر نکل جانا چاہتی تھی الٹ جانے کے بعد گاڑی کا انجن کیسے بند ملتا۔“

”کیا تم بتا سکو گی کہ رزم خان کی لاش کیوں نہ برآمد ہو سکی۔“ فریدی نے پوچھا۔

”میں یہ سب کچھ محکمہ پولیس کو صرف ایک آفیسر کو بتا سکتی ہوں۔ میں اس سے ملنا چاہتی

ہوں۔ اُسی سے ملنے کے لئے تار جام جا رہی تھی کہ مجھ پر حملہ ہوا۔“

”ہوں..... کیا نام ہے اس کا۔“

”کرنل فریدی.....!“ سارہ نے جواب دیا۔

”تار جام میں ملنا چاہتی تھیں.....؟“ فریدی نے حیرت سے کہا۔

”میرے ایک شناسا نے کرنل سے میرے لئے وقت لیا تھا اور ملاقات تار جام میں ٹھہرنا بتائی تھی۔“

”میرے ایک شناسا نے کرنل سے میرے لئے وقت لیا تھا اور ملاقات تار جام میں ٹھہرنا بتائی تھی۔“

”میرے ایک شناسا نے کرنل سے میرے لئے وقت لیا تھا اور ملاقات تار جام میں ٹھہرنا بتائی تھی۔“

”میرے ایک شناسا نے کرنل سے میرے لئے وقت لیا تھا اور ملاقات تار جام میں ٹھہرنا بتائی تھی۔“

”میرے ایک شناسا نے کرنل سے میرے لئے وقت لیا تھا اور ملاقات تار جام میں ٹھہرنا بتائی تھی۔“

”میرے ایک شناسا نے کرنل سے میرے لئے وقت لیا تھا اور ملاقات تار جام میں ٹھہرنا بتائی تھی۔“

”میرے ایک شناسا نے کرنل سے میرے لئے وقت لیا تھا اور ملاقات تار جام میں ٹھہرنا بتائی تھی۔“

اس کے وہ ماتحت جو مختلف مقامات پر پھیلے ہوئے تھے اسے اس عالم میں دیکھ پڑے۔ ہٹ کو گھیرے میں لے لیا گیا۔

کھڑکی کے شیشوں میں دوسورائے تھے اور دوسری طرف کمرے میں ایک لاش پڑی تھی۔ فریدی کی ایک گولی نے اس کی پیشانی میں سوراخ کیا تھا اور دوسری سینے پر بیٹھ کر قریب ہی ایک کمان پڑی نظر آئی۔ کھڑکی کے نیچے والی چھوٹی میز پر دو تیر رکھے ہوئے تھے کچھ دیر بعد وہ پھر اپنے ہٹ میں واپس آیا۔ یہاں سارہ دم توڑ چکی تھی۔

حمید برآمدے ہی میں کھڑا ملا۔
”یہ کیا ہوا.....؟“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”ساری احتیاطی تدابیر خاک میں مل گئیں۔“ فریدی نے کہا۔ ”اس وقت اس کی آواز زخمی شیر کی غراہٹ سے مشابہ تھی۔“
”کیا وہ نکل گیا.....؟“

”ہاں..... بالکل اسی طرح ہاتھ سے نکل گیا کہ اب میرے کسی سوال کا جواب نہ سکے گا۔“

”مر گیا.....؟“
”دونوں گولیاں کارگر ہوئی تھیں۔ اوہ..... وہ پرس.....!“

”میرے پاس ہے۔“ حمید نے کوٹ کی جیب پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”میں اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا لیکن جس انداز سے وہ اس پر جھپٹی تھی مجھے اس کی اہمیت کا احساس دلانے کے لئے کافی تھا۔“

”اس نے اسی پرس کیلئے طارق کو وہاں بھیجنے کا خطرہ مول لیا تھا۔ تمہیں یاد ہوگا کہ مکان کی پشت پر بھی گیا تھا اور اس دیوار کا جائزہ لے رہا تھا جس پر چڑھ کر وہ صحن میں کودی تھی۔“
”مجھے یاد ہے۔ محض اس لئے یاد ہے کہ آپ نے میرے ساتھ ایک زیادتی کی تھی۔“
”مارج کی روشنی اس طرح میرے چہرے پر ڈالی تھی کہ میں جھنجھلا اٹھا تھا۔“

”اور اسی وقت میں نے وہ پرس زمین سے اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لیا تھا۔ پھر تم لوگوں کی روائی کے بعد جب پرس کا جائزہ لیا تو مجھے وہاں رکنا ہی پڑا۔ پرس کی سادہ سطح پر ایک نشان موجود ہے اور یہی نشان میری دلچسپی کا باعث بنا تھا۔“

حمید نے پرس کو جیب سے نکالا۔ اس کی ایک طرف کی سطح سنہری تھی اور دوسری طرف کی سطح سادہ۔ لیکن اس طرف تیر اور کمان کا نشان تھا اور تیر کا پھل نوکیلا ہونے کی بجائے گول تھا۔
”گولڈن ایرو تنظیم سے تعلق رکھنے والے یہی نشان استعمال کرتے ہیں۔ لیکن خیر۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ پرس میں کوئی ایسی بڑی رقم موجود نہیں تھی جس کے لئے وہ اس قسم کا خطرہ مول لیتی۔“

”لیکن یہ گولڈن ایرو کا نشان۔“
”تم جانتے ہو کہ یہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ عوام تک جانتے ہیں کہ وہ نشان گولڈن ایرو تنظیم سے تعلق رکھتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ مجھ سے کیوں ملتا چاہتی تھی اور تنظیم سے تعلق رکھنے والے اس کی زندگی کے گاہک کیوں بن گئے تھے۔ لاڈیہ پرس مجھے دے دو۔“
فریدی نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور جیب میں ڈال لیا۔

”اب کیا کیجئے گا۔“
”ہمارے محکمے کے سارے ذمہ دار آفیروں کا یہی خیال ہے کہ گولڈن ایرو ایک ایسا خیالی ہوا ہے جو مجرموں کا پشت پناہ بن جاتا ہے۔ حقیقتاً اس کا کوئی وجود نہیں۔ یہ کوئی منظم گروہ نہیں بلکہ مختلف لوگ اسی نام کی آر لے کر اپنا کاروبار چلا رہے ہیں۔ میں ان آفیروں سے کبھی متفق نہیں رہا۔ عرصہ سے اس تنظیم کے سربراہ کو منظر عام پر کھینچ لانے کی سعی کرتا رہا ہوں۔“
”اوہ..... تو کیا..... گروہ کے وہ لوگ جو پکڑے جاتے ہیں اس کی نشاندہی نہیں کر سکتے۔“

”انہوں نے اس کی شکل نہیں دیکھی کیونکہ وہ سر تا پایا پوش ہوتا ہے اور چہرہ نقاب میں چھپا ہوتا ہے۔ احکامات فون پر ملتے ہیں اور وہ آدمی بھی اُس کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا۔“

جس نے لڑکی کو مجھ سے ملانے کا فریب دے کر تار جام کا سفر کرنے کی ہدایت دی تھی۔“

”وہ غریب اسے اپنا ہمدرد سمجھتی رہی تھی۔“

”ہوں..... اُن.....!“ فریدی کسی سوچ میں ڈوب گیا۔

اُس کے ماتحت لاشوں کو وہاں سے ہٹانے کے لئے انتظامات کرتے رہے۔

کچھ دیر بعد فریدی بولا۔ ”اب ہمیں نصیر آباد جانا پڑے گا۔ رزم خان اور اس لڑکی بارے میں وہیں سے معلومات حاصل ہو سکیں گی۔ رزم خان کی لاش عرفان کے گھر سے ہٹا کر غائب کر دی گئی تھی۔ ممکن ہے رزم خان سرگروہ سے واقف رہا ہو۔ بڑے دل گردے کا آدمی تھا۔“

”کیا میں خود کو درزی خانے سے سبکدوش تصور کروں۔“

”ہرگز نہیں۔ کیونکہ وہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ثابت ہوا ہے۔“

”اوہ..... ٹھیک یاد آیا۔ لڑکی نصیر آباد میں ایک انڈسٹریل ہوم چلا رہی تھی۔ کاروباری

حیثیت سے اس میں درزی خانہ شامل تھا۔“

”یہ اطلاع اس سلسلے میں سودمند بھی ہو سکتی ہے۔“ فریدی نے پر فکر لہجے میں کہا۔

قاتل کا ہاتھ

ختم شد

نہیں یا صرف نیم چڑھے کر لیے پسند آتے ہیں۔ ”میٹھا میٹھا ہپ اور کڑوا تھو“ کی عادت میں تو مبتلا نہیں۔ میرے کتنے بچے ہیں؟ دوسری شادی کی ضرورت پیش آئی تو پہلی بیوی تحریری اجازت نامہ دینے سے انکار تو نہیں کرے گی۔ اگر انکار کرے تو آپ کیا کریں گے؟ کوئی پیتے ہیں؟ نہیں پیتے تو وجہ لکھئے۔ کتابوں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آپ عشق و محبت کے قائل نہیں؟ آخر ایسا کیوں ہے؟ کیا کبھی کوئی گہری چوٹ کھائی تھی؟

”بہت بڑی چوٹ کھائی تھی یارو..... کہ پیدا ہو گیا تھا اور اب آپ جیسوں سے نپٹ رہا ہوں۔“

ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ایک بار ایک عجیب حرکت اور بھی ہوئی ہے کسی صاحبزادے نے کتابوں کی پشت پر چھپنے والی میری حالیہ تصویر میں بڑی خوبصورت ڈازھی اور مونچھوں کا اضافہ کر کے ”برائے فوری توجہ“ مجھے بھجوائی ہے۔ لہذا ان کی تشفی کے لئے میں نے اس بار تصویر کا پوز بدل دیا ہے۔ ممکن ہے انہیں یکسانیت گراں گذری ہو۔ ہر معاملے میں مجھ سے نئے پن کے متوقع رہتے ہیں یار لوگ۔

اس ناول میں زیادہ تر پڑھنے والوں کی ایک خواہش پوری کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سچ پوچھئے تو اسی خواہش کے احترام میں اس کہانی کی داغ بیل ڈالی گئی تھی۔ بہر حال جنہوں نے اس خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا وہ بھی کم از کم یہ تو کہہ ہی سکیں گے کہ ایسا ہونا چاہئے تھا۔

ابن صفی

پیش رس

”قاتل کا ہاتھ“ حاضر ہے۔ کسی قدر تاخیر ہوئی۔ اُمید ہے کہ آپ کچھ خیال نہ فرمائیں گے، ویسے بھی توقع ہے کہ آپ نے خود ہی خیال نہ فرمایا ہوگا کیونکہ آپ میں سے زیادہ افراد ”امتحانات“ کے چکر میں رہے ہوں گے لہذا تفریحی کتب کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی گناہ سمجھا ہوگا۔ ہونا بھی یہی چاہئے۔ تفریحی کتب اسی لئے ہوتی ہیں کہ ان سے صرف ذہنی تھکن دور کر لی جائے۔ انہیں اوڑھنا اور پچھوتا بنالینا کسی طرح بھی درست نہیں۔ یہ بات پہلے بھی کئی بار آپ کو سمجھانے کی کوشش کر چکا ہوں۔ توقع ہے کہ آپ نے بھی اس پر عمل کرنے کی کوشش کی ہوگی۔

ادھر پیش رس میں ”تبصرے“ کے شوق میں پڑھنے والوں نے عجیب قسم کے خطوط کی بھرمار کر رکھی ہے۔ یہ اتنے عجیب ہیں کہ اگر فرداً فرداً تبصرہ کرنے بیٹھوں تو ایک ضخیم کتاب الگ سے تیار ہو جائے۔

ان میں سے بہترے حضرات نے میری ”ذاتیات“ سے متعلق بھی بے نیکی قسم کے سوالات کئے ہیں، میں کہتا ہوں کہ آخر اس سے پڑھنے والوں کو کیا سروکار کہ مجھے کر لیے پسند ہیں یا

کر پہلے کان دبائے جب اس سے بھی مقصد حاصل نہ ہوا تو تکیہ سر کے نیچے سے اوپر آگیا لیکن گھنٹی کی آواز کہاں پیچھا چھوڑنے والی تھی۔ بلا آخر جھلا کر اٹھ بیٹھا تھا اور ریسیور اٹھا کر ماؤتھ پیس میں اس طرح دھاڑا تھا کہ اس کی دانت میں دوسری طرف والے کے کان کا پردہ خطرے میں پڑ گیا ہوگا۔

لیکن دوسری طرف کی گھنٹی سی آواز نے اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی دوڑادی۔ آواز فریدی کی تھی اور وہ کہہ رہا تھا۔ ”فوراً لیبارٹری میں آ جاؤ۔“ بے اختیار حمید کی نظر ٹائم پیس پر پڑی۔ تین بجے تھے۔ وہ دانت پیس کر رہ گیا۔

”کیا پھر سو گئے۔“ دوسری طرف سے پوچھا گیا تھا۔

”نہیں..... اعمال نامہ اٹھائے میدان حشر کی طرف دوڑ لگا رہا ہوں۔“

”ڈس منٹ کے اندر اندر پہنچو۔“ دوسری طرف سے کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا گیا اور پھر جب وہ لیبارٹری میں پہنچا تو..... پہنچ گیا تھا کسی نہ کسی طرح..... اونگھتے ہوئے زینے طے کئے تھے لیکن لیبارٹری سے واپسی پر ایک بار پھر آئینہ دیکھا تھا۔ حیرت سے آنکھیں پھاڑی تھیں اور جھلا کر کہا تھا ”معاف کیجئے گا میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔“

فریدی نے پلاسٹک کے کٹوے چکا چکا کر اس کی شکل اس حد تک تبدیل کر دی تھی کہ اُسے اپنی آنکھوں میں اجنبیت نظر آنے لگی تھی۔

نہ صرف صورت بدلی تھی بلکہ نام تک بدل گیا تھا۔ اب وہ کیپٹن ساجد حمید کی بجائے میجر سعید تھا اور اس کی جیب میں دو گھنٹے بعد والی فلائٹ کا ٹکٹ بھی موجود تھا۔ فریدی نے بتایا تھا کہ رام گڈھ کے ہوٹل فرازو میں اس کے لئے اسی نام پر کمرہ کل سے بک ہے۔ بس اُسے وہاں پہنچ کر اپنی آمد کی اطلاع دینی پڑے گی۔ ظاہر ہے اس نے مقصد معلوم کرنے کی کوشش ضرور کی ہوگی لیکن وہ اب بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔

اسے عافیت اسی پر نظر آئی تھی کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے چپ چاپ اس پر عمل کرے۔ وہ فریدی تھا۔ اُسے گوشت کی کسی دوکان پر بٹھا کر فیصہ کی مشین کا پینڈل گھمانے پر بھی مجبور کر سکتا تھا۔

لڑکی اور دھماکہ

دور کی پہاڑیوں پر برف چمک رہی تھی اور غروب ہوتے ہوئے سورج نے ڈھیروں رنگ بکھیر دیا تھا۔ چمکدار نارنجی رنگ جس کی چھوٹ میلوں گہری وادی میں پڑی موسم سرما کا چل چلاؤ تھا۔ خود رو جھاڑیوں میں رنگارنگ کلیاں پھوٹنے لگی تھیں اور سارا دن چھوٹے چھوٹے پرندے منڈلایا کرتے۔

رام گڈھ میں سیاحوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ ہوٹل آباد ہونے لگے تھے۔ والوں میں اندرون ملک کے لوگوں کی تعداد زیادہ تھی۔ غیر ملکی سیاح خال خال ہی دیتے۔ ویسے اس وقت تو ان کی بہتات ہوتی ہے جب میدانوں میں گرم ہوائیں چلنے لگتی۔ بہر حال دور کی پہاڑیوں میں برف چمک رہی تھی اور کیپٹن حمید فرازو کی بالائی میں سوچ رہا تھا کہ آخر وہ برف کب پگھلے گی جو خود اس کی کھوپڑی میں جمی ہوئی ہے۔ برف شاید سمجھ میں آ سکے کہ وہ یہاں کیوں پایا جاتا ہے۔

چند راتیں گذریں وہ اپنی خواب گاہ میں سو رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجنی شروع ہوئی۔

وہ فراو کی حدود میں داخل ہو گئی تھی۔ لیکن یہ کیا..... کوئی اور بھی تو تھا جیسے وہ نارنجی کوٹ والی لڑکی کی بے خبری میں اس کے پیچھے لگ گئی ہو۔ کیونکہ نارنجی کوٹ والی لڑکی دفعتاً رک کر پیچھے مڑی تھی اور تعاقب کرنے والی اس طرح زمین پر جھک گئی تھی جیسے کوئی گرا ہوا چیز اٹھا رہی ہو۔

نارنجی کوٹ والی لڑکی پھر تیزی سے عمارت کی طرف چل پڑی۔

تعاقب کرنے والی اب سیدھی کھڑی تھی۔ حمید نے دوبارہ شیشے ایڈجسٹ کے پڑا۔ تعاقب کرنے والی وہی لڑکی رضیہ تھی۔ ایسی مشابہت ابھی تک تو اس کے تجربے میں آئی تھی کہ عادات و اطوار تک ایک دوسرے سے مماثلت رکھتے ہوں۔

یہ نارنجی کوٹ والی لڑکی جس کا تعاقب کر رہی تھی ابھی تک فراو میں نہیں دکھائی دی ہو سکتا تھا کہ اس کے دوران قیام سے قبل وہاں آتی رہی ہو۔

اس نے اپنے کمرے میں واپس آ کر دور بین رکھی اور نیچے جانے کی تیاری کرنے لگی۔ اس دہلیسی لڑکی کو قریب سے دیکھنا چاہتا تھا۔

وہ ڈائیننگ ہال کی ایک میز پر نظر آئی۔ سامنے چائے دانی رکھی تھی۔ لڑکی کا چہرہ ہاتھ تھا۔ ایسا نہیں لگتا تھا کہ اُسے اس تعاقب کا علم رہا ہو۔

ڈائیننگ ہال میں رضیہ کہیں نہ دکھائی دی اس وقت پورے ہال میں حمید سمیت صرف افراد تھے۔

حمید نے لڑکی کو چائے انڈیلے دیکھا۔ کچھ عجیب سا چہرہ تھا اس کا جو کسی زاویے پر بے حد معصوم نظر آتا تھا اور کسی زاویے سے اس میں جہان دیدگی کی جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہوتی رہ رہ کر ہلکی ہلکی جنبش ہوتی اور بالکل ایسا ہی لگتا جیسے ذہن میں چکرانے والی بات کو ہونٹوں تک آنے سے روک دینے کی کوشش کر رہی ہو۔

حمید نے اپنے لئے اس کے قریب ہی کی ایک میز منتخب کی تھی اور اسے اچھی طرح دیکھتا تھا۔ چائے کی پہلی چسکی لے کر اس نے بُرا سامنہ بنایا اور شکر دان سے شکر نکالنے لگی۔

شکر ڈالنا بھول گئی تھی۔

خفیہ سی مسکراہٹ اور سر ہرج میں ڈوبی ہوئی آنکھوں نے اس کے چہرے پر کچھ عجیب سا ہلچل پیدا کر دیا تھا۔

وہ اُسے چائے پینے دیکھتا رہا۔ کیا وہ کہیں باہر سے آئی ہے؟ اس نے سوچا لیکن باہر سے آئی ہوتی تو پیدل نہ ہوتی۔ اسٹیشن سے یہاں تک مسافت رکشے کے بغیر طے کرنا مشکل ہی تھا۔

دفعتاً عمارت کے کسی گوشے میں ایک زور دار دھماکہ ہوا اور وہ اچھل پڑی۔ پیالی ہاتھ سے چھوٹ کر اس کے اوپر الٹ گئی تھی۔

اور دوسرے ہی لمحے میں بھلا حمید اس کے قریب کیوں نہ نظر آتا۔

”ظہریئے ظہریئے۔“ اس نے جلدی سے کہا۔ ”یونہی بیٹھی رہے، ورنہ یہ نامعقول چائے۔“ پھر رومال جیب سے نکال کر اس کی طرف جھکا ہی تھا کہ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”شکر یہ میں ٹھیک ہوں۔“ وہ خوفزدہ لہجے میں بولی۔ ”یہ دھماکہ کیسا تھا۔“

”دھماکہ۔“ حمید نے حیرت ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ”کیسا دھماکہ۔“

”یہ بھی ہوا تھا۔“

”میں نے دھیان نہیں دیا۔“

”دھماکہ ہی کی بناء پر تو۔“

”اچھی بات ہے۔ ظہریئے۔ میں دیکھتا ہوں۔“

اتنی دیر میں کاؤنٹر کلرک اپنی جگہ سے غائب ہو چکا تھا۔ بقیہ تین آدمی بھی آواز کی طرف دُڑے گئے تھے۔

ہال میں اب ان دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

دفعتاً وہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔ ”ظہریئے..... میں تمہارا جاؤں گی۔“

”جی ہاں..... واقعی..... کیسی بھول ہونے والی تھی مجھ سے۔“

”وہ لوگ جو گئے ہیں معلوم ہی کر لیں گے۔“

”جی ہاں..... یہ بات تو ہے۔“

”کیا میں آپ کو خوفزدہ معلوم ہوتی ہوں۔“

”ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ آپ ایک باہمت لڑکی معلوم ہوتی ہیں۔“

”شکریہ۔ اب یہیں بیٹھ جائیے۔“ نارنجی کوٹ والی نے کہا اور خود بھی بیٹھ گئی۔ حمید:

رومال اس کے ہاتھ میں تھا جسے وہ اپنے کوٹ کے دامن پر پھیرے جا رہی تھی اور وہ سوچا:

کہ لڑکیوں کے معاملے میں واقعی اس کے ستارے بے حد شاندار ہیں۔ لیکن وہ دھماکہ

دھماکہ کیسا تھا۔ عمارت کے کسی قریبی ہی حصے سے آواز آئی تھی۔

ذرا ہی سی دیر بعد کاؤنٹر کلرک نے کاؤنٹر کے قریب کھڑے ہو کر بلند آواز میں کہا:

پریشانی کی بات نہیں جناب۔ کچن میں ایک آئیل اسٹو پھٹ گیا تھا۔ کسی قسم کا نقصان نہیں ہوا۔

”اوہ.....!“ لڑکی نے ایک طویل سانس لی اور خواہ مخواہ ہنس پڑی۔

”دیکھا آپ نے۔“ حمید نے اس سے کہا۔ ”اسی لئے میں نے اس کی طرف توجہ دے

کا حق محفوظ رکھا تھا۔“

وہ پھر ہنس دی اور بولی۔ ”میں نسلا چنگیزی ہوں۔“

”یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ کچھ دیر پہلے میں بہت خوفزدہ تھا۔“

”کیوں.....؟“

”آپ کو دیکھ کر ہیبت سی چھا گئی تھی مجھ پر۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے دل کے بغداد

تاریوں نے ہلہ بول دیا ہو۔“

اس کی بے آواز ہنسی بڑی دلکش تھی۔

”یہ اسٹو کیسے پھٹ جاتے ہیں؟“ اس نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ اس کا بوائیلر.....!“

”اسٹو میں بوائیلر کا کیا کام.....!“

”نہیں ہوتا.....؟“ حمید نے متحیرانہ لہجے میں پوچھا۔

”قطع نہیں۔“

”تب تو شاید میں جانتا ہی نہیں کہ اسٹو کیا چیز ہے۔ پھر آپ کو کس طرح بتاؤں کہ کیسے

پھٹ جاتا ہے۔“

”مجھے غصہ بہت جلد آ جاتا ہے۔“

”اب تاوقتیکہ مجھے غصے کی صحیح تعریف نہ معلوم ہو جائے اپنی زبان بند ہی رکھوں گا۔“

”ارے.....!“ وہ یک بیک چونک کر بولی۔ ”آپ مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش

کر رہے ہیں..... کیوں؟ اپنی میز پر جائیے؟“

”بہت بہتر۔“ حمید نے سعادت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا اور اپنی میز پر واپس

آ گیا۔ وہ دوسری طرف دیکھتی رہی۔ پھر تھوڑی دیر بعد اس کی جانب دیکھ کر مسکرائی۔ نہ صرف

مسکرائی بلکہ اٹھ کر سیدی اسی کی میز پر چلی آئی۔

”اب آپ مجھے بھگا دیجئے۔“ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھتی ہوئی بولی۔ ”بدلہ ہو جائے گا۔“

”میں چنگیزی نہیں ہوں۔“ حمید نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”اوہ..... آپ تو جی جی برامان گئے۔ میں بہت پریشان ہوں۔“

”چہرے سے تو پریشانی نہیں ظاہر ہوتی۔“

”بس میں ہر وقت خود کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ آپ کہاں سے آئے ہیں۔“

”چیف پورٹ سے۔“

”شکاری ہیں۔“

”لاحول ولا قوۃ۔“

”کیا مطلب.....؟“

”کیا میں صورت سے شکاری لگتا ہوں۔“

”نہیں صورت سے تو شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں۔“ وہ ہنس پڑی۔

”میں ایک بہت بڑے شکاری کا سیکریٹری ہوں۔“

”شکاری بھی سیکریٹری رکھتے ہیں۔“

”شکاری ہی تو سیکریٹری رکھتے ہیں۔“

”میں نہیں سمجھی۔“

”آپ یہیں مقیم ہیں۔“ حمید نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

”ہاں.....!“

”نہیں۔ تو آج ہی دیکھا ہے۔“

”زیادہ تر اپنے کمرے میں پڑی رہتی ہوں۔“

”آپ بھی باہر ہی سے آئی ہیں۔“

”جی ہاں..... نصیر آباد سے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ میرے ڈیڑی جھکی ہیں۔ ورنہ اس درجہ حرارت چاہئے اور وہ اس درجہ حرارت کی تلاش میں سطح سمندر سے کچھ اور اوپر چلے گئے ہیں یہاں کیوں آتے۔ رام گڈھ کی سردیاں تو رہ کر پلٹتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لومڑیوں کے ہیں۔ ان پہاڑوں پر جہاں اب بھی برف دکھائی دیتی ہے کیا سمجھے۔“

شکاری ابھی تک یہاں مقیم ہیں۔“

”شکاری ہیں۔“

”ارے نہیں۔ وہ بے چارے تو نصیر آباد کے نیشنل کالج میں کیمسٹری پڑھاتے ہیں۔“

”خوب.....!“

”آپ کو یقین نہیں آیا۔“

”بالکل آگیا۔ نہ آنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔“

”میں آپ کی آنکھوں میں بے اعتباری دیکھ رہی ہوں۔“

”آنکھوں پر نہ جائیے۔ یہ عموماً دھوکا ہی دیتی ہیں۔“

”میں لوگوں کی آنکھوں سے پہچان لیتی ہوں کہ وہ کیسے ہیں۔“

”اور اگر کسی بیچارے کی ایک ہی آنکھ ہو تو.....!“

”اوہ تو کیا میں سارے زمانے کی آنکھیں دیکھتی پھرتی ہوں۔“

”میری آنکھوں میں کیا نظر آیا آپ کو۔“

”آپ بہت اچھے آدمی ہیں۔“

”ایک آنکھ پتھر کی ہے۔ واضح رہے۔“

”نہیں..... نہیں تو۔“ وہ ہنس پڑی۔

”غور سے دیکھئے۔“

وہ آگے جھک آئی اور حمید نے بوکھلا کر کہا۔ ”کہیں آپ کے ڈیڑی نہ آجائیں۔ سیدھی بیٹھئے۔“

”ڈیڑی یہاں نہیں ہیں۔“

”پھر کہاں ہیں۔“

”کیمسٹری کے سلسلے میں کوئی نیا تجربہ کر رہے ہیں۔ اس کے لئے فضا میں ایک مخصوص

درجہ حرارت چاہئے اور وہ اس درجہ حرارت کی تلاش میں سطح سمندر سے کچھ اور اوپر چلے گئے

وہ مٹھکا اڑانے کے انداز میں ہنسنے لگی۔

”آپ کو یہاں تنہا چھوڑ گئے ہیں۔“

”میں تنہا کب ہوں۔ اتنے لوگ اور موجود ہیں۔“

”میں نے یہاں ایک غیر ملکی لڑکی بھی دیکھی ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”غالبا ایرانی ہی ہو سکتی ہے۔“

”اوہہ.....!“ وہ برا سامنہ بنا کر رہ گئی۔

”کیوں؟ کیا آپ کو اس کا تذکرہ بھی ناگوار گذرا ہے۔“

”بالکل۔ مجھے تک چڑھے لوگ پسند نہیں۔ وہ بہت مغرور معلوم ہوتی ہے۔“

”مغرور..... یہ کیسے کہہ سکتی ہیں آپ۔“

”میں نے ایک آدھ بار اُسے متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کا رویہ تو ہین آمیز

ہو گیا تھا۔“

”اوہ..... تو کیا اس نے آپ سے گفتگو کرنا پسند نہیں کیا تھا۔“

”نہ اسامہ بنا کر دوسری طرف دیکھنے لگی تھی۔“

”ممکن ہے اُسے اردو نہ آتی ہو۔“

”تو کیا آپ نے اُسے اردو میں مخاطب کیا تھا۔“

”انگریزی آتی ہے آپ کو۔“ حمید نے چڑانے کے لئے حیرت ظاہر کی۔

”اب آپ میرا مضحکہ اڑانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”آپ غلط سمجھیں۔ دراصل آپ صورت سے یعنی کہ..... کہنے کا مطلب یہ کہ اُسے

شکل بالکل مولویوں جیسی ہے اس لئے میں نے سوچا۔“

”یہ مولویوں جیسی شکل کیسی ہوتی ہے۔“ اس نے قدرے ترش لہجے میں پوچھا۔

”مولویوں جیسی..... یعنی کہ بس..... مولویوں جیسی۔“

اس اجمال کی تفصیل حمید کے بس سے باہر تھی۔ اس لئے ہٹکاتا ہی پڑا۔ اس پر لڑک

کئی ایسے مولویوں کے نام گوائے جنہیں انگریزی آتی تھی۔ لہذا حمید نے تسلیم کر لیا کہ اس

شکل مولویوں جیسی نہیں تھی۔

”مجھے ایسے لوگ پسند نہیں جو مولویوں کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔“ لڑکی نے جھلائے

لہجے میں کہا۔

حمید نے یہ سوچ کر بات اڑا دینی چاہی کہ بعض لوگ مذہب کے معاملے میں

جذباتی ہوتے ہیں۔

”نہیں آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ آپ غلط راستے پر ہیں۔“ وہ جھنجھلا کر بولی۔

”بھلا آپ کو میرے راستے کا علم کیونکر ہوا۔“

”آپ ان لوگوں میں سے معلوم ہوتے ہیں جو مولویوں کی جہالت کا ماتم کرنے

اپنی لاشوں پر سے بھی گذر جاتے ہیں۔“

”بھئی یہ فلسفہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ ویسے یہ ڈائلاگ تھا کچھ فلمی انداز کا۔“

”کیا آپ فلمیں بہت دیکھتی ہیں۔“

”یقیناً دیکھتی ہوں۔ پھر.....!“

”آپ غلط راستے پر ہیں۔“

”کیوں.....؟“

”مولویوں سے پوچھئے۔“

وہ چند لمحے حمید کو گھورتی رہی پھر ہنس کر بولی۔ ”دراصل میں بہت باتونی ہوں کئی دنوں

کے کوئی ملا نہیں تھا۔“

وہ خواہ مخواہ ہنستی رہی۔

”اچھا تو اب ہم اس ایرانی لڑکی کے بارے میں باتیں کریں گے۔“ حمید نے کچھ دیر بعد کہا۔

”کیوں..... کیوں.....!“

”وہ یہاں کب سے مقیم ہے۔“

”میں کیا جانوں۔ جب میں آئی تھی تو اُسے یہیں دیکھا تھا۔“

”اسی دن یا دوسرے دن۔“

مجھے یاد نہیں۔ وہ بُرا سا منہ بنا کر بولی۔ ”میری نظروں میں اس کی کیا اہمیت ہے کہ اس

طرح یاد رکھتی۔“

”کیا خیال ہے۔ وہ تنہا ہی ہے یا اور کوئی بھی اس کے ساتھ ہے۔“

”ارے تو کیا میں اس کی ٹوہ میں رہتی ہوں۔“

”قدرتی بات ہے محترمہ۔ اس کا سلوک آپ سے اہانت آمیز تھا۔“

”میں جوتے کی نوک پر مارتی ہوں ایسوں کو۔ میں کیوں رہنے لگی ٹوہ میں۔“

”خیر..... خیر..... گولی مارئے۔“

”میں شکاری نہیں ہوں۔“ وہ مسکرائی۔

”اچھا اگر وہ آپ کی ٹوہ میں رہتی ہو تو پھر.....!“

”میں کہتی ہوں اس کا قصہ ختم کیجئے۔ ورنہ میں اٹھ کر چلی جاؤں گی۔“

”ختم..... ختم..... بالکل ختم.....!“

”میں نے بھی آپ کو آج سے پہلے یہاں نہیں دیکھا۔ آپ کب سے مقیم ہیں۔“
 لیکن سب سے زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ اس کا پورا چہرہ ڈاڑھی سمیت خون سے تر تھا۔
 دو آدمی سہارا دیئے ہوئے اس کو ڈائینگ ہال میں لا رہے تھے۔

”کئی دن سے۔“ حمید نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میرے ذہن نے ایسی کوئی ہدایت نہیں دی تھی کہ اپنے کمرے ہی تک محدود رہوں۔“
 ”تو میرے ہی ڈیڑی نے کب دینی ہے؟“ وہ پھر جھنجھلا گئی۔

”درجہ حرارت بڑھ رہا ہے۔ خدا آپ کو بھی سطح سمندر سے کافی اونچائی پر پہنچائے۔“
 ”میں اب قطعی نہ بولوں گی۔“
 ”پھر آپ کس قسم کی باتوں ہیں۔“
 وہ کچھ کچھ نہ بولی۔ چہرے پر کبیدگی کے آثار تھے۔

”اب میں شدت سے بور ہو رہا ہوں۔“ حمید کچھ دیر بعد بولا۔
 ”کیوں؟“
 ”کس سے باتیں کروں۔“

وہ غصہ پڑی۔ حمید کو عجیب سی لگی وہ لڑکی۔ موڈ تبدیل ہونے میں دیر ہی نہیں لگتی تھی۔ انہوں نے خود ہی ہمیں یہاں کا پتہ دیا تھا۔
 ابھی شکن ہے ماتھے پر اور ابھی آنکھیں کنول کی طرح کھل گئیں ان میں مسرت ناچنے لگی۔
 ”دفعۃً وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔“
 ”ڈیڑی!۔“ وہ اس کی چیخ ہی تھی۔ پھر حمید نے اُسے صدر دروازے کی طرف جھپٹتے دیکھا۔
 ”میرے لئے کوئی نئی بات نہیں۔“ اس نے لا پرواہی سے جواب دیا۔
 ”کیا کہا!۔ کیا مطلب!۔“

”اُسے صاحب آپ اپنا کام کیجئے۔ آپ سے کیا سروکار!۔“
 ”آپ ہوش میں ہیں یا نہیں۔“
 ”بالکل ہوش میں ہوں اور آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ خواہ مخواہ دوسروں کے معاملات

”میں نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ ویسے منبر کا لہجہ اُسے اتنا گراں گزرا تھا کہ شاید اُسے مار

صدر دروازے میں ایک عجیب التعلت آدمی کھڑا نظر آیا۔ اس کا قد پونے پانچ فٹ
 زیادہ نہ رہا ہوگا۔ ڈاڑھی اور سر کے بال بے تحاشہ بڑھے ہوئے تھے۔ نحیف الجذہ بھی تھا۔

اجنبی

بیٹھتا لیکن اس بے تکی چوہشن کو سمجھنا بھی تو تھا۔

”یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ لڑکی بولی۔

”کیا ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“

”یہ ڈیڈی کو اچھی طرح جانتے ہیں۔“

”میں کچھ نہیں سمجھا۔“

”آپ لوگ براہ کرم میرے ساتھ آئیے۔“ منیجر نے دروازے کی طرف بڑھ

کہا۔ اشارہ ان دونوں کی طرف بھی تھا جو بوڑھے کو یہاں تک لائے تھے۔ حمید

مناسب سمجھا کہ فی الحال اسی کے مشورے پر عمل کیا جائے، معاملات کو سمجھنا بھی تو تھا۔

لیکن اُسے یقین تھا کہ لڑکی یہ نہیں چاہتی۔ کم از کم وہاں اس کی موجودگی کی متنی فہم

نے لاپرواہی سے شانے جھٹکائے اور منیجر کے پیچھے چل پڑا۔

پھر وہ تینوں منیجر کے آفس میں داخل ہوئے۔ لیکن حمید کے قدم ٹھٹکے تھے۔ روبرو

موجود تھی۔ ایک آرام کرسی پر نیم دراز کوئی کتاب دیکھ رہی تھی۔

”اوہ آپ یہاں ہیں۔“ منیجر نے انگریزی میں جرت ظاہر کی۔

”ہاں آں.....!“ اس نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ ”ادھر نکلی آئی تھی۔ تم نہیں نے

کتاب اٹھالی اور دیکھنے لگی۔ کیا یہاں میری موجودگی غیر ضروری ہے۔“

”نہیں..... نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں آپ بیٹھے۔“ منیجر جلدی سے بولا۔

رضیہ..... رضیہ..... حمید ایک بار پھر الجھن میں پڑ گیا۔ یہ سو فیصدی رضیہ کی آواز

صرف لہجہ بدلا ہوا تھا وہ پھر کتاب کی طرف متوجہ ہو گئی۔

منیجر نے ان دونوں سے پوچھا۔ ”آپ کی دانست میں اسکا معاوضہ کم سے کم کتنا ہونا چاہیے؟“

”ہمارے بیس روپے خرچ ہوئے ہیں یہاں تک لانے میں۔“

منیجر نے میز کی دراز سے دس دس کے تین نوٹ نکالے اور ان کی طرف بڑھتا ہوا

”تمیں لے جائیے شکریہ۔“

ایک نے ہاتھ بڑھا کر روپے لئے اور انہیں جیب میں رکھتا ہوا بولا۔ ”میرا پیہ لکھ لیجئے۔“

رپولیس وغیرہ کا کوئی چکر ہو تو ہمیں بلوا لیجئے گا۔“

”وہ سب ٹھیک ہے۔“ منیجر نے دروازے کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”وہ دونوں چلے گئے اور حمید نے محسوس کیا کہ منیجر اسے اکتائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔“

”اب آپ فرمائیے جناب۔“ بلاآ خراس نے اُس سے پوچھا۔

”میں آپ سے کچھ سننا چاہتا ہوں۔“ حمید کا جواب تھا۔

”کیا سننا چاہتے ہیں۔“

”یہ سب کیا تھا۔“

”میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ کو کیا پریشانی ہے۔ آپ یہاں کب سے مقیم ہیں۔“

”تین دن سے۔“

”ان لوگوں کو کب سے جانتے ہیں۔“

”آپ کو اس سے کیا سروکار۔“ حمید جھنجھلا گیا۔

”بس ثابت ہوا کہ آپ ان لوگوں کو صرف تین دن سے جانتے ہیں۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

”میں تین سال سے جانتا ہوں۔“ منیجر میز پر ہاتھ مار کر دھاڑا۔

”اے تو اس میں خفا ہونے کی کیا بات ہے۔“

”کیا تم لوگ جھگڑا کر رہے ہو۔“ رضیہ نے چونک کر انگریزی میں پوچھا۔ اس کے

اُسے پراسیمگی کے آثار تھے۔

”جی نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔“ منیجر نے دانت نکال دیئے۔

”آپ مجھ سے گفتگو کیجئے۔“ حمید نے اُسے پھر اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

”آپ سے کیا گفتگو کروں۔ جائیے آرام کیجئے۔“

”ابھی میرے آرام کا وقت بہت دور ہے۔“ حمید نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

”میں کہتا ہوں آخر آپ.....!“

کہا۔ وہ یہاں کے شکار اور شکاریوں سے بخوبی واقف تھا۔ سردیوں بھر یہاں بڑے بالوں والی لومڑیوں کا شکار ہوتا ہے۔ ملک کی تجارتی فرموں کے ملازم پیشہ ور شکاری اس میں حصہ لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں مخالفتیں بھی ہوتی ہیں۔ پھر رائفلوں کا رخ لومڑیوں کی طرف سے آدمیوں کی طرف پھر جاتا ہے۔ شکاریوں کی تعداد کم ہوتی رہتی ہے لیکن لاشیں تو اسی وقت ملتی ہیں جب برف پگھلتی ہے۔

حمید اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا پھر بولا۔ ”اب یہیں بیٹھ کر کسی شکاری کا انتظار کروں گا۔ ویسے جب میں شکار کھیلتا ہوں تو یہ نہیں دیکھتا کہ شکار ہونے والا نیجر ہے یا بادرچی۔“

”آپ میری توہین کر رہے ہیں۔“ نیجر غرایا۔

لیکن حمید کچھ کہے بغیر رضیہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ بدستور کتاب میں مستغرق تھی۔ چہرے سے ہرگز متغیر نہیں ہوتا تھا کہ وہ ان کی گفتگو سنتی اور سمجھتی رہی ہے۔ لہذا ایک بار پھر حمید کو سوچنا پڑا کہ کہیں وہ اس کے بارے میں غلط فہمی میں تو مبتلا نہیں۔

”آپ کی تعریف.....!“ دفعتاً حمید نے نکلیوں سے رضیہ کی طرف اشارہ کر کے نیجر سے پوچھا اور نیجر متحیرانہ انداز میں منہ کھول کر رہ گیا۔ پھر حمید کسی قدر مسکرایا اور بائیں آنکھ بھی دبائی بس پھر کیا تھا۔ نیجر کی حیرت جھلاہٹ میں تبدیل ہو گئی۔

”صاحب آپ کس قماش کے آدمی ہیں۔“ اس نے کھر کھراتی ہوئی آواز میں کہا۔

”کیا موضوع کی تبدیلی پسند نہیں آئی آپ کو۔“ حمید نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”خدا کے لئے تشریف لے جائیے ورنہ.....!“

”ورنہ کیا.....؟“

”ورنہ یہ کہ ہم اپنے بزنس کے حقوق محفوظ رکھتے ہیں۔ کسی لمحہ بھی آپ کو ہوٹل چھوڑ

”سینے کا نوٹس مل سکتا ہے۔“

”کون نوٹس لیتا ہے ایسی باتوں کا۔“ حمید نے لاپرواہی سے کہا۔

وہ نکلا ہوٹل دانتوں میں دبائے حمید کو گھورتا رہا۔

”بس.....!“ حمید نے ہاتھ اٹھا کر اُسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”یہاں پر نہیں ڈرامہ ہو رہا ہے۔ کیا یہ آپ کا فرض نہیں ہے کہ آپ اس حادثہ کی اطلاع پولیس کو دیں۔“

”آپ سے مطلب.....!“ نیجر نے پھر آنکھیں نکالیں۔

”اچھا تو اب میں خود ہی.....!“

”جی..... جی..... تو پھر آپ خود ہی..... کیا.....؟“

حمید نے محسوس کیا کہ وہ ایک نروس قسم کا آدمی ہے۔ اس کی دونوں ہاتھ کانپ رہے اور مضطربانہ انداز میں میز پر رکھی ہوئی چیزوں کی جگہیں تبدیل کر رہا تھا۔

”میں خود ہی اس واقعہ کی اطلاع پولیس کو دے دوں گا۔“ حمید نے پرسکون لہجے

”پھر آپ جانئے۔ جب تک وہ زخمی آدمی خود ہی اپنی کیفیت بتانے کے قابل نہ ہو گا۔“

”آپ کو کون کن مراحل سے گزرنا پڑے گا۔“

”آپ ایسا نہیں کر سکتے۔“

”مجھے کون روکے گا۔“

”میں کہتا ہوں آپ کو اس سے کیا۔ سب سے زیادہ فکر اس کی لڑکی کو ہونی چاہئے۔“

”لڑکیاں فکر کرنے کے لئے نہیں پیدا ہوئیں۔ انہیں بے غم دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”تو پھر اسی سے جا کر پوچھئے۔ میں کچھ نہیں جانتا۔“

”اچھی بات ہے۔ میں اُسی سے پوچھوں گا۔“

”ہرگز نہیں۔ آپ میرے کسی بھی گاہک کے آرام میں خلل نہیں ڈال سکتے۔“

”کون روکے گا مجھے۔“

”دیکھیے..... دیکھیے حضرت میں نہیں جانتا آپ کون ہیں۔ لیکن یہ نہ بھولے کہ:

بہت ہی خطرناک قسم کے شکاری بھی مقیم ہیں جن سے میں دوستانہ تعلقات رکھتا ہوں۔“

”بہت خوب..... میں ان کی زیارت سے بھی محروم نہ رہوں گا۔“ حمید نے طنز

”بہت خوب..... میں ان کی زیارت سے بھی محروم نہ رہوں گا۔“ حمید نے طنز

”بہت خوب..... میں ان کی زیارت سے بھی محروم نہ رہوں گا۔“ حمید نے طنز

”بہت خوب..... میں ان کی زیارت سے بھی محروم نہ رہوں گا۔“ حمید نے طنز

”بہت خوب..... میں ان کی زیارت سے بھی محروم نہ رہوں گا۔“ حمید نے طنز

”تعارف ہو جائے تو کیسی رہے۔“ حمید آہستہ سے بولا۔

نمبر 32

قائل کا ہاتھ

129

”یہ عیاشی کا اڈا نہیں ہے۔ تشریف لے جائیے۔“ اس بار اس نے بہت زیادہ مظاہرہ کیا۔

”اے جناب۔ خود کو قابو میں رکھئے کیا میں کوئی عیاش آدمی ہوں۔“

”دی مین از اے سوشل انیمل..... دوسروں سے جان پہچان پیدا کئے بغیر زندہ نہیں رہو“

”شکر یہ جناب..... اچھا ہاں۔ تعریف سنی ہے اس برائے کی..... بہت بہت شکریہ۔“

”وہ پاؤچ سے تمباکو نکال کر اپنی ناک کے قریب لے گیا اور پھر اُسے پاپ میں بھرتا ہوا

”میں کہتا ہوں تشریف لے جائیے۔“ وہ مٹھیاں بھیج کر بولا۔

”عمدہ چیز ہے۔ یہاں تو ملتی ہی نہیں۔“

”کیوں صاحب! اگر یہ اپنا دیسی تمباکو پاپ میں جلایا جائے تو کیسی رہے۔ لیکن وہ تو

”کیا مطلب.....؟“ وہ میز پر ہاتھ مار کر دھاڑا۔

”ایک ہی کش میں بھک سے اڑ جائے گا۔ پتہ نہیں پاپ کے تمباکو میں نمی کیسے پیدا کرتے ہیں۔“

”پلیز.....!“ رضیہ کی ہم شکل اچھل پڑی۔ ”میں اختلاج قلب کی مریضہ ہوں۔“

حمید کچھ نہ بولا اور کاؤنٹر کلرک خاموش ہو کر پاپ سلگانے لگا۔ کچھ دیر بعد حمید نے

”میں خمیرہ مروارید لاؤں۔“ حمید نے چپک کر پوچھا۔ لیکن وہ برا سامنہ بنائے۔

پوچھا۔ ”یہ آئیل اسٹو کیسے پھٹ گیا تھا۔“

پھر کتاب کی طرف متوجہ ہو گئی۔ سچ مچ بے حد مغرور معلوم ہوتی تھی۔

”پتہ نہیں جناب۔“

”اوہ..... خوب یاد آ گیا۔ وہ کون صاحب تھے۔ زخمی تھے پتہ نہیں اب کیا حال ہو۔“

”اب آپ چلے ہی جائیے۔ ورنہ اچھا نہ ہوگا۔“ منیجر اٹھتا ہوا بولا۔ اس کے ہاتھ اب

زیادہ کاپنے لگے تھے۔

”میرا خیال ہے کہ شاید آپ بھی ان کے ساتھ اوپری منزل پر گئے تھے۔“

حمید نے سوچا بات نہ بڑھانی چاہئے۔ پتہ نہیں فادر ہارڈ اسٹون نے اسے یہاں

”ہاں آں..... گیا تھا۔ اس سے قبل اس لڑکی ہی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ لیکن میں ان

مقصد کے تحت بھیجا ہو۔

لوگوں کو جانتا نہیں۔ اُنکے ناموں سے بھی واقف نہیں۔ لڑکی سے کچھ دیر پہلے ہی ملاقات ہوئی تھی۔“

جب وہ دروازے سے گزر رہا تھا منیجر نے پھر اُسے بلند آواز میں مخاطب کیا۔

”بڑی شریف لڑکی ہے۔“ کاؤنٹر کلرک بولا۔

وارننگ ہے کہ اس وقت انہیں ڈسٹرب نہ کیا جائے۔“

”پتہ نہیں بھلا اتنی جلدی کیسے رائے قائم کی جاسکتی ہے۔“ حمید نے بے تکلفی سے کہا۔

اس نے لا پرواہی سے شانوں کو جنبش دی اور دروازے سے گزر گیا۔

”میں تو جانتا ہوں۔ یہ لوگ ہر سال سردیوں میں آتے ہیں۔“

بہر حال بات الجھن پیدا کرنے والی تھی۔ نہ تو اس نے خود ہی زخمی کے لئے

”شکریہ ہیں۔“

فراہم کی تھی اور نہ یہی چاہتا تھا کہ کوئی دوسرا اس معاملے میں دخل اندازی کرے۔

”نہیں جناب۔ اسی پر تو مجھے حیرت ہے۔ وہ زخمی جسے آپ نے دیکھا تھا یعنی لڑکی کا

حمید پھر ڈائینگ ہال میں واپس آ گیا۔ اب کافی اندھیرا پھیل گیا تھا۔ ہال کی

”نہیں جناب۔ اسی پر تو مجھے حیرت ہے۔ وہ زخمی جسے آپ نے دیکھا تھا یعنی لڑکی کا

”میں تو جانتا ہوں۔ یہ لوگ ہر سال سردیوں میں آتے ہیں۔“

میزیں آباد ہو چکی تھیں۔

لوگوں کے شکار سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔“

”لیکن سردیاں گزرتا ہے یہاں۔“

”جی ہاں..... ابھی تک تو یہی دیکھنے میں آیا ہے۔“

”لڑکی بھی ساتھ ہوتی ہے؟“

”جی ہاں..... وہ بھی ہوتی ہے۔ لیکن آج تک میں نے اُسے رنگ رلیوں میں نہیں دیکھا۔“

”اس کا بھی کوئی ایسا ہی نام ہوگا۔ تبسم چنگیزی۔ مجسم چنگیزی وغیرہ۔“

”پتہ نہیں۔ ویسے بوڑھا اُسے مونہ کر پکارتا ہے۔“

”ممکن۔ اصل نام معینہ ہو۔“

”معینہ تو خوبصورت نام نہیں کہلایا جاسکتا۔“ کلرک نے بچھے ہوئے پائپ کو ہوائے کہا۔

”کچھ دیر خاموشی رہی پھر حمید نے کہا۔ ”بڑی حیرت کی بات ہے کہ ابھی تک زخمی میڈیکل ایڈ نہیں آئی۔“

”لیکن اس کے باوجود وہ صبح کو بالکل تروتازہ نظر آئے گا۔“

”کیا پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہے۔“

”پچھلے سال کم از کم پندرہ بار ایسی ہی غیر معمولی حالتوں میں باہر سے واپس آیا تھا۔“

”اچھات تو اس نے خود ہی منیجر کو اس سے متعلق کچھ مخصوص ہدایات دے رکھی ہوں؟“

”کیسی مخصوص ہدایات۔“

”یہی کہ اگر وہ خراب حالت میں واپس آئے تو اُسے تنہا چھوڑ دیا جائے۔ میڈیکل پلانے اور مقامی شکاری سے ملوادوں گا۔“

”حمید نے اپنے سر کو جنبش دے کر اظہار تشکر کیا اور نہایت پر فکر لہجے میں بولا۔ ”میں اس“

”نہیں میں ایک شکاری کا دوست ہوں۔ شکاری صاحب ابھی یہاں نہیں پہنچے۔“

”لیکن اب تو سیزن ختم ہو رہا ہے۔“

”دراصل اگلے سال یہاں شکار کھیلے گا۔ فی الحال امکانات کا جائزہ لے گا۔“

”شکاری ہی شکار ہے جناب یہاں۔ امکانات کا کیا سوال۔ میں آپ کے دوست کو ایک“

”یہی کہ اگر وہ خراب حالت میں واپس آئے تو اُسے تنہا چھوڑ دیا جائے۔ میڈیکل پلانے اور مقامی شکاری سے ملوادوں گا۔“

”حمید نے اپنے سر کو جنبش دے کر اظہار تشکر کیا اور نہایت پر فکر لہجے میں بولا۔ ”میں اس“

”نہیں میں ایک شکاری کا دوست ہوں۔ شکاری صاحب ابھی یہاں نہیں پہنچے۔“

”لیکن اب تو سیزن ختم ہو رہا ہے۔“

”دراصل اگلے سال یہاں شکار کھیلے گا۔ فی الحال امکانات کا جائزہ لے گا۔“

”شکاری ہی شکار ہے جناب یہاں۔ امکانات کا کیا سوال۔ میں آپ کے دوست کو ایک“

”یہی کہ اگر وہ خراب حالت میں واپس آئے تو اُسے تنہا چھوڑ دیا جائے۔ میڈیکل پلانے اور مقامی شکاری سے ملوادوں گا۔“

”حمید نے اپنے سر کو جنبش دے کر اظہار تشکر کیا اور نہایت پر فکر لہجے میں بولا۔ ”میں اس“

”نہیں میں ایک شکاری کا دوست ہوں۔ شکاری صاحب ابھی یہاں نہیں پہنچے۔“

”لیکن اب تو سیزن ختم ہو رہا ہے۔“

”دراصل یہ ہے جناب! آپ کے ساتھ منیجر صاحب بھی تھے اور مجھ سے یا آپ سے زیادہ اس سلسلے میں انہیں تشویش ہونی چاہئے۔“

”یہ بڑی اچھی بات ہے۔ آپ ایک با اصول آدمی ہیں۔“

”اسی بات کا تو غم ہے کہ انہیں بھی تشویش نہیں۔“

”بس تو پھر آپ بھی بے فکر ہو جائیے۔“

”دونوں کی طرف دیکھا۔“

”پروفیسر اب کیسے ہیں..... کچھ بولے۔“ حمید نے پوچھا۔

حمید نے طویل سانس لی اور غمناک انداز میں اس کی آنکھوں میں دیکھ کر سر جھکا۔

”صاحب آپ واقعی بہت رحم دل آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں تو کوئی شکار سب کرایے۔ خراب ہو گیا ہے۔ مجھے خواہ مخواہ دوز کر نیچے آنا پڑا۔“

میں ایسی باتوں پر دھیان نہیں دیتا۔ خون بہتا ہی رہتا ہے۔ لاشیں گرتی ہی رہتی ہیں۔“

”میرے دوست نے ان اطراف میں کبھی شکار نہیں کیا۔“

”تب پھر وہ کھیل بھی نہ سکیں گے۔ یہاں سے لے کر ٹیکم گڈھ تک یہی کچھ ہے۔“

اس سیزن میں نہ کوئی چیخوں پر چونکتا ہے اور نہ خون بہتے دیکھ کر کسی کے کان پر جوں پر رینگتی۔

”بھئی کس مصیبت میں آ پھنسا۔“ حمید نے اکتاہٹ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

”میرے لئے یہیں کافی منگوا دیجئے۔ کھانا اپنے کمرے میں کھاؤں گا۔ آہا..... اور وہ۔“

”کوئی لڑکی جناب۔ اچھا سمجھ گیا۔ آپ کا اشارہ شاید اُن ایرانی خاتون کی طرف ہے۔“

”ایرانی.....؟ لاجول والا تو..... میں ترک سمجھا تھا۔“

”جی نہیں..... ایران سے آئی ہیں۔ مصنفہ ہیں۔ بھلا سا نام ہے۔“

”ظہریئے..... رجسٹر میں دیکھ کر بتاتا ہوں۔“

حمید کچھ نہ بولا۔ کلرک رجسٹر کی ورق گردانی کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ”ہا۔“

انتابہی حسین ہے یا سکین قزلباش۔“

”حسین ہے۔“ حمید نے متحیرانہ لہجے میں پوچھا۔

”کیا نہیں ہے؟“ کلرک آہستہ آہستہ بے تکلف ہوتا جا رہا تھا۔

”ہٹاؤ یار..... مجھے تو یاسمین کے نام پر ہمیشہ لفٹھلین کی گولیاں یاد آ جاتی ہیں۔“

”بڑی عجیب بات ہے۔“ کلرک نے بڑے غلوں سے تشویش ظاہر کی۔

دفعہ پروفیسر کی لڑکی موٹی دکھائی دی جو تیزی سے اُسی طرف آرہی تھی۔ نہ صرف

بلکہ کاؤنٹر کلرک نے بھی خاموش اختیار کر لی۔ وہ ان کے قریب پہنچ کر رکی اور بارکی

پردہ ہٹا۔ لیکن ساتھ ہی حمید کو بھی اچھل کر کھڑا ہو جانا پڑا..... وہ موٹی نہیں تھی۔ ایک قد

اور مرد تھا خوشخوار آنکھوں والا۔ پردہ ہٹا کر بڑے اطمینان سے کمرے میں داخل ہوا۔

”کیا مطلب.....؟“ حمید اسے نیچے سے اوپر تک گھورتا ہوا بولا۔

”تمہاری اجازت سے آیا ہوں..... اس لئے کسی جھگڑے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ کیا

تم کسی کے منتظر تھے۔“

”لیکن اس کرم فرمائی کا مطلب۔ ظاہر ہے کہ ہم ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں۔“

”بس اتنا کہنے آیا تھا کہ لڑکی سے دور ہی رہنا۔“

”کس لڑکی کی بات کر رہے ہو۔“

”مونا چنگیزی..... پروفیسر ندیم چنگیزی کی لڑکی۔“

”میں اس نام کی کسی لڑکی کو نہیں جانتا۔“

”حالانکہ ابھی کچھ ہی دیر پہلے تم کاؤنٹر کے
شائد تم نے یہ شام بھی اسی کے ساتھ گزاری تھی۔“

”اچھا وہ..... تمہارا بہت شکریہ۔“ حمید خوش ہو کر بولا۔ ”بڑا پیارا نام ہے۔ اس۔
اپنا نام نہیں بتاتا تھا۔“

آنے والے نے اُسے قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ”سنجیدگی اختیار کرو۔ تمہاری لاش تک کا پتہ نہ چلے گا۔“

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ اس طرح تو کفن کے پٹے بھی بچیں گے اور میں اُن کی پرائز بانڈ خرید لوں گا۔“ حمید نے زہر لیلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ویسے وہ محسوس کر رہا تھا کہ آنے والے دن دل ہی دل میں فوری طور پر کوئی فیصلہ کیا ہے۔

پھر وہ اس کی چھلانگ کی زد پر کیسے آجاتا۔ بڑی پھرتی سے ایک طرف ہٹا تھا اور حملہ منہ کے بل فرش پر جا گرتا تھا اور دوبارہ اٹھنے ہی والا تھا کہ خود حمید نے اس پر چھلانگ لگائی۔ اور آدور کی پیشانی فرش سے ٹکرائی۔ اس ٹکراؤ سے پیدا ہونے والی آواز نے کمرے کی محدود فضا میں اچھی خاصی گونج پیدا کی تھی۔

”میجر سعید۔ مجھے لوگ میجر سعید کہتے ہیں۔“ حمید اُسے فرش پر رگڑتا ہوا بولا۔ اس کی گرہ میں قینچی ڈال دی تھی اور مسلسل دباؤ ڈال رہا تھا۔ حملہ آور کی پیشانی فرش ہی سے لگی رہی۔

2

”یقیناً!“ حید نے اس بار زیادہ قوت صرف کی تھی۔ مغلوب کی قوت مدافعت نہ ہو گئی۔ ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے۔

”یہ..... لگ..... کیا ہو رہا ہے؟“ مونا کی آواز اس بار قریب سے آئی تھی۔
حمید اپنے شکار کو چھوڑ کر ہٹ گیا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ لیکن حمید کا خیال تھا کہ اُس
مصلح ہاتھ پیر ڈال دیئے ہیں۔

مواہرت اور خوف کے زیرِ اثر کھڑی کانپتی رہی۔
 ”تم... تم...!“ اس کی زبان سے اس کے علاوہ اور کچھ نہ نکل سکا۔

”فكر نہ کرو۔“ حمید نے جھك كر بے ہوش آدمی كو چت كرتے ہوئے کہا۔
اُس نے ديكا كه اُس كے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ لڑكھڑاتی ہوئی كئی قدم پیچھے ہٹ
ئی۔ خنزردہ آنکھوں میں اعتراف شناسائی كی جھلکیاں بھی موجود تھیں۔

”یہ کون ہے؟“ حمید نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

”مم..... مل..... لیکن..... یہ یہاں کیوں آتا تھا.....؟“

”دھکی دینے کہ اگر اب میں نے تم سے ملنے کی کوشش کی تو میرا سر توڑ دے گا۔“

”لہذا مجھے اس کے جغرافیے سے واقف ہونا چاہئے۔“
 ”خدا کے لئے تم چپ چاپ یہاں سے بھاگ جاؤ۔“
 ”کیوں...؟“

”بس یونہی..... میری بات مانو۔ تم نے اچھا نہیں کیا۔ یہاں کئی آدمی ایسے ہیں جو اس لئے جہنم کا دہانہ کھول دس گئے۔“

”خوب.....!“ حمید اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا مسکرایا۔
”میں کہتی ہوں ہوٹل میں آؤ۔ فوراً حلہ جاؤ۔“

”مناسب یہ ہے کہ اس کے ہوش میں آنے سے قبل تم ہی یہاں سے چلی جاؤ اور میری

مرنے والا

پھر فرش سے ٹکرانے کا عمل جاری ہی تھا کہ حمید نے مونا کی آواز سنی۔
 ”کیا میں اندر آ سکتی ہوں۔“

فکر نہ کرو۔“

”میں تمہیں اس کرسی پر بیٹھنے کی اجازت دی سکتا ہوں۔“ اس نے چند لمحوں کے بعد

کہا۔ اجنبی چپ چاپ اٹھا اور میز کے قریب والی کرسی پر جا بیٹھا۔

حمید نے کہنا شروع کیا۔ ”میں قطعی نہیں جانتا کہ وہ لڑکی کون ہے یہ بھی نہیں جانتا کہ تم اس کا کیا تعلق ہے۔ سرشام میں نے ایک زخمی آدمی کو دیکھا تھا جسے دو آدمی سہارا دے کر یہاں لائے تھے۔ لڑکی اس وقت میری ہی میز پر تھی۔ اس سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ اس کا باپ تھا۔“

حمید خاموش ہو گیا۔ اجنبی بھی خاموشی سے اسے گھورتا رہا۔ کبھی کبھی اس کی آنکھیں حمید کے چہرے سے ہٹ کر ریوالور کی نال پر جا ٹھہرتیں۔

”میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔“ حمید تھوڑی دیر بعد پھر بولا۔ ”یہاں کے لوگ یہ کیوں نہیں چاہتے کہ بوڑھے کو میڈیکل ایڈ ملے۔“

”میرے لئے یہ ایک بالکل ہی نئی اطلاع ہے۔“ اجنبی نے آہستہ سے کہا۔

”کیا تمہیں منیجر نے میرے خلاف نہیں اکسایا۔“

”ہرگز نہیں۔ میں اسے اس سے زیادہ نہیں جانتا کہ وہ اس ہوٹل کا منیجر ہے۔“

”پھر تم مجھ پر کیوں چڑھ دوڑے۔“

”میں اسے برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی مرد مونا سے قریب ہونے کی کوشش کرے۔“

”اور اس کے لئے تم اس حد تک بھی جاسکتے ہو۔“

”یقیناً.....!“

”لیکن اگر اس کا باپ مر رہا ہو تو اس کیلئے طبی امداد تک فراہم کرنے کے روادار نہیں۔“

”مجھے اس کا کچھ علم نہیں۔ میں نے صرف اتنا سنا تھا کہ وہ واپس آ گیا ہے۔“

”کہاں سے واپس آ گیا ہے؟“

”پتہ نہیں۔ تین دن پہلے کہیں باہر گیا تھا۔“

”کیا وہ تمہیں جانتا ہے۔“

”میرے خدا..... میں کیا کروں۔“ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی کپٹیاں تھپتھپاتا ہوا ”کیا تم ہماری ہلاکت کا باعث بننا چاہتے ہو۔“

”مونا..... پلیز..... گٹ آؤ۔“ حمید نے دروازے کی جانب ہاتھ ہلا کر کہا۔

”دیکھو..... خدا کے لئے۔“

”جاؤ۔“ وہ غصیلے لہجے میں کہہ کر اس کی طرف چھٹا۔ مونا بوکھلا کر دروازے کی طرف مڑ گئی۔

پھر اس کے باہر نکل جانے پر حمید نے دروازہ بند کیا اور چنچنی چڑھا دی۔ ویسے یہ احساس اب بھی ذہن کے کسی گوشے میں موجود تھا کہ وہ راہداری میں دروازے کے سامنے ہی رک گئی ہے۔

اس نے لاپرواہی سے شانوں کو جنبش دی اور بیہوش آدمی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جامہ تلاشی کے نتیجے میں ایک بھرا ہوا ریوالور اور ایک پرس اس کے پاس سے برآمد تھا۔ پرس میں معمولی رقم اور کچھ کاغذات تھے۔

حمید اس کے دوبارہ ہوش میں آنے کا منتظر تھا۔

ریوالور گود میں رکھے بیٹھا سوچ رہا تھا کوئی خطرناک کھیل معلوم ہوتا ہے۔ آخر یہ کیوں نہیں چاہتے کہ بوڑھے کو طبی امداد مل سکے۔ پہلے منیجر نے دھمکیاں دی تھیں پھر کلرک اسی مسئلے پر بڑی لاپرواہی سے گفتگو کرتا رہا تھا اور اب یہ۔

بیہوش آدمی نے کراہ کر روٹ بدلی تھی۔ حمید نے ریوالور سنبھال لیا۔ جس کا رخ اس طرف تھا۔

اجنبی کی آنکھیں آہستہ آہستہ کھل رہی تھیں۔

ایک بیک وہ اچھل کر اٹھ بیٹھا۔

حمید ریوالور کی نال کلائی پر رکھے اسے سوارے جا رہا تھا۔

”نہیں..... وہ مجھے نہیں جانتا۔“

”تو تم اُسے مر جانے دو گے۔“

”میں کچھ بھی نہیں جانتا اس بارے میں۔ اگر میں اس کے لئے کچھ کرنا بھی چاہوں:

مونا اس پر تیار نہیں ہوگی۔ وہ مجھ سے بے انداز نفرت کرتی ہے۔“

”یہ کیوں.....؟“

”یہی دستور ہے دنیا کا۔“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”جنہیں اپنا چاہو وہ

بھاگتے ہیں جن کی پرواہ نہ کرو وہ سائے کی طرح ساتھ لگے رہتے ہیں۔“

”ہوں..... اُس.....!“ حید نے سر کو جنبش دی اور اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔

”میں اُس وقت سے اس کے پیچھے ہوں جب وہ صرف دس سال کی تھی۔“

”اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“ حید نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”میں نہیں جانتا کہ وہ مجھے پسند کرتی ہے یا نہیں۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ حید بولا۔ ”ایسی کیفیت میں زندگی گزارنے والے شہید

کہلاتے ہیں۔ اگر اسی کیفیت میں شادی بھی ہو جائے تو جو رو کے غلام کہلانے لگتے ہیں۔“

”تم آخر ہو کون.....؟“ انجی نے حید کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

”سعید..... میجر سعید کہلاتا ہوں۔ نہ ابھی تک شہادت کے درجے پر فائز ہو سکا ہوں۔“

نہ ڈومیسٹک کیشن ہی لیا ہے..... لہذا.....!

ویسے تم کوئی شریف ہی آدمی معلوم ہوتے ہو۔“ حید نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔

ہوئے کہا۔

”بعض مجبوریوں اکثر بُرا بھی بنا دیتی ہیں۔“

”میں نہیں سمجھا۔“

”نصیر آباد کے معزز ترین آدمیوں میں میرا شمار ہے۔ عام طور پر لوگ میرے بارے

میں بہت اچھی رائے رکھتے ہیں لیکن اس فعل پر میرا ضمیر مجھے کبھی معاف نہیں کر سکتا۔“

”کس فعل پر.....!“

”یہی مونا والا معاملہ.....!“

”پروفیسر سے شادی کی درخواست کرو۔“

”لیکن وہ مجھے پسند نہیں کرتی۔ متنفر ہے مجھ سے۔ اوہ میرے خدا..... تم نے مجھ کو بتایا تھا

کہ پروفیسر کو طبی امداد کی ضرورت ہے..... اور کچھ لوگ اس میں حارج ہو رہے ہیں۔“

”یہاں کا منیجر.....!“

”مجھے کچھ کرنا چاہئے۔ لاؤ میرا ریوالور واپس کر دو۔ وہ غیر قانونی طور پر نہیں رکھا گیا

ہے۔ میرے پاس..... اوہ..... میرا پس بھی۔“

وہ اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ حید نے پرس اس کی طرف اچھالتے ہوئے کہا۔

”گن لو اپنی رقم.....!“

لیکن اُس نے اُسے ہاتھوں پر روک کر جائزہ لئے بغیر جیب میں ڈال لیا۔

حید سوچ رہا تھا کہ وہ بہت مطمئن نظر آ رہا ہے۔ ہر چند کہ ریوالور کا رخ اب بھی اُسی کی

طرف تھا۔

”اچھی بات ہے۔“ حید نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”ریوالور ہال میں پہنچ کر تمہارے حوالے

”میں بہت بُرا ہوں۔ لیکن کینہ تو نہیں.....!“ انجی اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھتا ہوا

ویسے تم کوئی شریف ہی آدمی معلوم ہوتے ہو۔“ حید نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔

ہوئے کہا۔

”بعض مجبوریوں اکثر بُرا بھی بنا دیتی ہیں۔“

”میں نہیں سمجھا۔“

”نصیر آباد کے معزز ترین آدمیوں میں میرا شمار ہے۔ عام طور پر لوگ میرے بارے

میں بہت اچھی رائے رکھتے ہیں لیکن اس فعل پر میرا ضمیر مجھے کبھی معاف نہیں کر سکتا۔“

”نہیں! اُس سے پہلے میں کسی ڈاکٹر کو لاؤں گا۔ منیجر سے بعد میں پتوں گا۔“

”اُس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ کئی خطرناک قسم کے شکاری میری راہ میں حائل ہوں

گے۔ اگر میں نے پروفیسر کو ڈسٹرب کرنے کی کوشش کی۔“

”خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔“ اجنبی غرایا۔ ”آؤ..... میرے ساتھ۔“

پھر وہ تیزی سے منیجر کے کمرے کی طرف بڑھا تھا۔

ہونے لگا۔

”میں جو کچھ بھی کہتا ہوں کر گزرتا ہوں۔“

”اچھی بات ہے۔ ضرور پولیس کی مدد حاصل کیجئے۔ میں کہہ رہا ہوں جا کر پروفیسر کی

لڑکی سے بات کیجئے۔ اس کی موجودگی میں مجھے کیا حق حاصل ہے کہ میں کچھ کر سکوں۔“

”اچھی بات ہے۔ منیجر سعید۔“ اجنبی نے حمید سے کہا۔ ”آپ یہیں ٹھہریئے۔ میں ڈاکٹر

کو لے کر آتا ہوں۔“

”یہاں..... یعنی منیجر کے آفس میں۔“

”جی ہاں..... میں اس معاملے کو سمجھنا چاہتا ہوں۔“

وہ باہر چلا گیا۔ حمید اور منیجر خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

”میں بری الذمہ ہوں پیارے۔“ حمید کچھ دیر بعد مسکرا کر بولا ”اس آدمی کا تو میں نام

نک نہیں جانتا۔“

”میں سب سمجھتا ہوں۔“

”کیا سمجھتے ہیں۔“

”آپ سب مل کر میری زندگی کے خواہاں ہو گئے ہیں۔“

”تو آپ ایسا کیوں سمجھتے ہیں۔“

”پتہ نہیں۔ یہ بوڑھا مرد وہیں کیوں آمرت ہے۔ میں کثیر العیال اور دل کا مریض

ہوں۔ خدا رحم کرے میرے حال پر۔“

”جب یہ بات ہے تو اس قسم کی ذمہ داریاں کیوں لیتے ہیں اپنے سر۔“ حمید نے بڑے ہمدردانہ

انداز میں کہا۔ بس اندھیرے میں ایک تیر پھینکا تھا اس توقع پر کہ نتیجہ کار آمد ہی ثابت ہوگا۔

منیجر چند لمحے ہانپتا رہا پھر خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔ ”تین سال پہلے کی بات ہے

گے۔ اگر میں نے پروفیسر کو ڈسٹرب کرنے کی کوشش کی۔“

”خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔“ اجنبی غرایا۔ ”آؤ..... میرے ساتھ۔“

پھر وہ تیزی سے منیجر کے کمرے کی طرف بڑھا تھا۔

ہونے لگا۔

”میں جو کچھ بھی کہتا ہوں کر گزرتا ہوں۔“

”اچھی بات ہے۔ ضرور پولیس کی مدد حاصل کیجئے۔ میں کہہ رہا ہوں جا کر پروفیسر کی

لڑکی سے بات کیجئے۔ اس کی موجودگی میں مجھے کیا حق حاصل ہے کہ میں کچھ کر سکوں۔“

”اچھی بات ہے۔ منیجر سعید۔“ اجنبی نے حمید سے کہا۔ ”آپ یہیں ٹھہریئے۔ میں ڈاکٹر

کو لے کر آتا ہوں۔“

”یہاں..... یعنی منیجر کے آفس میں۔“

”جی ہاں..... میں اس معاملے کو سمجھنا چاہتا ہوں۔“

وہ باہر چلا گیا۔ حمید اور منیجر خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

”میں بری الذمہ ہوں پیارے۔“ حمید کچھ دیر بعد مسکرا کر بولا ”اس آدمی کا تو میں نام

نک نہیں جانتا۔“

”میں سب سمجھتا ہوں۔“

”کیا سمجھتے ہیں۔“

”آپ سب مل کر میری زندگی کے خواہاں ہو گئے ہیں۔“

”تو آپ ایسا کیوں سمجھتے ہیں۔“

”پتہ نہیں۔ یہ بوڑھا مرد وہیں کیوں آمرت ہے۔ میں کثیر العیال اور دل کا مریض

ہوں۔ خدا رحم کرے میرے حال پر۔“

”جب یہ بات ہے تو اس قسم کی ذمہ داریاں کیوں لیتے ہیں اپنے سر۔“ حمید نے بڑے ہمدردانہ

انداز میں کہا۔ بس اندھیرے میں ایک تیر پھینکا تھا اس توقع پر کہ نتیجہ کار آمد ہی ثابت ہوگا۔

منیجر چند لمحے ہانپتا رہا پھر خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔ ”تین سال پہلے کی بات ہے

”مث آپ..... میں اپنی بات کا جواب چاہتا ہوں۔“

”میں اس کا پابند نہیں ہوں۔ ہوٹل کا انتظام میری ذات سے تعلق رکھتا ہے۔“

جناب۔ اگر آپ کو ہمدردی ہے پروفیسر سے تو جائے اور کیجئے میڈیکل ایڈ کا انتظام۔ اگر ان

کوئی حادثہ پیش بھی آیا ہے تو وہ ہوٹل کی حدود سے باہر..... میرے فرائض کی حدود سے

پروفیسر کی لڑکی چاہتی تو خود ہی میڈیکل ایڈ حاصل کر سکتی تھی۔ سب مجھ ہی سے پوچھنے

آتے ہیں۔ جہنم میں گیا پروفیسر اور اس کے معاملات۔“

”میں نے سنا ہے کہ تم نے انہیں دھکی دی تھی۔“ اجنبی نے حمید کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”ضرور دی تھی۔ کیونکہ انہوں نے یہاں بیٹھی ہوئی ایک معزز خاتون کے لئے کچھ

الفاظ استعمال کئے تھے۔“

”برجستہ جھوٹ..... خدا کے غضب سے ڈر۔“ یہ آٹھیں نکال کر بولا۔

”اگر وہ خاتون اردو سمجھ سکتی ہوتی تو بتاتا۔“

”تم مجھ سے گفتگو کرو۔“ اجنبی پھر غرایا۔

”جناب۔ آپ کا لہجہ۔“

”کیوں..... اُس سے کیوں خائف ہیں۔“

”بے حد پر اسرار معلوم ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اسی سیاہ پوش سے کسی قسم کا تعلق ضرور رکھتی ہے۔ یقیناً یہی بات ہے۔ میں کیا کروں..... میں کیا کروں۔“

حمید نے محسوس کیا کہ اب اُسے اپنے اعصاب پر قابو نہیں رہا۔ پورا جسم بُری طرح کانپ رہا تھا۔

”آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔“ حمید نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

”ہے تو..... لیکن میں کیا کروں؟“

”آپ کیا سمجھتے ہیں۔ اگر اُسے معلوم ہو گیا تو وہ کیا کرے گا۔“

”مجھے پھر اسی طرح اٹھوالے جائے گا اور اذیتیں دے کر ہلاک کر دے گا۔ یہی نہیں بلکہ میرے خاندان والے بھی اُس کے مظالم سے محفوظ نہ رہ سکیں گے۔“

”یہی دھمکی دی تھی اُس نے۔“

”جی ہاں۔“

”تب میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ آرام کیجئے۔ میں ساری رات آپ کے کمرے کی نگرانی کروں گا۔“

”لیکن میرے خاندان کے دوسرے افراد شہر میں رہتے ہیں اُن کا کیا ہوگا۔“

”ارے تو اُسے معلوم ہی کیسے ہوگا کہ آپ یہ سب کچھ مجھے بتا چکے ہیں۔“

”لیکن وہ صاحب تو پروفیسر کے لئے ڈاکٹر لانے گئے ہیں۔ اُس کا کوئی خبر اُس تک اس کی اطلاع پہنچا دے گا۔“

”خیر اس کے لئے بھی کچھ کر لیا جائے گا۔ ویسے آخر یہ بوڑھا پروفیسر ہے کیا بلا۔“

”خدا اُسے عارت کرے۔ یقین کیجئے آج تک اس سے زیادہ گفتگو کا موقع نہیں ملا۔“

”ضروری باتوں کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔“

”ہمیشہ سردیوں میں آتا ہے۔“

یہ بوڑھا پہلی بار یہاں آیا تھا۔ جس رات آیا تھا اُسی رات کو کچھ لوگ زبردستی مجھے کپاؤنڈ میں اٹھا لے گئے تھے۔ جہاں لے گئے تھے وہاں ایک سیاہ پوش پہلے سے موجود مجھے دیکھتے ہی اُس نے ایک بڑا سا چاقو نکالا اور کہا کہ میں اس بوڑھے پروفیسر کو اچھی ذہن نشین کر لوں۔ جب بھی وہ فزارو میں قیام کرنا چاہے مجھے اس کے لئے کمرہ مہیا کر دے گا۔ خواہ ہوٹل کے اسٹاف ہی کے کسی آدمی کا کمرہ کیوں نہ خالی کرنا پڑے۔ پھر بڑے دھمکیوں کے ساتھ دوسری ہدایت ملی تھی۔“

غیجر خاموش ہو کر ہانپنے لگا۔ حمید اُسے بغور دیکھ رہا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ غیجر جھوٹا بول رہا۔

”دوسری ہدایت کیا تھی۔“ اُس نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

”وہی جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ وہی جو میرے لئے پھانسی کا پھندہ بن گئی ہے۔ میں بوڑھے کو کوئی حادثہ پیش آئے تو حتی الامکان اُسے پولیس سے دور ہی رکھا جائے۔ یا جی میڈیکل ایڈ بھی اُس وقت مہیا کی جائے جب پروفیسر یا اس کی بیٹی خود اس کی خواہش کریں۔ اس سلسلے میں جو بھی اخراجات ہوں ان کا حساب الگ رکھا جائے۔ ادائیگی پالی کا حساب کر کے دی جائے گی اور میں بھگت رہا ہوں۔ بھگت رہا ہوں۔ پتہ نہیں کب تک بھگتنا پڑے گا۔“

”ایک بار اس نے دھمکایا تھا اور آپ تین سال سے وہی سب کچھ کرتے چلے آ رہے ہیں۔“

”جی نہیں۔ بوڑھے کے دوران قیام میں اکثر وہ سامنے آتا رہتا ہے۔ ابھی پچھلے روز

ہی میری خواب گاہ میں داخل ہوا تھا۔ پتہ نہیں کس طرح دروازے کے قفل تک کھول لیتا ہے۔“

”ہوں.....!“ حمید کسی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد بولا۔ ”کیا اُس نے یہ کہہ

کہ اس کے بارے میں کسی کو کچھ بتایا نہ جائے۔“

”یقیناً کہا تھا۔ لیکن میں کیا کروں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اب میں کہیں

ہر جاؤں گا۔ میرے خدا کیسی بھیانک زندگی ہے۔ کیسی بھیانک زندگی ہے اور وہ ایرانی عورت میں اُس سے بہت زیادہ خائف ہوں۔“

”جی ہاں۔“ فیجر نے خوفزدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ذرا آہستہ بولنے۔“

”دروازہ بند کر دوں!۔“ حمید نے پوچھا۔

”نہیں..... بھلا رہنے دیجئے۔“

”میری موجودگی میں خود کو محفوظ سمجھئے۔ میں بھی ایک ماہر نشانہ باز ہوں۔ فوجی ہوں۔“

”میرے مرنے کے بعد آپ نے دس لاشیں گرا بھی دیں تو کیا۔“

”خیر..... کیا آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ بوڑھا سردیوں میں یہاں کیوں آتا ہے۔“

”میں قطعاً کچھ نہیں جانتا۔ خدا کے لئے اب اس تذکرے کو ختم کر کے مجھے سوچنے دے۔“

”اب کیا ہوگا۔“

”سوچئے۔“ حمید نے بے بسی سے کہا۔

فیجر تھوڑی دیر تک سر پکڑے بیٹھا رہا پھر بولا۔ ”آخر میں کیا سوچوں۔ میرے بچے حمید کی طرف دیکھا۔

سے کیا ہوگا۔ وہ یقیناً میرے خاندان والوں کو پریشان کرے گا۔ مجھے مار ڈالے گا۔“

خوفنا آدمی ہے۔ آواز ہے اُس کی یا شیر کی دھاڑ۔ خدا کی پناہ۔ وہ جب بھی یاد آتا ہے
کی آواز کانوں میں ضرور گونجتی ہے۔“

”آپ تو مجھے بھی دہلائے دے رہے ہیں جناب۔“ حمید نے کہا۔

فیجر ابھی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہی اجنبی کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے ایک
اور بھی تھا۔ چھوٹا سا بیک ہاتھ میں لٹکائے ہوئے۔

”میں ڈاکٹر لے آیا ہوں۔“ اُس نے حمید سے کہا۔ ”لیکن میرا جانا مناسب نہیں۔ تم توجہ ہو گیا تھا۔“

جاد۔ لیکن وہاں ٹھہرو گئے نہیں۔“

”اچھی بات ہے۔“ حمید نے کرسی سے اٹھتے ہوئے طویل سانس لی اور ڈاکٹر سے
”میرے ساتھ آئیے جناب۔“

پروفیسر کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ حمید نے دستک دی۔ کسی نے دروازہ کھولا۔

”تم.....! اُس نے سرگوشی کی۔“ کیوں..... لیکن کیوں؟“

”ڈاکٹر صاحب آگئے ہیں۔ اپنے ڈیڈی کو دکھائیے۔“ حمید نے کہا اور ڈاکٹر کیلئے راستہ

چھڑاتا ہوا بولا۔ ”کچھ دیر ضرور ہوگئی لیکن یہی مناسب رہے گا کہ آپ اپنا اطمینان کر لیں۔“

اُس نے لڑکی کے چہرے پر اطمینان کے آثار دیکھے۔

”میری موجودگی ضروری نہیں؟“ حمید نے ڈاکٹر سے کہا۔ ”میں وہیں فیجر کے آفس میں

آپ کا منتظر ہوں گا۔“

پھر لڑکی نے شاید کچھ کہنے ہی کے لئے ہونٹ ہلائے تھے لیکن آواز نہیں نکلی تھی۔

”سب ٹھیک ہے۔“ حمید ہاتھ ہلا کر بولا۔ ”شب بخیر۔“

”وہ پھر فیجر کے کمرے میں واپس آ گیا۔ اجنبی وہیں موجود تھا۔ اُس نے سوالیہ نظروں

”سب ٹھیک ہے۔“ میں ڈاکٹر کو وہاں چھوڑ آیا ہوں۔“ حمید بولا۔

”شکریہ۔“ اجنبی نے کہا اور سامنے والی دیوار پر نظر جمائے ہوئے کچھ سوچتا رہا۔ حمید

نے فیجر کی طرف دیکھا۔ اس کی حالت اچھی نہیں تھی۔ منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور ہونٹوں پر

ہڈیاں ہی نظر آنے لگی تھیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد تھوک نکلنے کی ”ٹریج“ صاف سنائی دیتی۔

”اب آپ لوگ بھی آرام فرمائیں۔“ اُس نے یک بیک بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”آرام.....!“ حمید نے حیرت سے کہا اور اجنبی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بھی فیجر کی طرف

”میں ڈاکٹر کی واپسی کا منتظر ہوں۔“ اُس نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”تو پھر آپ ضرور آرام کیجئے۔“ اجنبی کا لہجہ زہریلا تھا۔ ”غالبا آپ ڈاکٹر کی رپورٹ

نہیں سننا چاہتے۔“

”میں کیوں نہ سننا چاہوں گا۔“ فیجر کی آواز میں جھلاہٹ بھی تھی اور بے بسی بھی۔

اجنبی نے لاپرواہی سے شانوں کو جنبش دی اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔

ہی۔ ڈاکٹر ماتھ پیس میں ایسولینس کے لئے کہہ رہا تھا کہ نیجر کا سرکسی کی پشت گاہ سے

حمید نے فی الحال کچھ بولنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اس لئے خاموش ہی رہا۔ ہلک گیا۔ دونوں ہاتھ ادھر ادھر جھول گئے۔

محسوس کر رہا تھا کہ نیجر کو بچ بچ آرام کی ضرورت ہے۔

”ہم ہال میں بھی ڈاکٹر کا انتظار کر سکتے ہیں۔“ حمید نے اجنبی سے کہا۔

”نہیں..... یہیں کریں گے۔ مجھے یہ بھی تو دیکھنا ہے کہ آخر یہ سب ہوا کیوں؟“

”یہ..... یہ کیا مطلب.....!“ ریسورکر ٹیل پر رکھتے ہوئے ڈاکٹر کا ہاتھ کانپ گیا۔ پھر

”چھٹ کر نیجر کے قریب پہنچا۔“

”میرے خدا.....!“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”یہ تو..... یہ تو ختم ہو گیا۔“

”میرا خیال ہے کہ اس شریف آدمی کو بچ بچ آرام کی ضرورت ہے۔“ حمید نے کہا۔

”کیا.....؟“ اجنبی بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔

”سڈن ہارٹ فیلور.....!“

اجنبی جواب دینے کی بجائے دوسری طرف دیکھنے لگا۔

”پ..... پھر کیا ہوگا.....؟“

اتنے میں قدموں کی چاپ سنائی دی اور ڈاکٹر کمرے میں داخل ہوا۔

”کیوں.....؟“ اجنبی نے کرسی سے اٹھتے ہوئے مضطربانہ انداز میں پوچھا۔

”میں کیا بتا سکتا ہوں۔“ ڈاکٹر نے اپنے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا اور ہاتھ روم کی طرف

”حالت مندوش ہے۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔ ”رانا ہو گیا۔“

لوگوں نے بہت دیر کر دی۔ غیر معمولی طور پر خون ضائع ہوا ہے۔ یہاں تو کچھ بھی نہ ہوگا۔

اجنبی اور حمید خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھے جا رہے تھے۔ پھر حمید ٹیلی فون کی طرف

موجہ ہوا۔ قریبی پولیس اسٹیشن کے نمبر اسے یاد تھے۔ رابطہ قائم ہونے میں دیر نہ لگی۔

”سناتم نے.....!“ اجنبی نیجر کی طرف مڑ کر دھاڑا۔

”بوڑھے کے بارے میں کچھ نہ کہنا۔“ اجنبی جلدی سے بولا۔ ”ورنہ لینے کے دینے

پڑ جائیں گے۔“

اور وہ غریب کرسی سمیت الٹے الٹے پچا۔

”جو کچھ بھی کرنا ہے جلدی کیجئے۔“ ڈاکٹر بولا۔ ”کہئے تو میں یہیں سے ایسولینس

حمید نے سر کو جنبش دی اور نیجر کے فیلور کے بارے میں کہتا رہا۔

اجنبی اُسے بغور دیکھ رہا تھا۔ حمید ریسورکر کے اس کی طرف مڑا۔

”کیوں.....؟“ اُس نے پوچھا۔ ”بوڑھے کے متعلق بھی بتا دینے میں کیا حرج تھا۔“

”یقیناً فون کر دیجئے۔“ اجنبی نے نیجر کو گورتے ہوئے کہا۔ ”اب میں دیکھتا ہوں

”پھر تمہیں یہ بھی بتانا پڑتا کہ بوڑھے کے متعلق اتنی دیر میں کیوں اطلاع دی گئی۔“

”کس طرح جواب دی کرتے ہو۔“

”تو تم بوڑھے کو ہسپتال پہنچاؤ گے۔“

”اُس کے علاوہ اور کیا چارہ ہے۔“

”تو تم بوڑھے کو ہسپتال پہنچاؤ گے۔“

”اُس کے علاوہ اور کیا چارہ ہے۔“

”تو تم بوڑھے کو ہسپتال پہنچاؤ گے۔“

”اُس کے علاوہ اور کیا چارہ ہے۔“

”تو تم بوڑھے کو ہسپتال پہنچاؤ گے۔“

”اُس کے علاوہ اور کیا چارہ ہے۔“

”تو تم بوڑھے کو ہسپتال پہنچاؤ گے۔“

”اُس کے علاوہ اور کیا چارہ ہے۔“

حمید نے کہا۔ ”اور پھر یہ ڈاکٹر.....!“

”اس ڈاکٹر کو میں دیکھ لوں گا۔“

ہیں تھا۔ لیکن اس نے کوشش کی تھی کہ اجنبی کی نظر اس پر نہ پڑنے پائے۔
ہوئی کے فیجر کی لاش پوسٹ مارٹم کے لئے روک لی گئی تھی۔ اس کے سلسلے میں پولیس

”جیسا مناسب سمجھو۔“ حمید نے لاپرواہی سے شانوں کو جنبش دی اور وہ فیجر کی
دیکھنے لگا۔ مرنے کے بعد اس کے چہرے پر خوفزدگی کے آثار صاف پڑھے جاسکتے تھے۔
نے اس کے خاندان والوں کے لئے ہمدردی محسوس کی اور سوچنے لگا کیا یہاں اس کی

ان واقعات سے بھی تعلق رکھتی ہے۔ یہ سب کچھ اتفاقاً پیش آیا ہے۔
”آخر یہ اس طرح مرکبوں کیا؟“ اجنبی کچھ دیر بعد بڑبڑایا۔
”اسی پر تو مجھے بھی حیرت ہے۔ پروفیسر کے لئے میڈیکل ایڈ کی مخالفت کرنا

پروفیسر ندیم چنگیزی کے بارے میں ابھی تک کوئی سوال نہیں اٹھا تھا۔ وہ ایک بہت زیادہ
پیار آدمی کی حیثیت سے ہسپتال میں پہنچایا گیا تھا۔ ویسے حمید کے خیال کے مطابق یہ بھی ممکن تھا
کہ اس پر اسرار اجنبی نے اپنی حکمت عملی کی بناء پر کسی قسم کا شبہ پیدا نہ ہونے دیا ہو۔ ڈاکٹر نے تو
پچھلی رات ہی اپنا بیان دیتے وقت پروفیسر یا اس کی علالت کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ
یہ اجنبی ہی کے اشارے پر ہوا ہوگا۔ ورنہ ڈاکٹر کی موموجودگی میں بھی فیجر سے اس مسئلے پر بحث
ہوگئی تھی۔

”کچھ بھی نہیں۔ تمہاری عدم موجودگی میں یہی تو معلوم کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔“
”سب بے سود۔“

”بڑی عجیب بات ہے۔“ اجنبی نے سر کو جنبش دے کر کہا۔
لیکن حمید نے اس کے چہرے پر تشویش کے آثار نہ دیکھے۔

یہ اجنبی کون ہے؟ کیا بلا ہے آخر۔ حمید سوچ رہا تھا۔ دفعتاً ایک نئے شعبے نے ذہن میں
رہا تھا..... کہیں اجنبی بھی تو وہی مقصد نہیں رکھتا جس کے لئے فیجر کی جان گئی۔ فیجر یہی تو
چاہتا تھا کہ پروفیسر کا معاملہ پولیس تک نہ پہنچ سکے اور اجنبی کی مداخلت کی بناء پر وہ ہسپتال تو
بچ گیا تھا لیکن پولیس کو اس کی ہوا بھی نہیں لگنے پائی تھی۔

تو کیا یہ اسی سیاہ پوش کا کوئی گرگا ہو سکتا ہے۔

اسی لمحے پر سوچتے ہوئے حمید نے فیصلہ کیا کہ وہ اجنبی کے علم میں لاکر مونا سے ملنے کی
کوشش کرے گا۔

اور پھر جنرل وارڈ کے صدر دروازے پر دونوں کا ٹکراؤ ہو ہی گیا۔

”تم کہاں جا رہے ہو۔“ اجنبی نے راستہ روکتے ہوئے کہا۔

”اندر.....“ حمید نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

کشمکش

دوسرے دن گیارہ بجے تک پروفیسر ندیم چنگیزی کو ہوش نہیں آیا تھا۔ ہسپتال میں
مسلل آکسیجن دی جا رہی تھی۔ اسے جنرل وارڈ میں رکھا گیا تھا اور مونا کو وہاں اس کے
رہنے کی اجازت بھی مل گئی تھی۔

حمید سے ٹکرانے والا اجنبی ہر وقت ہسپتال ہی کے کسی نہ کسی حصے میں دیکھا جاتا۔

”دیکھو..... مجھ سے نہ الجھو..... ورنہ پیچھاؤ گے۔“

”میں لڑکی ہی سے پروفیسر کی خیریت معلوم کرنا چاہتا ہوں۔“

”اُسے ابھی ہوش نہیں آیا۔“

”میں نے کہا تھا کہ میں مونا ہی سے اس کی خیریت دریافت کرنا چاہتا ہوں۔“

”تم ایسا نہیں کر سکتے۔ مجھے غصہ نہ دلاؤ۔“

”کیا پچھلی رات والا تلخ تجربہ یاد نہیں رہا۔“ حمید مسکرا کر بولا۔

”پچھلی رات میں کسی قدر نشے میں تھا۔“

”اچھی بات ہے..... اب تم جب تک اپنا میڈیکل سرٹیفکیٹ نہیں لاؤ گے میں تمہیں اگلی اس کے چہرے تک آئی تھی اور اس کا سینہ معمول کے مطابق پھول چپک رہا تھا۔

ماروں گا۔“

”خاموش رہو۔“ اجنبی کی بھوسیں تن گئیں۔

”واہ پیارے۔“ حمید بائیں آنکھ دبا کر مسکرایا۔ ”ہم کو بعض اوقات غصے پر قطعی پیار نہیں آتا جانتا تھا۔“

”تو پھر مجھے تمہارا بھی انتظام کرنا ہی پڑے گا۔“

”تم کیا کر سکو گے میرا انتظام۔ فشری آف ڈیفنس نے تو یہ کیا تھا میرا انتظام کہ مجھے لیا کرتے وقت دیکھنے کا انداز بالکل بدل گیا تھا۔ آنکھوں میں سہم جانے کی سی کیفیت پائی

مستعفی ہو جانے کی درخواست کی تھی۔“

”اوہو..... تو نکالے گئے تھے۔“ یک بیک اجنبی کا رویہ بدلتا محسوس ہوا۔

”جناب.....!“ حمید سینے پر ہاتھ رکھ کر کسی قدر جھٹکا ہوا بولا۔

”کیوں نکالے گئے تھے۔“

”وہ پھر مونا کی طرف مڑ کر بولا۔ ”میں تمہارے لئے بہت دکھی ہوں مونی بتاؤ میں کیا کروں۔“

مونا کچھ نہ بولی لیکن اُس کی آنکھوں سے جھانکنے والے خوف میں اضافہ ہو گیا تھا۔

”کس وقت ہوش آیا تھا پروفیسر کو۔“ حمید نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

مونانے لگی میں سر کو جنبش دی۔ زبان سے پھر بھی کچھ نہ کہا.....

”اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو بے تکلفی سے کہو۔“ حمید نے کہا۔ اب اُس نے اجنبی کی

طرف پشت پھیر لی تھی۔

”وضاحت کرو۔“

”دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔“ حمید کا موڈ یک لخت بدل گیا۔

”کیا مطلب.....؟“

”میں مونا کے پاس جا رہا ہوں۔ سامنے سے ہٹ جاؤ۔“

”میں یہاں جھگڑا کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن تمہیں دیکھ لوں گا۔“ اجنبی ایک طرف ہٹا ہوا بولا۔

حمید دروازے سے گزر کر آگے بڑھتا چلا گیا۔ اُسے بیڈ نمبر کا علم تھا۔ اس لئے ٹھیک اسی

بہنچ کر رکھا جہاں وہ دونوں موجود تھے۔ بوڑھا چپٹ پڑا تھا۔ آکسیجن کے سلنڈر سے ریڑ کی

مونا بستر کے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی۔

رات بھر جاگتے رہنے کی وجہ سے چہرے پر اضطراب کے علاوہ اور کسی قسم کا تاثر نہیں پایا

حمید کو دیکھ کر وہ چونک پڑی تھی اور پھر حمید کے شانے سے اُس کے عقب میں دیکھا تھا۔

”تم کیا کر سکو گے میرا انتظام۔ فشری آف ڈیفنس نے تو یہ کیا تھا میرا انتظام کہ مجھے لیا کرتے وقت دیکھنے کا انداز بالکل بدل گیا تھا۔ آنکھوں میں سہم جانے کی سی کیفیت پائی

جانی تھی۔“

حمید پھرتی سے مڑا اور سچ مچ اس کا خون کھولنے لگا۔ وہی اجنبی اُس سے دو یا تین فٹ

کے فاصلے پر کھڑا تھا۔

وہ پھر مونا کی طرف مڑ کر بولا۔ ”میں تمہارے لئے بہت دکھی ہوں مونی بتاؤ میں کیا کروں۔“

مونا کچھ نہ بولی لیکن اُس کی آنکھوں سے جھانکنے والے خوف میں اضافہ ہو گیا تھا۔

”کس وقت ہوش آیا تھا پروفیسر کو۔“ حمید نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

مونانے لگی میں سر کو جنبش دی۔ زبان سے پھر بھی کچھ نہ کہا.....

”اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو بے تکلفی سے کہو۔“ حمید نے کہا۔ اب اُس نے اجنبی کی

طرف پشت پھیر لی تھی۔

”بد معاشی۔“

”کک..... کچھ نہیں۔“ وہ ہکلائی۔ اب بھی حمید کے شانے کے اوپر دیکھ رہی تھی۔
دفعتاً حمید نے پھر اُس کی آنکھوں میں تغیر سامحسوس کیا اور ساتھ ہی کوئی ٹھوس چیز
کمر سے آگئی۔

حمید نے مڑے بغیر کتکیوں سے پیچھے دیکھنے کی کوشش کی۔ اجنبی اُس سے لگا کر اسی اجنبی کو پسند نہیں۔

”دروازے کی طرف۔“ اجنبی سرد لہجے میں بولا۔

وہ ٹھوس چیز ریوالور کی نال کے علاوہ اور کیا ہو سکتی تھی۔ ریوالور اجنبی کے کوٹ
میں تھا اور نال جیب ہی سے چھوٹی جارہی تھی۔

حمید بے چون و چرا دروازے کی طرف مڑ گیا۔ اس کی اور اجنبی کی رفتار میں
نہیں تھا اور ریوالور کی نال بدستور کمر سے لگی ہوئی تھی۔

جنرل وارڈ سے نکل کر انہوں نے طویل برآمدہ طے کیا۔ اسی طرح عمارت
ہوتے ہوئے سڑک پر نکل آئے۔

حمید خاموش تھا اور اس کے ہونٹ مضبوطی سے ایک دوسرے پر جمے ہوئے تھے۔
چلنے کے بعد کتھی رنگ کی ایک چھوٹی سی کار کھڑی نظر آئی۔ ڈرائیور کی سیٹ پر ایک

آدمی بیٹھا۔ گارہی رہا تھا۔ انہیں اپنی طرف آتے دیکھ کر اُس نے سگار پھینک دیا اور توک
چپکاری مارتا ہوا گاڑی سے اتر آیا۔

پھر اُن کے لئے پچھلی سیٹ کا دروازہ اُسی نے کھولا تھا۔ حمید کو اسی طرح گاڑی میں غائب ہوئی۔

پڑا اور بیٹھ جانے کے بعد بھی وہ ریوالور کی نال کا دباؤ اپنے پہلو میں محسوس کرتا رہا۔

”کیا ارادے ہیں۔“ حمید نے خود کو لا پرواہ ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔

”کسی ویرانے میں پہنچ کر بات کریں گے۔“ اجنبی غرایا۔

”دیکھ دو دوست۔“ حمید طویل سانس لے کر بولا۔ ”میں کہتا ہوں..... خیر جانے“

مجھے دیکھنا ہے کہ تم کیا چاہتے ہو۔ اپنا مطلع نظر تو میں تم پر پہلے ہی واضح کر چکا ہوں۔“

”چپ چاپ بیٹھے رہو۔“

حمید نے پھر ہونٹ بھیج لئے۔ اب اُسے پوری طرح یقین ہو گیا تھا کہ معاملہ محض رقابت
تعلق نہیں رکھتا۔ پروفیسر بے ہوش ہے اس سے کچھ پوچھا نہیں جاسکتا۔ مونا ہی کسی قسم کی
معلومات کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ لہذا کسی غیر متعلق آدمی کا اس تک پہنچنا کسی نامعلوم آدمی یا خود

اس کی نظر عقب نما آئینے پر پڑی۔ پیچھے کئی اور گاڑیاں بھی تھیں۔ سڑک اتنی کشادہ نہیں
نہی کہ گاڑیاں برابر سے چل سکتیں۔ لہذا جب بھی اس کار کی رفتار کم ہوتی پچھلی گاڑیوں کے
ہارن چگھانے لگتے۔

اچانک ایک دوراہے پر پہنچ کر کار بائیں جانب مڑ گئی۔ کچھ دیر بعد حمید نے یونہی بغیر
ارادہ پھر عقب نما آئینے کی طرف دیکھا۔ اب بھی ایک گاڑی پیچھے نظر آ رہی تھی۔ اُس نے ایک
طویل سانس لی اور آنے والے لمحات کے بارے میں سوچنے لگا۔

دفعتاً پچھلی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ یہ سڑک کسی قدر کشادہ تھی۔ اس کار کی رفتار کچھ کم
ہوئی اور پچھلی گاڑی کو راستہ دینے کے لئے ایک طرف کر لیا گیا۔

دوسری گاڑی برابر سے گزری چلی گئی۔ اُس کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔
تھوڑی دیر بعد اسی کار سے ہارن دینے کی ضرورت پیش آ گئی جس میں حمید سفر کر رہا تھا۔
ڈرائیور پے در پے ہارن دیتا رہا۔ لیکن اگلی گاڑی نے نہ تو راستہ ہی دیا اور نہ اس کی رفتار

”پاگل ہو گیا ہے مردود۔“ اجنبی غرایا۔

”فائر کر دو پچھلے کسی وہیل پر۔“ حمید نے مشورہ دیا۔

”شاید یہی کرنا پڑے۔“ اجنبی نے کہا۔ پھر یک بیک چوٹ کر حمید کو گھورنے لگا۔

ڈرائیور نے پھر ہارن دیا لیکن بے سود۔ اگلی گاڑی پہلے ہی کے سے انداز میں چلتی رہی۔

”تم مجھے اس طرح کیوں گھور رہے ہو۔“ حمید بولا۔

”تمہیں یہاں کتنے لوگ جانتے ہیں۔“

”تم جانتے ہو۔ مونا جانتی ہے اور تیسرا تو چل ہی بسا۔“

”اگلی گاڑی میں کون ہے؟“

”غالباً لیڈی ماؤنٹ بیٹن.....!“

”سنجیدگی اختیار کرو۔ ورنہ ٹریگر دب جائے گا۔“ اجنبی نے کہا اور حمید بائیں

ریوالور کی چیپن کچھ اور زیادہ محسوس کرنے لگا۔

”میں نہیں جانتا۔ اور سنو..... اگر یہ سب کچھ محض مونا کی وجہ سے ہو رہا ہے تو یقین

کہ میں اب اُس سے کبھی نہ ملوں گا۔“

”اب اتنی آسانی سے گلو خلاصی نہیں ہو سکتی۔“ اجنبی نے طنزیہ سی ہنسی کے ساتھ کہا۔

”یعنی..... کیا مطلب.....!“

”اب میں یہ دیکھوں گا کہ تم حقیقتاً کون ہو۔“

”اس کے لئے مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

”مجھے ہی کچھ کرنا ہوگا..... تمہیں تکلیف نہیں اٹھانی پڑے گی۔“ اجنبی نے کہا۔

چھپائے ہوئے لہجے میں ڈرائیور سے بولا۔ ”کھکھیو..... کھکھیو۔“

حمید اس بے معنی لفظ پر چونکا تھا۔ لیکن قبل اس کے کہ کچھ سمجھ بھی سکتا اگلی کار کے

جانب ایک دھماکہ ہوا اور وہ بائیں جانب دتی چلی گئی۔

اس کار کے ڈرائیور نے ڈیش بورڈ کے خانے سے کوئی چیز نکال کر پھینکی تھی۔ اب

دوبارہ وہی کرنے جا رہا تھا۔

پھر دھماکہ ہوا لیکن اس بار اگلی گاڑی بائیں جانب دبنے کی بجائے سڑک پر آڑی

رک گئی اور ڈرائیور کی سیٹ سے کسی نے چھلانگ لگائی۔

حمید والی گاڑی کے ڈرائیور نے پورا بریک نہ لگایا ہوتا تو وہ اگلی گاڑی سے جا

ہوتی۔ صرف دو فٹ کے فاصلے پر رکی تھی۔

پھر دفعتاً حمید نے محسوس کیا کہ اسکے بائیں پہلو پر اجنبی کے ریوالور کا دباؤ ختم ہو گیا۔

جنی کار ریوالور والا ہاتھ اب کھڑکی کے باہر تھا۔ اُس نے اگلی کار کے ڈرائیور کو کور کر رکھا تھا۔

حمید والی گاڑی کا ڈرائیور نیچے اتر کر اگلی کار کے ڈرائیور کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ایک بیک

مید کو ہوش آ گیا اور وہ بیٹھے ہی بیٹھے اجنبی پر ٹوٹ پڑا۔ ریوالور والا ہاتھ پر خاص طور سے

دھماکا دیا تھا۔ لہذا ریوالور سڑک پر جا پڑا۔

ڈرائیور دوسرے ڈرائیور کی طرف جانے کی بجائے تیر کی طرح ریوالور کی طرف چھپتا تھا۔

لیکن اُسے کامیابی نہ ہوئی وہ ریوالور کو اٹھانے کے لئے جھک رہا تھا۔ دوسری گاڑی کے

ڈرائیور کی ٹھوکر اس کی ٹھوڑی پر پڑی اور وہ چیختا ہوا دوسری طرف الٹ گیا۔

اور پھر نہ اٹھ سکا۔ دونوں ہاتھوں سے ٹھوڑی دبائے ہوئے پیر پٹتا رہا۔

اگر حمید محسوس کر رہا تھا کہ اس کا حریف بھی کمزور نہیں ہے اور اُس نے اپنے بارے میں

غلط فہمی کہا تھا کہ وہ پچھلی رات پئے ہوئے تھا۔

دفعتاً باہر سے آواز آئی۔ ”تم لوگ بھی اتر آؤ۔ ورنہ خون ہو جائے گا ایک آدھ کا۔“

حمید نے محسوس کیا کہ اجنبی ڈھیلا پڑ گیا ہے۔

دوسری گاڑی کا ڈرائیور پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولے کھڑا تھا اور اُس کے داہنے ہاتھ میں

اُس نے اجنبی کو دھکا دیا اور وہ سڑک پر جا پڑا لیکن پھر فوراً ہی تن کر کھڑا ہو گیا تھا۔

حمید گاڑی میں بیٹھا رہا۔ اُس نے محسوس کیا کہ دوسری گاڑی کے ڈرائیور کی توجہ اس کی

طرف تھی بھی نہیں۔ وہ تو صرف اجنبی کو کور کئے کھڑا تھا اور اجنبی کی گاڑی کا ڈرائیور تو اس طرح

”تم لوگوں نے یہ پٹانے کیوں پھینکے تھے۔“ اگلی کار کا ڈرائیور غرایا۔

یہ ایک قد آور اور توانا جسم کا آدمی تھا۔ آنکھوں پر تاریک شیشوں کی عینک تھی اور

ڈرائیوروں والی وردی میں ملبوس تھا۔

”تم ہمیں راستہ کیوں نہیں دے رہے تھے۔“ اجنبی نے سخت لہجے میں کہا۔

”اس پر تم نے پٹانے پھینکے..... کیوں.....؟ اگر گاڑی کھڈ میں جا پڑتی تو۔“
 ”میں کہتا ہوں اپنی راہ لو..... ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔“ اجنبی دانت پیس کر بولا۔
 ”اب تمہا تو جاؤں گا نہیں۔ تم بھی جاؤ گے میرے ساتھ۔“
 ”کیا مطلب.....؟“

”میجر سعید..... پلیز.....!“ ڈرائیور نے حمید کو مخاطب کر کے کہا۔ ”کیا آپ نیچے اس شریف آدمی کے ہاتھ پیر نہیں باندھیں گے۔“
 حمید نیچے اتر آیا۔ وہ اُس ڈرائیور کو پہلے ہی گھورتا رہا تھا۔
 ”میری گاڑی سے ڈور کا لچھا نکال لیجئے۔ آپ کو تکلیف تو ہوگی۔ ڈگی میں ہے۔“
 ”تو یہ سب کچھ.....!“ اجنبی نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن اُس کی آواز ڈرائیور کی گونجی جا رہی تھی۔
 ”اپ میں دب کر رہ گئی۔“

حمید اگلی کار کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ ڈکے اٹھا کر ریشمی ڈور کی لچھی نکالی اور پھر ان طرف پلٹ آیا۔
 ”اپنے دونوں ہاتھ پشت پر لے جاؤ۔“ ڈرائیور اجنبی سے کہہ رہا تھا۔
 ”یہ ناممکن ہے۔ مجھے حلہ نہ سمجھو۔“ اجنبی غرایا۔

لیکن دوسرے ہی لمحے میں حمید نے ڈور کا لچھا پھینک کر اس کی کینٹی پر ایک زوردار مار مار ڈالی۔
 ”جڑ دیا۔“ اجنبی لڑکھڑایا پھر سنبھلنے نہیں پایا تھا کہ ٹھیک اُسی جگہ دوسرا ہاتھ پڑا۔
 اس بار وہ اس طرح لڑکھڑا کر گرا تھا جیسے توازن کی حس کھو بیٹھا ہو۔
 ”کافی ہے۔“ ڈرائیور ہاتھ ہلا کر بولا۔
 کینٹی کی یہ ضرب کلوروفارم سے بھی زیادہ موثر ثابت ہوا کرتی تھی۔
 وہ بیہوش ہو گیا۔

”بڑا سدا ہوا ہاتھ تھا۔“ ڈرائیور بولا۔

”مرشد کا فیض ہے۔“ حمید نے کہا اور جھک کر اُس کے ہاتھ پیر باندھنے لگا۔

گاڑی کے ڈرائیور کے ساتھ بھی یہی رویہ اختیار کیا گیا۔

”آپ ان دونوں کو میری گاڑی تک پہنچانے میں مدد دیجئے۔“ ڈرائیور نے کہا۔
 ”کیا ہم پہلے بھی کبھی مل چکے ہیں۔“ حمید نے ڈرائیور کو گھورتے ہوئے کہا۔
 ”جناب نے پرورش ہی میری گود میں پائی ہے۔“ ڈرائیور کا جواب تھا۔

حمید اچھل پڑا۔ سخت غصہ آیا اپنے ڈیوٹ پن پر..... لیکن وہ کرتا بھی کیا۔ میک اپ میں تو فیری کا پورا ڈھانچہ ہی بدل کر رہ جاتا تھا۔ نہ قد کا صحیح سراغ ملتا اور نہ تن و توش کا۔ چلنے کا انداز تک بدل جاتا تھا۔ پھر آواز کیا پہچانی جاسکتی۔

”اوہ.....!“ حمید ہاتھ ملتا ہوا بولا۔ ”تو ایک بار پھر میں چارے کے طور پر استعمال کیا“
 ”وقت نہیں ہے۔ جلدی کرو۔ اگر کوئی اور گاڑی ادھر آنکلی تو زحمت ہوگی۔ لو یہ لفافہ رکھو..... اطمینان سے دیکھنا.....!“

”ان دونوں کو میری گاڑی تک پہنچاؤ اور تمہیں اسی گاڑی سے واپس جانا ہے۔ جہاں سے اس پر بیٹھے تھے وہیں چھوڑ دینا۔“

پھر بیہوش ڈرائیور کے ہاتھ پیر بھی باندھے گئے اور ان دونوں کو فریدی کی گاڑی کی پیچلی سیٹ پر ڈال دیا گیا۔

”آپ یہاں کب سے ہیں۔“ حمید نے پوچھا۔

”جب سے تم ہو.....!“

”میں نہیں سمجھا۔“

”ہم دونوں ایک ہی جہاز سے یہاں پہنچے تھے۔“

”میرے خدا.....!“ حمید منہ کھول کر رہ گیا۔

”بس اب جاؤ۔“ فریدی نے کہا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر انجن اشارت کر دیا۔

مجبوراً حمید کو بھی واپس ہونا پڑا۔ بہتیرے چھپتے ہوئے سوالات گھٹ کر رہ گئے تھے۔ وہ

اس اندھا دھند بھاگ دوڑ کے بارے میں تفصیلات معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اچانک وہ لڑا۔ لیکن وہ راستے میں نہیں رکتا چاہتا تھا۔

ہسپتال کے قریب پہنچ کر رفتار کم کر دی۔ فریدی کی ہدایت کے مطابق گاڑی کو روکا۔ اسے دوبارہ حاصل کرنے کے لئے کسی قسم کا خطرہ مول لے بیٹھا۔

جگہ چھوڑنا چاہتا تھا جہاں سے روانہ ہوئی تھی۔

ہسپتال کے لان میں ایک گوشے میں بیٹھ کر اس نے لفافہ چاک کیا۔ اس میں نہیں۔ گولڈن ایرو کا نام ان دنوں اسی طرح مشہور تھا جیسے عالمی تنظیم مافیا کے بارے میں دنیا کا بڑا ہی نہیں بلکہ تیر کی شکل کی ایک سنہری ٹائی پن بھی تھی۔

وہ چند لمحے اُسے الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا پھر اس کے ساتھ والی تحریر دیکھنے لگا۔ فریدی ہی کی تھی لکھا تھا۔

”پروفیسر کی لڑکی سے قریب تر ہونے کی کوشش جاری رکھو۔ وہ سارہ رحمان کو کال کر قریب میں ڈال لیا اور اس کی جگہ لفافے سے برآمد ہونے والا پن لگاتے ہوئے سوچا

قریب سے جانتی تھی۔ فی الحال ایک نامعلوم آدمی اس کی نگرانی کر رہا ہے۔ میرا خیال ہے اگر اس کی اہمیت سے واقف ہے تو اب وہ اُس سے بھی دور بھاگے گی۔ جیسے اُس اجنبی نہیں چاہتا کہ کوئی اجنبی اس لڑکی سے کسی قسم کا تعلق رکھے۔ پروفیسر میرے لئے نئی دریافت کی گئی ہے۔ کتنی خوفزدہ نظر آتی تھی اُس کی موجودگی میں۔

اسے بھی دیکھنا پڑے گا۔ یہ ٹائی پن ہر وقت تمہارے استعمال میں رہنا چاہئے۔ اگر غیر پاپ کا تمباکو راکھ ہو چکا تھا۔ حمید نے فیصلہ کیا کہ وہ مونا کی موجودگی میں تیر نما ٹائی پن حالات سامنے آئیں تو حیرت کا اظہار نہ ہونا چاہئے۔ وقتاً فوقتاً تمہیں ہدایات ملتی رہیں گی۔“

حمید نے پرچے کا پرزہ پرزہ کر کے ایک طرف اچھال دیا اور ٹائی پن کو پھر گھورنے لگا۔

سنہرا تیر..... اوہ..... گولڈن ایرو..... تو اب اُسے اس نشانی سمیت منظر عام پر آئے۔

گا۔ یعنی وہ خود کو اُسی گروہ سے متعلق ظاہر کرنے کی کوشش کرے گا۔

”سارہ رحمان۔“ وہ بڑبڑایا اور ایک طویل سانس لے کر غلاء میں گھورنے لگا۔

آرٹھ کا معصوم چہرہ یاد آیا..... وہ قاتلہ یاد آئی جس نے اپنی جان بچانے کے لئے

خطرناک آدمی کو قتل کر دیا تھا۔ جسے افسوس تھا کہ اس کی وجہ سے ایک معصوم آدمی کو پولیس

جیل میں ڈال رکھا ہے۔ وہ جس نے اپنا گمشدہ پرس حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے

آدمی کو آلہ کار بنایا تھا۔ وہ جو فریدی سے ملنا چاہتی تھی اور اسی دھوکے میں اپنے انجام کو پہنچی

کہ وہ فریدی سے ملنے جا رہی تھی۔

اس کا پرس یاد آیا جو اب بھی فریدی کے پاس تھا۔ لیکن کیا تھا اُس پرس میں۔ ایک معمولی سی رقم جس کی گمشدگی ایک مفلس ترین آدمی کے لئے بھی اتنی باعث تشویش نہ ہوتی کہ

اگر اُس پرس کی اہمیت تیر کے نشان کی وجہ سے تھی تو یہ بات بھی سمجھ میں آنے والی

نہیں۔ گولڈن ایرو کا نام ان دنوں اسی طرح مشہور تھا جیسے عالمی تنظیم مافیا کے بارے میں دنیا کا بڑا ہی نہیں بلکہ تیر کی شکل کی ایک سنہری ٹائی پن بھی تھی۔

وہ چند لمحے اُسے الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا پھر اس کے ساتھ والی تحریر دیکھنے لگا۔

فریدی ہی کی تھی لکھا تھا۔

”پروفیسر کی لڑکی سے قریب تر ہونے کی کوشش جاری رکھو۔ وہ سارہ رحمان کو کال کر قریب میں ڈال لیا اور اس کی جگہ لفافے سے برآمد ہونے والا پن لگاتے ہوئے سوچا

قریب سے جانتی تھی۔ فی الحال ایک نامعلوم آدمی اس کی نگرانی کر رہا ہے۔ میرا خیال ہے اگر اس کی اہمیت سے واقف ہے تو اب وہ اُس سے بھی دور بھاگے گی۔ جیسے اُس اجنبی نہیں چاہتا کہ کوئی اجنبی اس لڑکی سے کسی قسم کا تعلق رکھے۔ پروفیسر میرے لئے نئی دریافت کی گئی ہے۔ کتنی خوفزدہ نظر آتی تھی اُس کی موجودگی میں۔

اسے بھی دیکھنا پڑے گا۔ یہ ٹائی پن ہر وقت تمہارے استعمال میں رہنا چاہئے۔ اگر غیر پاپ کا تمباکو راکھ ہو چکا تھا۔ حمید نے فیصلہ کیا کہ وہ مونا کی موجودگی میں تیر نما ٹائی پن حالات سامنے آئیں تو حیرت کا اظہار نہ ہونا چاہئے۔ وقتاً فوقتاً تمہیں ہدایات ملتی رہیں گی۔“

حمید نے پرچے کا پرزہ پرزہ کر کے ایک طرف اچھال دیا اور ٹائی پن کو پھر گھورنے لگا۔

سنہرا تیر..... اوہ..... گولڈن ایرو..... تو اب اُسے اس نشانی سمیت منظر عام پر آئے۔

گا۔ یعنی وہ خود کو اُسی گروہ سے متعلق ظاہر کرنے کی کوشش کرے گا۔

”سارہ رحمان۔“ وہ بڑبڑایا اور ایک طویل سانس لے کر غلاء میں گھورنے لگا۔

آرٹھ کا معصوم چہرہ یاد آیا..... وہ قاتلہ یاد آئی جس نے اپنی جان بچانے کے لئے

خطرناک آدمی کو قتل کر دیا تھا۔ جسے افسوس تھا کہ اس کی وجہ سے ایک معصوم آدمی کو پولیس

جیل میں ڈال رکھا ہے۔ وہ جس نے اپنا گمشدہ پرس حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے

آدمی کو آلہ کار بنایا تھا۔ وہ جو فریدی سے ملنا چاہتی تھی اور اسی دھوکے میں اپنے انجام کو پہنچی

کہ وہ فریدی سے ملنے جا رہی تھی۔

”تم..... تم..... واپس آ گئے۔“ وہ بدقت بھلائی۔

”مظلوموں کی حمایت اور حفاظت کرنا ہمیشہ سے میرا اصول رہا ہے۔“

”مظلوموں..... کیا مطلب.....!“ وہ خوفزدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

”میں نے اس دوران میں بہت کچھ محسوس کیا ہے۔“

”کک..... کیا محسوس کیا ہے۔“

”یہی کہ تم خائف ہو۔ مجھے اس آدمی کے بارے میں بتاؤ جو مجھے یہاں سے لے گیا تھا۔“

”جی ایک لڑکی..... بہر حال میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تمہاری وجہ سے ایک ایسا آدمی ہاتھ لگا جو کولڈن ایرو بطور ٹائی پن استعمال کرتا تھا۔“

”م..... میں کچھ نہیں سمجھی۔“

”تم سمجھ کر کیا کرو گی۔ اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ تمہیں بہت چاہتا ہے۔ لیکن تم اس سے متنفر ہو اور وہ تمہیں اتنا زیادہ چاہتا ہے کہ تمہارے قریب کسی دوسرے مرد کی موجودگی ثابت نہیں کر سکتا۔“

”بے شک اس تھی۔“ وہ بے ساختہ بولی اور پھر خوفزدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔

”پھر.....! حید نے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”اُسے تم سے کس قسم کا بھینک دیا۔“

”اب کیا ہوگا..... میرے خدا.....!“ اُس نے کہا اور آنکھیں بند کر کے آگے جھولنے لگی۔

”میں نہیں جانتی..... میں کچھ نہیں جانتی۔“ وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر بولی۔

”تو پھر میں یہ سمجھ لوں کہ تم بھی انہیں لوگوں سے تعلق رکھتی ہو۔“

”نہیں..... نہیں..... ہرگز نہیں۔“ وہ چہرے پر سے ہاتھ ہٹاتی ہوئی بولی۔

”خیر..... خیر..... تم بہت پریشان ہو۔ میں اب تم سے کچھ نہیں پوچھوں گا۔ لیکن سارہ کے ناکل اب مجھ سے نہیں بچ سکتے۔“

”سارہ.....!“ وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”سس..... سارہ رحمان تو نہیں۔“

”کیا.....؟ کیا تم اُسے جانتی تھیں۔“ حید نے حیرت ظاہر کرنے کی بہت شاندار اداکاری کی۔

”وہ پھر بیڑہ لگی اور کسی بت کی طرح ویران ویران آنکھوں سے خلاء میں گھورے جاری تھی۔“

وہ غار

”مری صبح حید الجھن میں تھا کہ فریدی کو اُن واقعات سے کیسے آگاہ کرے جو پچھلے دن

”وہ..... وہ کہاں ہے..... وہ.....!“

”تم نے محسوس کیا ہوگا کہ میں نے کسی چوہے کی طرح اُس کے حکم کی تعمیل کی تھی۔“

”م..... میں نے محسوس کیا تھا۔“

”وہ مجھے دیوالور کے زور پر یہاں سے لے گیا تھا۔“

”میں نے یہی محسوس کیا تھا۔“ وہ مضطربانہ انداز میں بولی۔ ”پھر کیا ہوا۔“

”تین سو فٹ گہری کھڈ اس کا مقدر بن گئی۔“

”کک..... کک..... کیسے.....!“

”اُس نے مجھ پر گولی چلائی تھی..... تین فارے کئے تھے۔ پھر میں نے اُسے اٹھا کر اچھینک دیا۔“

”اب کیا ہوگا..... میرے خدا.....!“ اُس نے کہا اور آنکھیں بند کر کے آگے جھولنے لگی۔

”اے..... ہوش میں آؤ۔“ حید نے اُس کا شانہ پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔

”پھر وہ بالکل اسی طرح چونک پڑی تھی جیسے گہری نیند سے جاگی ہو۔“

”تت..... تم نے اُسے مار ڈالا.....!“

”ہاں..... میں ہر اس آدمی کو مار ڈالوں گا جو تیر کی شکل کا ٹائی پن استعمال کرتا ہو۔“

”خ..... خدا کے لئے آہستہ بولو.....!“ وہ چاروں طرف دیکھتی ہوئی گڑ گڑائی۔

”حید نے قہقہہ انداز میں سر کو جنبش دی اور اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔“

”تت تم کیوں مار ڈالو گے ہر اس آدمی کو.....!“

”میں اپنی اس معصوم دوست کی موت کو کبھی نہیں بھلا سکتا جس کے پہلو میں ایک تیر پوسٹ ہو گیا تھا۔ میرے خدا وہ کتنی اچھی تھی۔ اس نے ان لوگوں کے جال سے نکلنا اور انہوں نے اُسے مار ڈالا۔“

”تم کس کی باتیں کر رہے ہو۔“ مونا بانپتی ہوئی بولی۔

اُس نے کنجی کے لچھے سے انگیشن کی منتخب کی اور گاڑی کو اسٹارٹ کر کے پارکنگ شیڈ

سے نکال لایا۔

اب وہ بھرنالے کی طرف جا رہا تھا۔

نال کہلاتا تھا لیکن حقیقتاً تھا ایک انتہائی پر شور پہاڑی دریا، جو رام گڈھ اور ٹیکم گڈھ کے درمیان خط تقسیم کا کام بھی دیتا تھا۔

میلوں تک بہاؤ اتنا تیز تھا کہ اسے پار نہیں کیا جاسکتا تھا۔

یہی سڑک جس پر حمید سفر کر رہا تھا ایک جگہ پل پر سے گزرتی ہوئی ٹیکم گڈھ کی سرحد میں داخل ہوتی تھی۔

حمید سوچ رہا تھا کیا اُسے پل تک جانا ہوگا۔ ویسے سڑک تو کئی جگہ بھرتو نالے کے قریب سے ہی گزرتی تھی۔

”اوہہ.....!“ وہ سر جھٹک کر بڑبڑایا۔ ”دیکھا جائے گا۔“

لیکن یہ کنجیوں کا لچھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ انگیشن اور گاڑی کے دوسرے قفلوں کے لئے عموماً ایک ہی کنجی ہوتی ہے پھر یہ سات عدد کنجیاں کیسی ہیں جن کی بناوٹوں میں بھی نمایاں فرق ہے۔

کار تیز رفتاری سے پہاڑی سڑک طے کرتی رہی۔ ابر ہونے کی وجہ سے خشکی بڑھ گئی تھی۔ قیمت یہی تھا کہ ہوا تیز نہیں تھی۔ ورنہ ڈرائیوگ وبال جان بن جاتی۔ پھر بھی ہاتھوں پر اتارنے تو تھے ہی ورنہ ٹھنڈے اسٹیرنگ نے ہتھیلیوں کا خون منجمد کر دیا تھا۔

اُسے پھر کنجیوں کا خیال آیا۔ اُس نے سوچا کہ رکنا چاہئے کسی مناسب سے مقام پر اور دیکھنا چاہئے کہ کہیں ”یہ حجرہ ہاے نفٹ بلا“ کی کنجیاں تو نہیں ہیں۔

سات عدد کنجیاں طلسم ہوشربا کے سات حجروں کی کنجیاں بھی ثابت ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ ان کا تعلق فادر ہارڈ اسٹون سے ہے۔ فادر ہارڈ اسٹون جو اپنی جسامت اور قد و قامت تک بدل کر رکھ دیتا ہے۔

پیش آئے تھے۔

ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد اُس نے ناشتے کے لئے فون کیا اور کور قریب جا کھڑا ہوا۔ مطلع ابر آلود تھا۔ سردی پچھلے دن سے کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وینر ناشتے کی ٹرے رکھ کر چلا گیا۔ اور حمید پائپ میں تمباکو بھرتا ہوا قریب آ بیٹھا۔ پچھلے دن کے واقعات اب بھی اس کے ذہن میں گونج رہے تھے۔

تمباکو بھر کر پائپ ایک طرف رکھتے ہوئے اس نے ناشتے کی ٹرے پر نظر ڈال جانے کے سے انداز میں ہونٹ سکڑ لئے۔

چاکلیٹ کا پیکٹ..... اُس سے پہلے تو کبھی ناشتے کے ساتھ چاکلیٹ کا پیکٹ نہیں اُس نے اُسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور پر تنگ انداز میں اُس پر سے کورا تارنے لگا۔ یہ اس خاص خیال کے تحت نہیں کیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے میں پیکٹ کی اہمیت اُس پر واضح ہو کور کی چٹکی سطح پر سیاہ روشنائی سے تحریر تھا۔

”ناشتہ کر کے لباس تبدیل کرو۔ پارکنگ شیڈ میں گہرے براؤن رنگ کی ایک ٹوپ کا نمبر ایم پی اے سات سو گیارہ ہے تمہارے ہی لئے مہیا کی گئی ہے۔ چابی ڈیش بورڈ خانے میں ہے۔ بس سیدھے بھرتو نالے کی طرف چلے آؤ اور ہاں وہ ٹائی پن لگنا مت بھ حمید نے طویل سانس لی اور کور کو پرزے کر کے آتش دان میں ڈال دیا۔ تو جہاں پوری طرح جال بجھا رکھا ہے۔ اُس نے سوچا..... اور ناشتے کی ٹرے کی طرف پھر متوجہ کافی فلیور نہ جانے کیوں اچھا نہ لگا۔ سینڈوچ اچھے تھے..... جوں توں ناشتہ ختم لباس تبدیل کیا۔

ٹو سیٹر جس کا تذکرہ پیغام میں تھا پارکنگ شیڈ میں موجود تھی۔ حمید نے اُسے دیکھ کر محسوس کیا کہ وہ غیر معمولی ساخت رکھتی ہے۔

ڈیش بورڈ میں گاڑی کی کتاب اور کنجیاں موجود تھیں۔ کتاب کھول کر دیکھی تو یہ لکھا گیا۔ یہ میجر حامد سعید ہی کے نام کی تھی۔ پتہ رام گڈھ زون کے ہل اسٹیشن کا تھا۔

خدا کی پناہ..... پچھلے دن آنکھوں نے کیسا دھوکا کھایا تھا۔

اُس نے ایک جگہ سڑک کے کنارے تھوڑا سا سطح نکلا دیکھ کر گاڑی وہیں روک دی۔
ڈیش بورڈ کا جائزہ لینے لگا۔ لیکن وہاں کوئی غیر معمولی بات نظر نہ آئی۔

پھر گاڑی کے دوسرے حصوں کی طرف متوجہ ہوا۔

دروازے کچھ غیر معمولی سے لگے اُن کی موٹائی غیر معمولی تھی۔ ویسے بھی جب ہم
اس گاڑی کو پارکنگ شیڈ میں دیکھا تھا تو ذہن کے کسی گوشے میں یہ احساس موجود تھا کہ وہ
ٹو سیٹر گاڑیوں سے مختلف ہے۔

دروازہ کھولنے کے لئے ہینڈل گھمایا ہی تھا کہ ہینڈل کے نیچے ایک مخصوص کٹاؤ والی
نظر آئی۔

”ہوں.....!“ اُس نے تعجبی انداز میں سر کو جنبش دی اور اس خلاء میں مختلف کنبال
کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر ایک لگ ہی گئی اور اسی دروازے کا اسٹرکچر کریٹ پر آ
استر کے پیچھے ایک ٹائٹ قسم کا خانہ تھا جس میں ایک ٹائی گن رکھی ہوئی تھی اور اس کے لئے
راؤنڈ بھی تھے۔ حمید نے فوراً ہی استر اس کی جگہ لگا کر اُسے دوبارہ مقفل کر دیا۔

پھر وہ دوسرے دروازوں کو بھی آزمائے ہی جا رہا تھا کہ ایک تیز رفتار گاڑی قریب
گزر گئی۔ پھر چند ثانیوں کے بعد دوسری بھی گزری لیکن اس بار حمید کو الٹ ہو جانا پڑا۔
گاڑی کو یاسمین قزلباش ڈرائیو کر رہی تھی اور تنہا تھی۔

حمید نے اپنی گاڑی بھی اشارت کی اور اسی رفتار سے چل پڑا جس رفتار سے یاسمین
گاڑی گزری تھی۔

دونوں گاڑیوں کا فاصلہ زیادہ سے زیادہ سو گزر رہا ہوگا۔ حمید نے دیدہ و دانستہ یہ فائدہ
برقرار رکھا ورنہ چاہتا تو اُس سے اور بھی قریب رہ سکتا تھا۔

پھر یک بیک ایک موٹر پر اگلی گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ بہت ہی خطرناک فہم
موٹر تھا۔ حمید کو رفتار بہت کم کر دینی پڑی۔ ذرا سی بے احتیاطی گاڑی کو سیٹکڑوں فٹ گہری

لے جاتی۔ لیکن وہ عورت..... یاسمین قزلباش یا تو پاگل تھی یا خود اعتمادی کے معاملے میں
اب نہیں رکھتی تھی۔

موٹر تک پہنچتے پہنچتے حمید کی گاڑی ریٹنگ لگی تھی۔ بہت احتیاط سے اس نے نصف دائرہ
ایک اور پھر کشادہ سڑک پر پہنچ گیا۔ لیکن حد نظر تک یاسمین کی گاڑی کا پتہ نہیں تھا۔

حمید نے گیر بدل کر ایک سیلیٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔ گاڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔
لیکن پھر تو انجن ہی بند کر دینا پڑا تھا۔ بڑی گہری ڈھلان تھی۔ شاید یہ ڈھلان حمید کی
برائت سے محو ہو گئی تھی۔ ورنہ وہ اُس موٹر سے گزر جانے کے بعد بھی رفتار کا اعتدال قائم رکھتا۔
اس کے بعد پھر چڑھاٹی تھی۔ سلف لگا کر انجن دوبارہ اشارت کیا۔

اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد کچھ فاصلے پر اُسے دو گاڑیاں نظر آئیں ایک سڑک پر آڑی
کڑی تھی اور دوسری سیدھی۔ یہ یاسمین ہی کی گاڑی تھی۔ لیکن وہ جو آڑی کھڑی تھی صاف
لاہر ہوتا تھا جیسے اُسی کو روکنے کے لئے وہ اُس پوزیشن میں لائی گئی ہو۔

حمید نے بھی قریب ہی پہنچ کر گاڑی روکی۔ یاسمین والی گاڑی خالی تھی۔ لیکن اگلی گاڑی
کے قریب ایک آدمی کھڑا نظر آیا۔

”معاف فرمائیے گا جناب۔“ اس آدمی نے حمید کو مخاطب کر کے کہا۔ ”میں ایک منٹ
معاپ کیلئے راستہ بناتا ہوں۔ پلٹ کر کیلئے نکلنے والے عمو! اپنے دماغ گھر ہی چھوڑ آتے ہیں۔“
”کیا میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔“ حمید گاڑی سے اترتا ہوا بولا۔

”شکریہ۔“ دوسرے آدمی نے جواب دیا۔ کافی جگہ ہے صرف گاڑی کی پوزیشن
بڑے گی۔

حمید اتنی دیر میں اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔
اس نے محسوس کیا کہ دوسرے آدمی کی نظر اُس کی ٹائی پین پر ہے۔ پھر اُس نے حمید کے

چہرے پر سوالیہ نظر ڈالی۔

حمید نے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔

”بائیں جانب.....!“ وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”راستہ بنا ہوا ہے۔“

”یہ گاڑی سیدھی کرلو۔ خواہ مخواہ..... لوگ شبہات میں مبتلا ہوں گے۔“ حمید بڑبڑا کر گاڑی کے پاس سے ہٹ گیا۔

دوسرا آدمی انجن اشارت کر کے گاڑی کی پوزیشن تبدیل کرنے لگا۔ حمید نے اُس میں تیر نماپن دیکھا۔

بائیں ڈھلان پر ایک پتلی سی اور کسی قدر گہری نالی نظر آئی۔ اُس نے سوچا غار پگڈنڈی کو اُس نے راستہ کہا تھا اور یقیناً یہ راستہ کسی خاص جگہ تک جاتا ہوگا۔

اس نالی کی گہرائی ایک یا ڈیڑھ بالشت سے زیادہ نہ رہی ہوگی۔ لیکن یہ انسانی ہاتھ کا رستہ نہیں معلوم ہوتا تھا۔

حمید اسی نالی کے سہارے ڈھلان میں اترتا رہا۔ ایک جگہ وہ نالی پہاڑی سڑک طرح گھوی ہوئی نظر آئی اور اُس موڑ سے گزرتے ہوئے اُس نے محسوس کیا کہ شاید تختہ ہی میں اس کا اختتام ہو کیونکہ آگے پھر موڑ تھا۔

ایسے ہی تین موڑ اور طے اور پھر وہ گہری پگڈنڈی ایک غار میں داخل ہو گئی۔ گہرا داخل ہو گئی ہوگی۔ حمید تو دبانے ہی پر ٹھنک گیا تھا۔

پھر ابھی سنبھلا بھی نہیں تھا کہ ایک گر کی اوٹ سے ایک ریو الوور نکل کر اس کے سینے سے آ ”سامنے آؤ.....!“ حمید غرایا۔

ریو الوور گر کی اوٹ سے باہر آ گیا۔ حمید نے پہلے اُسے تنکھی نظروں سے دیکھا اپنے ٹائی پن کی طرف دیکھنے لگا۔

”آئی ایم سوری۔“ وہ گڑبڑا کر بڑبڑایا اور ریو الوور کی نالی حمید کے سینے سے ہٹ گئی۔ ”راستہ دکھاؤ..... میں دھام نگر سے سیدھا چلا آ رہا ہوں۔“ حمید بولا۔

”آئیے..... آئیے..... ایک منٹ یہاں ٹھہریے تاکہ آنکھیں اندھیرے کی ہو جائیں۔“

”ساری رات جاگتا رہا ہوں.....!“ حمید آہستہ سے بولا۔ ”ہو سکتا ہے مجھے تمہارے کی بھی ضرورت ہو۔“

”میں نہیں سمجھا۔“

”میرے قدم لڑکھڑا رہے ہیں۔ مجھے سہارا دے کرو ہاں تک پہنچاؤ۔“

”کیا کوئی نیا حکم ہے۔“

”یقیناً..... ورنہ مجھے بھی کیوں آنا پڑتا اور پھر یہی نہیں یہ حکم بھی حالات کا رخ معلوم نے کے بعد ہی تم تک پہنچایا جاسکتا ہے۔ ورنہ میں یونہی واپس جاؤں گا۔“

”بہتر ہے..... آئیے.....!“ اُس نے حمید کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

”کچھ دور چلنے کے بعد حمید کی آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو گئیں۔“

”میں نہیں سمجھ سکتا۔“ حمید کا ساتھی بڑبڑا رہا تھا۔ ”اب کیا حکم ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ بھی سنئے ہمارے پاس ایک شکار بھی ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“

”فزارو میں ٹھہری ہوئی ایک ایرانی لڑکی..... جو ہمارا تعاقب کر رہی تھی۔“

”خوب..... ہاں..... فزارو میں ہے ایک لڑکی..... میں نام نہیں جانتا۔“ حمید سر کھجاتا ہوا

”میرا قیام بھی وہیں ہے۔“

”اوہ تو آپ..... لیکن آپ ہسپتال میں تو نہیں تھے۔“

”بتایا تاکہ میں بچپلی رات دھام نگر طلب کر لیا گیا تھا.....!“ حمید نے کہا اور سوچ میں لیا کہ آخر اس نے ہسپتال کا حوالہ کیوں دیا؟ انہیں اس کا علم تھا کہ پچھلے دن وہ اجنبی ہسپتال میں بیہوش پروفیسر اور اس کی نگرانی کرتا رہا تھا۔ لیکن شاید یہ آدمی اُس اجنبی کو صورت سے نہیں پہچانتا ورنہ ہسپتال کا نام نہ لیتا۔

بہر حال حمید اس کے ساتھ چلتا رہا۔ زیادہ دور نہیں چلا تھا لیکن راستہ اتنا دشوار گزار تھا کہ مسافت کی طوالت کا احساس ہوتا تھا۔

اور پھر ایک جگہ تیز روشنی کی ایک کرن نظر آئی۔ چٹان کے کسی رخسہ سے غالباً لیمپ کی روشنی پھوٹ رہی تھی۔

حمید نے سوچا ممکن ہے وہاں کوئی ایسا مل جائے جو اُس اجنبی کو پہچانتا رہا جائے گا۔ اس کے زیر بغل ہولٹر میں بھرا ہوا ریوالور موجود تھا۔

دو عدد پیٹرولیکس لیمپوں سے غار کا یہ حصہ پوری طرح روشن تھا۔

حمید مونا چنگیزی کو دیکھ کر چونک پڑا۔ دو آدمیوں کے درمیان سبھی کھڑی تھی اور نے یاسمین تزلہاش کا بازو پکڑ رکھا تھا۔

حمید کی آمد پر وہ سب ہی چونکے تھے۔ لیکن دونوں لڑکیوں کے چہروں کے ہنار سے مختلف تھے۔ مونا نے متحیرانہ انداز میں منہ کھولا تھا اور پھر بند کر لیا تھا۔ یاسمین کی آہ میں چمک سی لہرائی تھی۔

گہرے سناٹے کو توڑتے ہوئے حمید نے کہا۔ ”آپ لوگ اپنا کام جاری رکھیں۔“
تینوں نے سوالیہ انداز میں اُس آدمی کی طرف دیکھا جو حمید کو یہاں تک لایا تھا۔
نیا حکم لائے ہیں۔“ اس نے جمائی لے کر کہا۔

”اور وہ حکم حالات کے تحت ہے۔“ حمید جلدی سے بولا۔ ”آپ لوگ اپنا کام جاری رکھیں۔“
وہ کوشش کر رہا تھا کہ مونا سے نظر نہ ملنے پائے۔

”ہم اس سے پوچھ رہے ہیں کہ اُس نے میجر سعید نامی آدمی کو کیا بتایا ہے۔“
اسے ایک بولا۔

”ٹھیک ہے۔ اگر اس نے نہ بتایا تو میں تم تک دوسرا حکم پہنچا دوں گا۔“ حمید نے
سے پائپ اور تمباکو کی پاؤچ نکالی۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ یاسمین اُسے عجیب نظروں
گھورے جا رہی تھی۔

”اور یہ ہمارا تعاقب کر رہی تھی۔“ دوسرے نے یاسمین کی طرف اشارہ کر کے کہا۔
”خاصی ہے۔ اسے میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔“ حمید نے لا پرواہی سے کہا۔

”تم.....!“ دفعتاً ایک آدمی اس کی طرف مڑا۔ ”تم کون ہو؟“

”کیا یہ سوال ضابطے کے مطابق ہے۔“ حمید غرایا۔

”اور اظہار خیال کا یہ انداز کہاں تک درست ہے۔“

”خیر..... خیر..... یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ تم اپنا کام جاری رکھو۔“

مونا نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا رکھا تھا اور چہرے پر اندرونی کشمکش کے آثار تھے۔

”یہ کچھ نہیں بتاتی۔“

”بتائے گی۔“ حمید نے پائپ اور پاؤچ کو دوبارہ جیب میں رکھتے ہوئے کہا اور بغل کے

نیچے ہاتھ لے جا کر ریوالور نکال لیا۔

”بتاؤ..... تم نے میجر سعید کو کیا بتایا تھا۔“ حمید نے ریوالور کا رخ مونا کی طرف کرتے
ہوئے کہا اور پھر فائر بھی کر دیا۔

وہ چیخ مار کر لہرائی اور ادھر ادھر کھڑے ہوئے آدمیوں نے اُسے ہاتھوں پر سنبھال لیا۔

”یہ..... یہ..... کیا.....!“ تیسرا آدمی ہکھلایا۔

”خاموش رہو.....!“ حمید کا لہجہ اتنا ڈراؤنا تھا کہ پھر کسی کے حلق سے آواز نہ نکلی۔ مونا کی

آنکھیں بند تھیں اور وہ آگے پیچھے بھول رہی تھی۔

گولی کا گزرا اُس کے سر سے کئی انچ اونچائی سے ہوا تھا۔

”سیدھی کھڑی کرو..... نشانہ خطا ہوا۔“ حمید زور سے دہاڑا اور مونا نے آنکھیں کھول

دیں۔ حمید کہہ رہا تھا۔ ”اس بار دل کا نشانہ لوں گا جو کبھی خطا نہیں کرتا..... بتاؤ..... تم نے میجر

سعید کو کیا بتایا تھا۔“

”مم..... میں نے۔“ وہ ہانپتی ہوئی بولی۔ ”یہی بتایا تھا کہ میرے ڈیڈی سکی ہیں۔ ہر

سال سردیوں میں یہاں آتے ہیں مجھے ہوٹل میں چھوڑ کر کئی کئی دن غائب رہتے ہیں۔ لیکن

مُنہ نہیں بتاتے کہ وہ اُن دنوں کہاں غائب رہتے ہیں۔“

”اور کیا بتایا تھا.....؟“

”اور کچھ بھی نہیں..... کچھ بھی تو نہیں..... رحم کرو میرے حال پر۔“

”ٹھیک ہے۔“ حمید نے ریوالور والا ہاتھ جھکاتے ہوئے کہا اور پھر فاتحانہ انداز میں چاروں کی طرف دیکھ کر بائیں ہاتھ سے جیب میں پڑے ہوئے پائپ کو مٹولنے لگا۔

”اس طرح تو ہم بھی.....!“ ایک بولا۔

”عقل چاہئے..... کام کرنے کیلئے..... خیر..... اب میں ان دونوں کو اپنے ساتھ لے جاؤں! اُن چاروں میں سے کوئی کچھ نہ بولا۔ اب حمید یا سمین کی طرف متوجہ نظر آنے لگا۔

نے انگریزی میں مخاطب کیا۔

”میں نے تمہیں فرارو میں دیکھا تھا۔“

”ہاں میں وہیں مقیم ہوں.....!“ غصیلی آواز میں جواب ملا۔

”ان لوگوں کا تعاقب کیوں کیا تھا۔“

”دماغ خراب ہو گیا ہے تم لوگوں کا۔ میں تعاقب کیوں کرنے لگی۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔ انہیں غلط فہمی ہوئی تھی۔ میں نے سنا ہے کہ تم مصنفہ ہو۔“

”تم نے غلط نہیں سنا۔“ نہایت غصے کے عالم میں جواب دیا گیا۔

”ایرانی ادب میں جمود تو نہیں ہوا.....!“

”جمود..... جمود کیوں ہوتا ہے۔“

”یہ بڑی اچھی بات ہے۔ ہمارے یہاں تو بالکل ہو گیا ہے۔ عالم یہ ہے کہ آج

بڑے بڑے شاعر اور انشاء پرداز خواتین کے ساتھ بیٹھے آلو پھیلا کرتے ہیں۔“

”تم کیا بکواس کر رہے ہو۔ مجھے جانے دو ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔“

”مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ سب اچھا ہی اچھا ہوگا۔ لیکن ایک بات ہے ان لوگوں۔“

غلطی ہوئی ہے اس کا تذکرہ کسی سے بھی نہ کرنا۔ محض اس لئے تمہارے ساتھ یہ رعایت ہے غیر ملکی ہو اور تمہیں ہمارے معاملات سے سروکار نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی مقامی آدمی کو ہم نے

سے بھی اس طرح روکا ہوتا تو زندہ واپس نہ جانے دیتے۔“

یاسین ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔

”تم نے بھی مجھے فرارو میں دیکھا ہوگا۔“ حمید نے کہا۔

”مجھے دھیان نہیں۔“

”اور آئندہ بھی دیکھو گی۔ لیکن تمہاری زبان بند رہنی چاہئے۔ اس تکلیف دہی کے سلسلے

میں تمہاری خدمت میں کوئی بڑا تحفہ پیش کریں گے۔“

”مجھے ضرورت نہیں ہے۔“ وہ مداسانہ بنا کر بولی۔

”نت..... تو آپ انہیں لے جائیں گے۔“ ایک آدمی نے پوچھا۔ حمید جواب میں کچھ

نہی والا تھا کہ ایک آدمی غار کے دہانے کی طرف سے اس کے سامنے آگرا۔ پھر وہ اٹھ ہی رہا

ما کہ حمید نے اُسے پہچان لیا۔ یہ وہی آدمی تھا جس نے سڑک پر اُسے اس غار کا راستہ بتایا تھا۔

اس کے فوراً بعد ہی ایک گونجیلی آواز سنائی دی۔ ”اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔“

ایک دراز قد آدمی دہانے کے قریب ٹامی گن سنبھالے کھڑا تھا۔

حمید کے ہاتھ بھی غیر ارادی طور پر اوپر اٹھتے چلے گئے۔ ریوالور تو وہ پہلے ہی ہولسٹر میں

لٹکا ہوا تھا۔

”میجر سعید کے علاوہ اور سب اپنے ہاتھ گرا دیں۔“

حمید نے سوچا شاید یہ بھی اُسے نہیں پہچانتا۔ اس لئے یہ نفسیاتی طریقہ اختیار کیا۔ لہذا

سب کے ساتھ ہی اُس نے بھی اپنے ہاتھ گرا دیئے۔

”میجر سعید.....!“ ٹامی گن والا غرایا۔

حمید اب بھی دوسروں ہی کی طرح انجان بنا کھڑا رہا۔

”میں تم سے کہہ رہا ہوں۔ کیا تم نے سنا نہیں۔“ اس بار اُس نے خاص طور پر حمید کی

طرف ٹامی گن کی نال گھمادی۔

”گھاس تو نہیں کھا گئے۔“ حمید نے جی کڑا کر کہا۔

”میں تم لوگوں سے کہہ رہا ہوں کہ یہ میجر سعید ہے اس کے ہاتھ پیر باندھ کر ڈال دو۔“

”تم کون ہو۔“ اُن میں سے ایک آدمی نے پوچھا۔

”میں تم ہی میں سے ایک ہوں۔“

”لہلہ..... لیکن..... یہ بھی تو..... ٹائی پن.....!“

”سب فراڈ ہے۔ تم اسے باندھ لو۔ کیوں لڑکی۔ بتاؤ یہ کون ہے ورنہ تمہارا جسم بچر رہ جائے گا۔“ اُس نے مونا کو مخاطب کیا۔

”مم..... میں نہیں جانتی۔“

”تم کہتی ہو۔ اچھی طرح جانتی ہو کہ یہ میجر سعید ہے۔“

مونا کچھ نہ بولی۔ اب وہ بہت زیادہ خوفزدہ نظر آرہی تھی۔ حمید کے فائر پر بھی اس کے چہرے پر اتنی مردنی نہیں چھائی تھی۔

”بتاؤ..... ورنہ ٹریگر پر دباؤ ڈالتا ہوں۔“ وہ پھر غرایا۔ اب ٹائی گن کا رخ مونا

طرف تھا۔

مونا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”دیکھو.....!“ اُس نے دوسروں سے کہا اور وہ حمید پر ٹوٹ پڑے۔

”نہیں..... احتیاط سے..... صرف باندھ لینا ہے۔ ہم دیکھیں گے کہ یہ کون ہے۔“

میجر سعید..... ہوش میں آؤ..... ورنہ ہمیشہ کے لئے اپنا بیچ ہو جاؤ گے۔“

یاسمین کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے۔ لیکن وہ دم بخود کھڑی رہی۔ مونا بڑی

کانپ رہی تھی۔ ذرا ہی سی دیر میں انہوں نے حمید کے ہاتھ پیر ٹائیوں سے باندھ دیے۔

”اب تم سب میرے ساتھ چلو گے..... اوہ..... یہ..... دوسری لڑکی کون ہے۔“

والے نے پوچھا۔

”یہ ایک ایرانی سیاح ہے..... فزارو میں ٹھہری ہوئی ہے اس نے ہمارا تعاقب کیا تھا۔“

”کیوں.....؟ تم نے ان کا تعاقب کیا تھا۔“

”یہ نہیں۔ تم کیا پوچھ رہے ہو۔“ یاسمین نے انگریزی میں کہا۔ ”میں تمہاری زبان نہیں

”کیا تم نے ان لوگوں کا تعاقب کیا تھا۔“ اس بار اس نے انگریزی میں سوال کیا۔

”یہ سراسر بکواس ہے۔ میں یہاں بغرض تفریح آئی ہوں۔ ایک گاڑی کرائے پر حاصل

ہے اور ادھر ادھر گھومتی پھرتی ہوں۔ آج اتفاقاً ادھر نکل آئی تھی۔ میرے ساتھ بہت بُرا

نہ ہوا ہے۔ میں اپنے سفارتخانے سے شکایت کروں گی۔“

”اگر تم مجھے اطمینان دلا سکیں کہ تم سچ سچ غیر ملکی ہو تو ہم تمہیں جانے دیں گے ورنہ پھر

نہوچنا پڑے گا۔“

”میرا پاسپورٹ گاڑی میں موجود ہے۔“

”اچھی بات ہے یہ بھی دیکھ لیں گے۔“ ٹائی گن والے نے کہا پھر دوسروں سے بولا۔

”اٹھا کر گاڑی تک لے چلو۔“

اشارہ حمید کی طرف تھا۔

اس منٹ بعد وہ سڑک پر تھے۔ گاڑیوں میں ایک اور اضافہ ہو گیا۔ ٹائی گن والے نے

اُن ہدایت دی تھی کہ وہ حمید کو اس کی گاڑی میں ڈال دیں۔ پھر اُس نے یاسمین سے

پوٹ طلب کیا تھا۔

حمید اُس کی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر پڑا سوچ رہا تھا شاید یہ آخری سفر ثابت ہو۔ مونا کو وہ

فحش لے جا رہا تھا۔ یہ نہیں اب کن لوگوں سے سابقہ پڑے۔ یہ آدمی اُسے پہچانتا تھا ورنہ

اُن دونوں کو تو لے ہی نکلا تھا۔

دفعتاً اس نے اسی آدمی کی آواز سنی۔ ”لڑکی کو میری گاڑی میں بٹھا دو۔“

پھر اس نے دیکھا کہ مونا انگلی سیٹ پر بیٹھ رہی ہے۔

”تم سب میرے پیچھے آؤ۔“ اسی آدمی نے دوسروں سے کہا۔

”لیکن جناب آپ نے کیسے یقین کر لیا کہ وہ واپس پہنچ کر پولیس کو اطلاع دے گی۔“

اُس نے پوچھا۔

”جنہم میں جائے جتنی دیر میں وہ پولیس تک پہنچے گی ہم نہ جانے کہاں ہوں گے۔ چلو

بیٹیا اس سے۔ بہر حال تم خود ہی دیکھ لو کہ وہ اپنے آپ بڑی خوشی سے موت کے منہ میں چلے رہے ہیں۔ تمہیں تھوڑی بہت چوٹیں ضرور کھانی پڑی ہیں..... لیکن یہ آسانی ان چوٹوں سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔ کیا خیال ہے تمہارا۔“

حمید کچھ نہ بولا۔ کھوپڑی ایک بار پھر ناچ گئی تھی۔ بالکل سامنے کی بات تھی لیکن اس کی بچہ میں نہ آسکی۔ فادر ہارڈ اسٹون کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ سچ جج اگر دو ایک کو بی بیٹہ پر لا کر چڑھائی چڑھتی پڑتی تو اس وقت وہ بے دم پڑا ہوتا۔

فریدی پھر بولا۔ ”میں نے تمہیں اس لئے طلب کیا تھا کہ مونا سے حاصل کی ہوئی سلطنت مجھ تک پہنچ سکیں۔ جب تمہیں دیر ہوئی تو خود چل پڑا۔ یہاں تمہاری گاڑی نظر آئی۔ اب آدمی ان گاڑیوں کی نگرانی کر رہا تھا۔ اُسے مجبور کیا کہ وہ سب کچھ اگل دے۔ اُسے راستہ اٹھانے کے لئے ساتھ لے جانا پڑا۔ لیکن وہاں اُن کی تعداد دیکھ کر اسکیم ہی بدل دینی پڑی۔ نہ رہاں تو تمہیں زیادہ چوٹیں تو نہیں آئیں۔“

”کھٹنے کے بعد جائزہ لوں گا۔“ حمید برا سامنے بنا کر بولا۔
گفتگواردو ہی میں ہوتی رہی تھی۔ بار بار مونا کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آتے اور وہ انہیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگتی۔

”یہ..... یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ کیا ہو رہا ہے۔“ وہ بالآخر ہڈیانی انداز میں بولی۔
”فکر نہ کرو..... اب کوئی پریشانی کی بات نہیں۔“ حمید نے کہا۔
”میرے ڈیڑی کا کیا حال ہوگا۔ تم لوگ آخر ہو کون۔“

”میں اپنے بارے میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں اور یہ شخص میرا فادر ہے۔ حالانکہ عمر میں مجھ سے تین یا چار سال سے زیادہ بڑا نہ ہوگا۔“

”مجھے ڈیڑی کے پاس پہنچا دو۔ خدا کے لئے رحم کرو۔“
”تمہارے ڈیڑی ہر طرح محفوظ ہیں۔“ فریدی بولا۔ ”لیکن اگر اب تم واپس گئیں تو تمہارا انجام بھی سارہ رحمان کے انجام سے مختلف نہ ہوگا۔“

بیٹھوا اپنی گاڑی میں..... اور ہاں ایک آدمی میجر سعید کی گاڑی کو سنبھالے گا۔“
پھر حمید نے اُسے اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھتے دیکھا۔ انجن اشارت ہونے کی اور گاڑی چل پڑی۔

عقب نما آئینہ وڈ اسکرین کے اوپر لگا ہوا تھا۔ حمید اس میں پیچھے آنے والی دونوں کو دیکھتا رہا۔ تیسری یا سیمین کی گاڑی کہیں نہ دکھائی دی۔

حمید مونا کا چہرہ بھی دیکھ سکتا تھا۔ وہ بار بار مرکز اُس کی طرف دیکھتی تھی۔ آگم عجیب سی غم آلود نرمی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنی غلطی پر تادم ہو۔

”تم دونوں اگر چاہو تو گفتگو بھی کر سکتے ہو۔“ ڈرائیو کرنے والا دفعتاً بولا اور کھوپڑی ناچ کر رہ گئی۔ سخت غصہ آیا۔ دل چاہا کہ چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھالے فریدی ہی کی آواز تھی۔

حمید کو وہ رگڑے اور گھسے یاد آئے جو ان لوگوں نے اُسے باندھتے وقت دیئے تھے۔ ”ارے..... تم کچھ بول نہیں رہے۔ میجر سعید۔ حالانکہ بہت خوش مزاج مشہور ہو۔“
”میجر سعید کی ایسی کی تیسری..... میں نہیں سمجھ سکتا۔“ وہ اس سے زیادہ نہ کہہ سکا۔
”خفگی کی وجہ پر خوردار.....!“

”کیا میں گدھا ہوں۔“ حمید نے حلق پھاڑنے کی کوشش کی لیکن غصے کی زیادتی اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی۔
”گدھے تو ہو لیکن اچھی نسل کے.....!“

”میں مونا کو نکال لاتا.....!“ حمید نے بدستور خوشگوار لہجے کو برقرار رکھا۔
”تم صرف مونا کو نکال لاتے..... اور میں ان پانچوں کو بھی اپنے ساتھ لے جا رہا

عقل استعمال کرنا سیکھو فرزند..... اگر ہم انہیں باندھ لیتے تو کتنی مشقت برداشت کرنی اپنی پشت پر لا کر اتنی چڑھائی طے کر کے سڑک تک پہنچنا پڑتا۔ پھر ڈرائیو کرنے والے ہوتے اور گاڑیاں تین تھیں۔ ظاہر ہے کہ سڑک پر کوئی گاڑی چھوڑی نہ جاسکتی۔ خواہ

”سارہ رحمان۔“ وہ کانپ کر رہ گئی۔

”یہ تمہارا وہم بھی ہو سکتا ہے۔“

”اے..... دوسری بات..... نہیں بلکہ میرا دعویٰ ہے کہ وہ رضیہ کے علاوہ اور کوئی نہیں

دیتی۔“

”کون رضیہ.....؟“

”وہی جو ہمارے درزی خانے کی روح رواں تھی۔“

”گھاس تو نہیں کھا گئے۔“

”آپ نے وہاں اسے دیکھا تھا۔“

”نہیں۔“

”تو پھر میرے حواس خسہ پر اعتماد کیجئے۔ وہ سو فیصد رضیہ ہے۔“

”اگر یہ بات ہے تو پھر دیکھنا پڑے گا۔“ فریدی کے لہجے میں تشویش تھی۔ پھر اس نے

بکیر بعد پوچھا۔ ”تم نے اُس پر یہ تو نہیں ظاہر کیا کہ اُسے پہچانتے ہو۔“

”نہیں..... میں نے کافی احتیاط برتی ہے۔“

”یہ بڑی اچھی بات ہے۔“

پھر وہ خاموش ہو گئے۔ نالے کے پل کے قریب پہنچ کر انہوں نے پچھلی گاڑیوں سے

پارے بارن کی آوازیں سنیں۔

”کیا قصہ ہے۔“ فریدی بڑبڑایا۔

عقب نما آئینے میں اُن دو گاڑیوں کے علاوہ اور کسی تیسری گاڑی کی جھلک بھی نہ دکھائی دی۔

فریدی نے اپنی گاڑی سڑک کے کنارے لگا کر کھڑی کر دی۔

پچھلی دونوں گاڑیاں بھی رک گئی تھیں۔ ایک آدمی اتر کر فریدی کی گاڑی کے قریب آیا۔

”صاحب..... ہم یہ پل کراس نہ کر سکیں گے۔“ اس نے کہا۔

”ہاں..... ہاں..... میں جانتا ہوں..... لیکن یہ میرا حکم ہے۔ باس کے لیفٹیننٹ حسب

ضرورت ان احکامات میں تبدیلیاں بھی کر سکتے ہیں۔“

ہنسی اور دستانے

سارہ رحمن کے انجام کے حوالے پر مونا کی حالت بگڑنے لگی تھی۔

حمید نے نرم لہجے میں کہا۔ ”ہم پر اعتماد کرو۔ تمہیں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

ہسپتال واپس جانے کی صورت میں شاید تم اپنے ڈیڈی کے لئے بھی خطرہ بن جاؤ۔“

مونا کچھ نہ بولی۔ ایک بار پھر اُس کے چہرے پر زردی دوڑ گئی تھی۔ ہونٹ خشک

تھے۔ گاڑی تیز رفتاری سے راستہ طے کرتی رہی۔ دفعتاً حمید کو یاسمین قزلباش یاد آئی۔

”اوہو..... آپ نے اُسے کیوں نکل جانے دیا۔“ وہ بول پڑا۔

”کس کی بات کر رہے ہو۔“

”یاسمین قزلباش کی۔“

”اوہو تو اسے کیا کرتا..... وہ ایک ایرانی ہے۔“

”جناب..... جناب..... سب سے پہلے تو یہ گزارش ہے کہ وہ ایرانی نہیں۔ قطعاً

بہیں کی باشندہ ہے یہ اور بات ہے کہ وہ ایرانیوں کے سے لہجے پر قدرت رکھتی ہو۔

آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ وہ بھی مونا کا تعاقب کرتی رہی ہے۔“

”نہیں.....!“ مونا اچھل پڑی۔

”یقین کرو..... میں نے دیکھا ہے۔ اس شام کو بھی وہ تمہارا تعاقب کرتی ہوگی۔

آئی تھی۔ جب فزارو کے کچن میں آئل اسٹوو پھٹنے سے دھماکا ہوا تھا۔“

”مجھے اس کا علم نہیں ہے۔“

”میں نے دیکھا تھا.....!“

مونا اور حمید کے علاوہ اور سب گاڑیوں سے اتر آئے تھے۔ یہاں کچھ عجیب سی چٹانیں

نہیں اور یہ راستہ عام سڑک سے ہٹ کر تھا۔

”نیکار کو اٹھا کر میرے ساتھ چلو۔“ فریدی نے شکاریوں سے کہا اور وہ حمید کو کھینچ کھانچ کر باہر نکالنے لگے۔

حمید بہت بُرے لہجہ میں کہہ رہا تھا۔ ”دیکھنا تم لوگ اپنا انجام..... رونا چاہو گے لیکن آنسو نہیں گے۔ چیخنا چاہو گے لیکن حلق بند ہو جائیں گے۔“

ان میں سے کوئی کچھ نہ بولا۔ فریدی مونا کا ہاتھ پکڑے دو چٹانوں کے درمیان درے میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ سب حمید کو کاندھوں پر اٹھائے اس کے پیچھے چلتے رہے۔

راستہ دشوار گزار تھا۔ حمید کو خدشہ تھا کہ اُن میں سے کہیں کوئی لڑکھڑا کر گر نہ پڑے۔

بہر حال وہ اپنے ہاتھ پاؤں کی سلامتی کی دعائیں مانگتا ہوا ان کے کاندھوں پر سفر کرتا رہا۔ کچھ دور چلتے کے بعد فریدی نے ایک جگہ ٹھہرنے کو کہا۔

یہاں بھی ایک غاری سے سابقہ پڑا تھا۔ فریدی نے ٹارچ روشن کی اور وہ سب غار کے اندر داخل ہو گئے۔ قدموں کی چاپوں سے گونجتا ہوا تاریک غار کچھ عجیب سا ماحول پیدا کر رہا تھا۔

لیکن یہ تاریکی جلد ہی غائب ہو گئی۔ اب وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں کئی پیٹرو میکس بے روشن تھے۔ دو تین آدمی بھی پہلے سے موجود تھے۔

انہوں نے بڑے بے تعلقانہ انداز میں ان کا استقبال کیا تھا۔

حمید کو انہوں نے زمین پر ڈال دیا۔ حمید کو بے ساختہ برف کے بھوتوں کے کیس والے غار یاد آ گئے۔ وہ سوچ رہا تھا کہیں یہ بھی انہیں غاروں میں سے نہ ہوں۔ جنہیں انسانی ہاتھوں نے تراشا تھا اور جہاں زمانہ قدیم میں بدھ بھکشو رہا کرتے تھے۔

یہاں گھٹن کا احساس نہیں تھا۔

غٹنا فریدی نے انہیں لوگوں سے کہا۔ ”اب اسے کھول دو۔“

”آپ جانئے۔“

”میں یہ اپنی ذمہ داری پر کر رہا ہوں۔“ فریدی نے لاپرواہی سے کہا۔ ”جاؤ.....“

اس نے پھر انجن اشارٹ کیا۔ وہ آدمی گاڑی کے پاس سے ہٹ گیا تھا۔

گاڑی چل پڑی۔ اُس نے بھرتوتالے کے اس پل کو بھی پار کر لیا جو ٹیکم گڈھ اور

کو منسلک کرتا تھا۔ حمید عقب نما آئینے میں پچھلی گاڑیوں کو دیکھتا رہا۔

”میرا کیا حشر ہونے والا ہے۔“ مونا بڑبڑائی۔

”مطمئن رہو بے بی..... تم بالکل محفوظ ہو.....!“ فریدی نے کہا۔

”میں ڈیڑی کے لئے پریشان ہوں..... یہ کیسی بیہوشی ہے۔“

”میں تمہیں اطمینان سے بتاؤں گا۔ فکر نہ کرو۔ میں پروفیسر کی حفاظت کی ذمہ داری

لے سکتا ہوں۔“

”آپ لوگ کون ہیں.....؟ خدا را بتائیے۔“

”کیا تمہیں میری باتوں پر یقین نہیں آیا تھا۔“ حمید بولا۔

”میں نے تو آج تک نہیں دیکھا کہ دوستی کے لئے کسی نے اتنا کچھ کیا ہو۔“

”ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ بہت کچھ دیکھو گی۔“

”سنجیدگی سے گفتگو کرو مجر سعید۔ میں بہت پریشان ہوں۔“

”اور میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ تھوڑی سی عقل بھی استعمال کرو۔“

”میں کیا کروں.....؟ میری سمجھ میں نہیں آتا۔“

”فی الحال خاموش رہو۔“ حمید بولا۔ ”مجھے دیکھو کتنے صبر و سکون کے ساتھ اتنی

بندھا پڑا ہوں۔“

گاڑیوں نے ٹیکم گڈھ میں داخل ہو کر تقریباً دو ڈھائی میل کا فاصلہ طے کر لیا تھا

ایک جگہ فریدی نے ہاتھ باہر نکال کر پچھلی گاڑیوں کو رکنے کا اشارہ کیا اور خود بھی رفتار کم

گاڑی روک دی۔

نے اُس سے پوچھا۔

”نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔“

”سارہ رحمان کے بارے میں کچھ۔“

”میں سب کچھ انہیں بتا چکی ہوں۔“ مونا نے حمید کی طرف دیکھ کر کہا۔

”میں اپنے طور پر کچھ سوالات کروں گا۔“

”پوچھئے۔“

”تم اُسے کب سے جانتی تھیں۔“

”ہم ساتھ ہی پلے بڑھے اور جوان ہوئے تھے۔ مسٹر رحمان میرے ڈیڈی کے گھرے

نوں میں سے تھے۔ چونکہ اُن کی مصروفیات کچھ اس قسم کی تھیں کہ سارہ کی تربیت پر دھیان

دے سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اسے بھی ہمارے ہی گھر بھیج دیا تھا۔ میرے ڈیڈی

اُسے تعلیم دلوائی اور اُسے اس قابل بنایا کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکے، اسی دوران میں

رحمان کا انتقال ہو گیا۔ انہوں نے سارہ کے لئے معقول رقم چھوڑی تھی۔“

مونا خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی۔

”اُس نے اپنا انڈسٹریل ہوم کب قائم کیا تھا۔“ فریدی نے پوچھا۔

”پانچ سال پہلے کی بات ہے۔“

”کاروبار کیسا چل رہا تھا۔“

”بہت اچھا..... نصیر آباد کے اونچے طبقے میں اُس کے یہاں کا کام بہت مقبول تھا۔“

”تم نے ان پانچ برسوں کے دوران میں کوئی خاص تغیر محسوس کیا تھا اس میں۔“

”تغیر.....!“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گئی۔ چند لمحے خلاء میں گھورتی رہی پھر

رائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”میں نے اُس میں کئی قسم کے تغیرات محسوس کئے تھے۔ کاروبار

اُٹا ہونے کے دو سال بعد تک وہ معمول کے مطابق ہی نظر آتی رہی تھی۔ لیکن اس کے بعد

اُس نے اُسے ہمیشہ ایک اعصاب زدہ لڑکی ہی کے روپ میں دیکھا۔ ذرا سی آواز پر اس طرح

”ہمیں کتنی دیر بٹھرتا ہوگا۔“ اُن میں سے ایک نے پوچھا۔

”کیا مطلب.....؟“

”مطلب یہ کہ ہم کتنی دیر بعد واپس جائیں گے اور یہاں کس مقصد کے تحت لائے گئے۔“

”واپسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”کیا مطلب.....؟“

اس سوال کے جواب میں فریدی نے ٹامی گن سیدھی کر لی اور ان آدمیوں کو

کر کے بولا جو وہاں پہلے سے موجود تھے۔ ”اب ان کے جھکڑیاں لگا دو۔“

جھکڑیوں کے نام پر بھی چونک پڑے تھے۔

”جس نے بھی اپنی جگہ سے جنبش کی وہ ڈھیر ہوا۔“ فریدی نے ٹامی گن کو جنبش دے

پھر دیکھتے ہی دیکھتے اُن کے جھکڑیاں لگ گئی تھیں۔

اب حمید بھی ان کی طرف سے اتالا پر واہ نظر آ رہا تھا جیسے پہلے انہیں کبھی دیکھا ہی

”یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ ہم تو نہیں سمجھ سکتے۔“ قیدیوں میں سے ایک نے کہا۔

لیکن فریدی نے اُسے کوئی جواب دینے کی بجائے اپنے آدمیوں سے کہا۔ ”انہیں لے

کچھ دیر بعد غار کے اُس حصے میں صرف حمید فریدی اور مونا ہی رہ گئے؟

”بیٹھ جاؤ۔“ فریدی نے مونا سے کہا۔ ”تم بھوکى ہوگی۔“

مونا نے نفی میں سر ہلا دیا۔ چند لمحے سر جھکائے کچھ سوچتی رہی پھر بولی۔ ”جھکڑیاں

صرف پولیس والے ہی استعمال کرتے ہیں۔“

”تم اس فکر میں نہ پڑو۔ میں پروفیسر کی حفاظت کا انتظام بھی کر چکا ہوں۔ یہ بہت

ہوا کہ تم اس طرح ہم لوگوں تک آ پہنچیں۔“

”ورنہ کیا ہوتا..... ورنہ کیا ہوتا۔“

”آپ اس بے چاری کو فی الحال آرام ہی کرنے دیجئے۔“

”کیا واقعی تم اتنی تھکن محسوس کر رہی ہو کہ میرے سوالات کے جواب نہ دے

مونا کچھ دیر تک خاموش رہی پھر بولی۔ سارہ ایک لڑکے کو چاہتی تھی۔ اس بُری طرح کہ خروبی اُس کی تباہی کا باعث بھی بن گیا۔ اگر وہ درمیان میں نہ ہوتا تو سارہ بھی آج زندہ نہ ہوتی۔ وہ خاموش ہو گئی۔ فریدی نے بات کو آگے بڑھانے کے لئے کچھ نہ کہا۔ تھوڑی دیر بعد فریدی بولی۔ ”جس زمانے میں وہ بہت زیادہ نروس نظر آنے لگی اکثر کہا کرتی تھی کہ واجد اُسے بہت بڑے جنجال میں پھنسا دیا ہے۔ لیکن اس کی وضاحت اُس نے کبھی نہیں کی۔“

”ایک منٹ۔“ فریدی ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”واجد کون تھا.....؟“

”نصیر آباد کی کسی فرم کا پرچیز آفیسر تھا۔ فرم کا نام مجھے یاد نہیں۔ اتنا جانتی ہوں کہ وہ اندر آمد کا کاروبار کرتا ہے۔“

”اُن کی دوستی انڈسٹریل ہوم قائم ہونے سے پہلے ہوئی تھی یا بعد میں۔“

”بعد میں۔“

”یہ یقین کے ساتھ کیسے کہا جاسکتا ہے۔“

”سارہ نے مجھ سے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی۔ اگر اُن کی دوستی پہلے ہوئی تھی تو مجھے اُس بارے میں کئی سال بعد کیوں بتاتی۔“

”بہر حال جب سے اُس نے اپنی اُس پریشانی کا تذکرہ کیا تھا میں نے اُسے کبھی خوش نہ دیکھا۔ ہر وقت کسی سوچ میں گم رہتی تھی۔“

”اس کے بعد سے اُن دونوں کے تعلقات میں بھی فرق آیا ہوگا۔“

”نہیں ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ بُری طرح جان دیتی تھی اُس پر۔ اگر کسی دن اس سے بات نہیں ہوتی تھی تو وہ پاگلوں کی طرح شہر کی گلیوں کی خاک چھانٹی پھرتی تھی۔“

مونا خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس اجمال کے لئے تفصیل تیب دے رہی ہو جسے کبھی ہوئی بات کے لئے بطور دلیل پیش کر سکے۔

”مجھے حیرت ہے۔“ حمید بڑبڑایا۔ ”کم از کم میں تو کسی ایسی ہستی کا وجود برداشت نہیں کر سکتا جو میرے لئے الجھن کا باعث بنے۔“

چونکہ پڑتی تھی جیسے قریب ہی کہیں ہم گرا ہو۔“

”تم نے اُس کی وجہ ضرور پوچھی ہوگی۔“

”یقیناً..... لیکن اس نے کبھی کوئی تشفی بخش جواب نہیں دیا تھا۔“

”کیا تم سچ بول رہی ہو؟“ فریدی اُس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا اور وہ ہلکا دوسری طرف دیکھنے لگی۔ فریدی کا لہجہ خوشگوار نہیں تھا۔

”اوہ..... تو تم نے مجھے بھی سچی بات نہیں بتائی تھی۔“ حمید نے اپنے مخصوص لہجے میں فرمایا۔

”میں کیا کروں..... میں کیا کروں۔“ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے بال نوچنے لگی۔

”قانون کے ہاتھ مضبوط کرو۔“ فریدی نے پرسکون لہجے میں کہا۔

”تو کیا..... آپ لوگ.....!“

”ہاں..... ہم قانون کے محافظ ہیں۔“

”میرے ڈیڈی..... میرے ڈیڈی۔“

”میں کہہ چکا ہوں کہ انہیں محفوظ سمجھو۔ البتہ قدرتی موت سے تو انہیں کوئی بھی نہ بچا سکے۔“

مونا کچھ نہ بولی۔ فریدی کہتا رہا۔ ”اپنے ذہن کو اُس کے لئے تیار کرو..... ورنہ کتنے

اچھے لوگ سارہ کی طرح موت کے گھاٹ اتر جائیں گے۔“

مونا پھر بھی خاموش رہی۔

”بہتر ہوگا کہ تم کچھ دیر آرام کرو۔“ حمید نے کہا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں اور اس کی ضرورت نہیں محسوس کرتی۔ بس آپ لوگ کسی ط

مجھے ڈیڈی کے پاس پہنچا دیجئے۔“

”جب تک وہ بھیڑیا آزاد ہے یہ نہ ہو سکے گا۔“ فریدی بولا۔ ”میں تمہارا خون اپنی گرا

پر نہیں لے سکتا۔“

”پھر میں کیا کروں۔“

اس سلسلے میں جو کچھ بھی جانتی ہو من و عن مجھے بتا دو۔ اسی میں سب کی بہتری ہے۔“

”معلوم ہوا کہ پروفیسر بھی اس جنجال سے الگ نہیں۔“
 ”میں کچھ نہیں جانتی۔ کچھ نہیں جانتی..... خدا کے لئے مجھ سے کچھ نہ پوچھئے۔“
 ”کیا تمہیں اپنے وطن سے محبت نہیں ہے۔“

”لیکن میں کیا جانتی ہوں جو آپ کو بتاؤں گی۔ ڈیڈی نے مجھے کبھی کچھ نہیں بتایا۔ وہ ہر ل سردیوں میں ہی رام گڈھ آتے ہیں۔ لیکن میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے جیسے کوئی نظر نہ نے والا پھندا ان کی گردن میں پڑا ہوا ہے اور وہ کشاں کشاں رام گڈھ کی طرف لے جائے رہے ہوں۔“

”یہ بھی نہیں بتایا تمہیں کہ ایسے سخت مزم میں یہاں آنے کا کیا فائدہ۔“
 ”وہ کیمسٹری کے پروفیسر ہیں۔ آئے دن طرح طرح کے تجربات کرتے رہتے ہیں۔ ایک تجربے کے لئے انہیں کئی سال سے ایک مخصوص درجہ حرارت کی ضرورت پیش آتی ہے۔ تجربہ ابھی تک مکمل نہیں ہوا۔ اس لئے انہیں سردیوں میں یہاں آنا پڑتا ہے۔“
 ”خوب.....!“ فریدی اسکی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔ ”پروفیسر نے تمہیں یہی بتایا ہے۔“
 ”جی ہاں۔“

”حالانکہ اس ترقی کے دور میں کوئی سا بھی درجہ حرارت حاصل کرنے کے لئے موسم یا سطحِ در سے بلندی کا متنبہ نہیں دیکھنا پڑتا..... کیا خیال ہے تمہارا.....!“
 ”میں تو میں بھی سوچتی رہی ہوں۔“

”لیکن تم نے کبھی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔“
 ”میں ڈیڈی کو غصہ دلانا پسند نہیں کرتی۔ اُن کے اعصاب کمزور ہیں۔“
 ”ویسے تم نے یہ تو محسوس ہی کیا ہے جیسے وہ جبراً دقیر آتے ہو۔“
 ”جی ہاں..... میں یہی محسوس کرتی رہی ہوں۔“
 ”اچھا..... اس تجربے سے پہلے بھی کبھی تم لوگ رام گڈھ آتے رہے ہو۔“
 ”جی نہیں..... میری اپنی یادداشت میں تو نہیں۔“

”آپ عورت نہیں ہیں۔“ مونا اُسے گھورتی ہوئی بولی۔

”عورتوں سے بھی بدتر۔“ فریدی نے سگار کا گوشہ توڑتے ہوئے کہا۔ ایسا معلوم جیسے وہ خود ہی موجودہ موضوع سے ہٹنے کی کوشش کر رہا ہو۔
 ”کسی عورت کی موجودگی میں تو میری توہین نہ کیجئے۔“
 ”تمہیں وہ عورت تو یاد ہی ہوگی فرزند جس نے تمہاری نازک کلائیوں کی شان میں کہا تھا۔“

حمید سمجھ گیا تھا کہ فریدی کسی مقصد کے تحت موضوع گفتگو بدلنا چاہتا ہے۔ لیکن اُ بات پسند نہ آئی کہ اس سلسلے میں وہ خود ہی نشانہ بنے۔
 ”جی ہاں..... جی ہاں۔“ اُس نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔
 ”اور وہ عورت بھی یاد ہی ہوگی جسے تمہارے شرم مانے کی ادا ایسی بھائی تھی کہ وہ تمہیں سنبھلی بنانے پر آمادہ ہوگئی تھی۔“

”وہ بھی یاد ہے۔“ حمید تنھیں پھلا کر بولا۔
 مونا اُسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔
 ”لہذا متحیر ہونا چھوڑ دو عورتوں کی باتوں پر۔“ فریدی سگار سلگاتا ہوا بولا۔
 ”بہت بہتر..... بہت بہتر۔“ حمید اس طرح سر ہلا کر بولا جیسے دیر سے اس ہدایت کو رہا ہو۔

”ہاں بے بی۔“ دفعتاً فریدی مونا کی طرف مڑ کر بولا۔ ”کیا سارہ نے اُس جنجال پھسایا تھا پروفیسر کو۔“

”س..... سارہ..... نہیں تو۔“ مونا گڑبڑا گئی۔ ”ل..... لیکن جنجال..... ڈیڈی تو کسی جنجال“
 ”یہ کسی طرح بھی تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ مجھے علم ہے کہ پروفیسر اُسے تم سے بھی زیادہ چاہتا“
 ”آپ..... آپ کیا جانتیں۔“
 ”..... علم ہے۔ لیکن پروفیسر کا دوسرا روپ حال ہی کی دریافت ہے۔ یہاں آنے

ہوا۔ پھر ایک بار اُس نے ہاتھ کہ میرا یہ پرس میرے لئے اپنی جان سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ کیونکہ اس میں وہ راز پوشیدہ ہے جو میرے واجد کے قاتل کو جہنم میں پہنچا دے گا۔“
فریدی جو اُسے پرستویش نظروں سے دیکھتا رہا تھا بولا ”اور تم یہ ساری باتیں پہلی بار بتا رہی ہو۔“

”نہیں..... انہیں بھی بتائی تھیں۔“ مونا نے حمید کی طرف دیکھ کر کہا۔
”اس کے علاوہ.....!“

”کسی کو بھی نہیں۔ حتیٰ کہ واجد کے بھائی ساجد کو بھی نہیں بتائیں۔ نہ جانے کیوں ا دیکھ کر مجھے غصہ آ جاتا تھا اور میں اپنے ہونٹ سی لیتی تھی۔“
”کیا یہی پرس تھا۔“ فریدی نے سارہ رحمان والا پرس جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

حمید نے اُسے نرمی طرح چوکتے دیکھا۔
”یہ..... یہ..... آپ کو کہاں سے ملا..... کہاں سے ملا۔“ وہ مضطربانہ انداز میں بولا
بے چینی سے فریدی کے جواب کی منتظر رہی۔

”تم اچھی طرح دیکھ کر بتاؤ کہ یہ وہی پرس ہے یا نہیں۔“
”یقیناً وہی ہے۔“ وہ اُسے الٹ پلٹ کر دیکھتی ہوئی بولی ”آپ کو کہاں سے ملا بتائیے؟“
”سارہ سے۔“

”اوہ..... میرے خدا..... وہ ہمدردوں کے درمیان پہنچ جانے کے بعد بھی زندہ نہ رہا۔“
”میں نہیں سمجھا۔“

”یقیناً..... آپ اس کے ہمدردوں میں سے ہیں۔ تبھی تو اُس کے لئے.....!“
”لیکن میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ پرس..... تم ہی بتاؤ..... بھلا اس میں کیا ہے۔ جب ہ ہاتھ آیا تھا تو اس میں چند سکوں کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا۔“

”جتنی بات میں نے اُس کی زبان سے سنی تھی آپ کو بتا دی۔ اس سے زیادہ“

کچھ نہیں جانتی۔“

فریدی چند لمحے خدائیں گھورتا رہا پھر بولا۔ ”واجد کے قتل کے سلسلے میں اُس نے پولیس کو کوئی بیان نہیں دیا تھا۔“

”یہی تو بڑی عجیب بات ہے..... اس معاملے میں اس کے بھائی ساجد کا رویہ بھی حیرت بزرہا ہے۔ اُس نے بھی تو پولیس کو اس سلسلے میں مطلع نہیں کیا کہ سارہ اس کے بھائی کے قتل متعلق کچھ جانتی ہے۔“

”خیر..... کچھ اور بتاؤ سارہ کے بارے میں..... ہاں تو اس نے قاتل کے متعلق اور کیا بتا۔“

”وہ نقاب پوش تھا..... چہرہ نہیں دیکھ سکی تھی اور کچھ دستانوں کا بھی تذکرہ تھا۔ دستانوں کا رکرتے ہوئے وہ پاگلوں کی طرح ہنسی بھی اور بڑی حقارت سے کہا اب میرے ہاتھوں سے کر کہاں جائے گا۔“
فریدی نے تشہیمی انداز میں سر کو جنبش دی۔

پہاڑ خانم

حمید پھر فزا رو کی طرف واپس جا رہا تھا۔ لیکن میک اپ میں نہیں تھا۔ اب اُسے حمید ہی کی ٹیٹ سے فزا رو میں قیام کرنا تھا۔ البتہ فریدی کی ہدایت تھی کہ وہ رجسٹر میں اصل نام اور پتہ نہ نہ کرائے۔

حمید سوچ رہا تھا۔ آخر اس کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اگر وہ میجر سعید کے میک اپ سب نہیں رہ سکتا تھا پھر کوئی دوسرا روپ اختیار کرنے کی ہدایت ملی تھی۔ آخر کھل کر سامنے ہانے کا کیا مقصد ہو سکتا تھا۔

”اوہو.....!“ اُس کے ہاتھ اسٹیرنگ پر سخت ہو گئے اور وہ بڑبڑایا۔ ”تو یہ بات نہ
نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے ہوئے وہ دنگ اسکرین پر نظر جمائے رہا۔

تو پھر ایک بار اُسے چارے کے طور پر استعمال کیا جانے والا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا۔
رحمان فریدی کی موجودگی میں قتل ہوئی تھی۔ مجرموں کو علم تھا کہ وہ فریدی سے ملنا چاہتی
پھر کیا مجرموں کو فریدی یا اُس سے متعلق لوگوں کی تلاش نہ ہوگی۔ اگر یہ بات نہ ہوئی تو
فریدی اتنی احتیاط سے کیوں کام لیتا۔

سارہ رحمان..... حمید نے طویل سانس لی۔ سارہ رحمان مر جانے کے بعد اور زیادہ
انگیز ثابت ہوئی تھی۔ بات کہاں سے کہاں پہنچی۔ اس کا پرس بہر حال الجھن کا باعث
تھا۔ لیکن آخر فریدی نے قاتل اور اس کے دستاویز کے تذکرے کے بعد خاموشی کیوں
کر لی تھی۔ مونا سے پھر مزید پوچھ گچھ کیوں نہیں کی تھی۔ خود حمید کے ذہن میں تو اس وقت
نئے سوالوں نے سر ابھارا تھا۔

فریدی نے مونا سے کہا تھا کہ اب اسے آرام کرنا چاہیے لیکن وہ مصر تھی کہ اُسے
بھجوا دیا جائے۔

بمبائل تمام حمید نے اُسے کم از کم دو دن کیلئے پروفیسر سے الگ رہنے پر آمادہ کیا تھا
کار تیزی سے راستہ طے کرتی رہی۔ یہ وہی کار تھی جس سے حمید نے صبح سڑک
فریدی نے اُس کی مختلف کنجیوں کے بارے میں اُسے بتاتے ہوئے کہا تھا ”تم اس
ضرورت کی ساری چیزیں پاؤ گے۔ بس اسے ذہن نشین کر لو کہ کنجی کہاں لگے گی۔“
اس کے بعد حمید کافی دیر تک کنجیوں سے متعلق مشق کرتا رہا تھا۔

اُسے اُن کھپاؤں کا خیال آیا جن میں ان دنوں فریدی کا قیام تھا۔ اسی جگہ وہ تھا
آٹھ تھیں۔ دو گھپاؤں میں قیدی تھے جن کی تعداد ڈیڑھ درجن کے قریب تھی۔ ان میں
صرف انہیں لوگوں کو پہچان سکا جنہیں پہلے دیکھ چکا تھا۔ بقیہ اسکے لئے اجنبی تھے۔ فریدی
اُسے ان کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

واپسی پر اسے سڑک پر صرف اپنی ٹوئیز کھڑی دکھائی دی تھی۔ دوسری گاڑیاں وہاں نہیں
میں۔ پھر اُس نے ان کے متعلق فریدی سے کچھ پوچھا ہی نہیں تھا۔ پوچھ کر کرتا بھی کیا۔
یدی سے تعلق رکھنے والی ہر بات حیرت انگیز تھی۔

حیرت ظاہر کرنے کے بعد اگر کسی سوال کا جواب نہ ملے تو ذہنی تھکن کچھ اور بڑھی سی
ہوئے لگتی ہے۔

اور پھر ذہنی تھکن کا خیال آتے ہی سچ مچ اُسے اپنے ذہن پر ایک بوجھ سامحوس ہونے
میں کوئی دھن نکالنے کے لئے ہونٹ سکڑے لیکن سمت مخالف کی تیز ہوائ نے آواز نہ
نہی۔

تب وہ اپنے ذہن کو ڈھیلا چھوڑ کر خوب صورت لڑکیوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ مایا
کی بی چال بڑی دلکش ہے لیکن جب تیزی سے چلتی ہے تو کسی قدر بھدی لگتی ہے۔

تہنہ سر کو پیچھے جھٹک کر مسکراتی ہے تو..... تو..... کوئی تشبیہ سوجھ نہ سکی اور وہ براہ راست
میں قزلباش کی طرف آ گیا۔ پھر رضیہ یاد آئی۔ وہ اسے پسند تھی۔ نفسیات کے سلسلے میں اس
جھیز چھاڑتی طور پر گراں گذرتی تھی لیکن پھر وہ اکثر اس کے بارے میں سوچا کرتا تھا۔

یاسین قزلباش..... اس نے طویل سانس لی۔ اگر وہ رضیہ ہی ہے تو اداکاری میں اپنا جواب
مارکتی۔ یہ بات اس نے پہلے بھی کئی بار سوچی تھی۔ اُسے خوشی تھی کہ اب وہ اپنے پچھلے میک
میں واپس نہیں جا رہا..... ورنہ بڑی دشواری پیش آتی۔ وہ اسے دیکھتے ہی بھڑک اٹھتی۔

فرزادو پہنچ کر وہ اپنی گاڑی پارکنگ شیڈ کی طرف لیتا چلا گیا اور اسی وقت اس کی نظر
لانی لاری پر پڑی۔ دو تین مسلح کانسٹیبل لان پر بھی نظر آئے۔

”کیا مصیبت ہے۔“ حمید نے بڑبڑاتے ہوئے انجن بند کیا۔

گاڑی سے اتر کر سیدھا دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

کلائر پر دو سب انسپکٹر دکھائی دیئے، جو شاید کانسٹرکٹر کے کسی قسم کی پوچھ گچھ کر رہے تھے۔
کلائر ان سے معذرت طلب کر کے حمید کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے بتایا کہ قیام کے

نہالے میں میجر صاحب سے ان کی جھڑپ بھی ہوئی تھی۔ پھر ڈاکٹر نے جیسے ہی یہ اطلاع سنی پروفیسر کی حالت غیر یقینی ہے ان کے قلب کی حرکت بند ہوگئی۔ اب تم اس سے جو نتیجہ اخذ کرو۔“

اس نے خاموش ہو کر حمید پر نظر ڈالی اور پھر مخاطب کو جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگا۔ دوسرے آدمی نے کہا۔ ”اور یہ میجر سعید اور پروفیسر کی لڑکی والا معاملہ۔“

”کوئی بہت بڑا چکر ہے۔ پروفیسر کو ہوش ہی نہیں آچکا۔ اس وقت اس کے بستر کے چار مسلح پولیس آفیسر موجود ہیں۔ مونا اور میجر سعید کی تلاش جاری ہے جنہیں کچھ اٹل پکڑ لے گئے ہیں۔“

کچھ دیر کے لئے وہ پھر خاموش ہو گئے اور حمید لائف میگزین کے ورق التار ہا۔ ”آخروہ ایرانی عورت وہاں کیسے جا پہنچی تھی۔“ دوسرے آدمی نے پوچھا۔

”تفریح کے لئے نکلی تھی۔ آگے وہ لوگ اپنے گاڑی میں مونا کو لئے جا رہے تھے۔ ایک انہوں نے اپنی گاڑی اسی طرح روکی کہ مس یاسمین کو بھی گاڑی روک دینی پڑی چونکہ مس یاسمین مقیم ہیں اس لئے انہیں تعاقب کا شبہ ہوا اور انہوں نے انہیں بھی پکڑ لیا۔ مونا سمیت مار میں پہنچے۔ مس یاسمین کا بیان ہے کہ وہ مونا سے میجر سعید کے متعلق پوچھ رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مونا نے میجر سعید سے کس قسم کی باتیں کی ہیں اور اسے اپنے بارے میں کیا ہے۔ وہ لوگ کبھی اردو میں گفتگو کرنے لگتے تھے اور کبھی انگریزی میں۔ ورنہ وہ بے چاری تو کبھی نہ سمجھ سکتیں۔ انہیں اردو آتی ہی نہیں۔ بہر حال یہ پوچھ گچھ جاری ہی تھی کہ میجر سعید کونسا انگیز طور پر وہاں پہنچ گیا اور اس نے مونا پر ریوالور سے فائر کئے پھر ایک اور آدمی آیا

لڑکے ہاتھ میں ٹامی گن تھی۔ اس کے حکم پر ان لوگوں نے میجر سعید کو باندھ لیا اور مونا سمیت اپنے ساتھ لے گئے۔ مس یاسمین پر اتنی مہربانی کی کہ ان کے کاغذات دیکھ لینے کے بعد ٹھکانا جانے دیا۔ لیکن دھمکی دی تھی کہ اگر انہوں نے پولیس کو کچھ بتایا تو ان کی خیر نہیں۔ یار مس بکھرے کی عورت ہے۔ اب تو اسے ضد ہوگئی ہے۔ سب کچھ پولیس کو بتا دیا ہے اور اب

لئے کمرہ مل سکے گا۔

”گاڑی سے میرا سامان منگوا لیجئے۔“ حمید نے کہا اور اسے اپنی گاڑی کے برابر رجسٹر میں اپنا نام عبدالرشید اور پیشہ کشیشن ایجنسی درج کرایا۔

ہر چند کہ وہ نام اُسے پسند نہیں تھا لیکن زبان سے یہی نکلا تھا۔ اس لئے اب عبدالرشید ہی محسوس کر رہا تھا۔

پھر کچھ دیر بعد وہاں پولیس کی موجودگی کی وجہ بھی معلوم ہوگئی۔ یہ ہنگامہ یاسمین قزلباش نے برپا کرایا تھا۔ اس نے پولیس کو اطلاع دے دی تھی لوگ میجر سعید کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہے تھے۔

پھر ایک پارٹی یاسمین قزلباش کے ساتھ غالباً اسی جگہ کی تلاش میں روانہ ہوئی تھی واقعہ پیش آیا تھا۔

اس نے پولیس کو مونا کے بارے میں بھی بتایا تھا۔

حمید کو اس کے برابر ہی کمرہ ملا تھا جس میں وہ میجر سعید کی حیثیت سے مقیم رہا تھا تھوڑی دیر بعد وہ نیچے ڈائننگ ہال میں واپس آیا۔ شام ہوگئی تھی اور اب دھند لکا پھلا حمید نے سوچا کہ مزید معلومات کیلئے کاؤنٹر کلرک ہی سے رابطہ مضبوط بڑھانا بہتر ہے اس وقت کاؤنٹر کلرک کے پاس غالباً اس کا کوئی دوست بیٹھا قوعے کے متعلق تھا۔ حمید کاؤنٹر سے ٹک کر پائپ سلگانے لگا۔ اس کی نظریں سامنے پڑے ہوئے لائف کے سرورق پر تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس پر چھپی ہوئی تصویر میں بہت زیا لے رہا ہو۔

کاؤنٹر کلرک اپنے دوست سے کہہ رہا تھا۔ میجر صاحب کا ہارٹ فیل اسی رات جب بوڑھا پروفیسر خراب و خستہ حالت میں واپس آیا تھا۔ پتہ نہیں کیا چکر تھا۔ وہ پرو بیزار بھی تھے اور اس سے ڈرتے بھی تھے۔ جب وہ بیہوش پڑا تھا تو ان کی کوشش یہی تھی میڈیکل ایڈمنٹل سکے۔ تب میجر سعید اور مسٹر ساجد پرویز ایک ڈاکٹر کو بلا لائے۔ میرا

سے مخاطب ہے سنبھل کر بولا۔ ”کئی اخبار آتے ہیں جناب، سب آپ کو ریڈنگ روم میں مل جائیں گے۔ مجھے چونکہ اخبارات سے دلچسپی نہیں ہے اس لئے ان کے نام بھی یاد نہیں رہتے۔“

”خیر..... خیر..... ابھی ابھی آپ نے پرنس ہنری کے تمباکو کے متعلق جو رائے ظاہر کی تھی

میں اس سے متفق ہوں۔“

”ہے نا.....!“ وہ جھک کر بولا۔ پھر دوسرے آدمی سے بولا۔ ”دیکھو..... جسے ذرا بھی تمیز ہے مختلف تمباکوؤں میں..... وہ یہی کہے گا۔“

”میاں پیچھا چھوڑ دو میرا۔“ دوسرا آدمی ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”جہنم میں جائے پرنس ہنری۔“

”ہٹ دھری سلامت رہے۔“ کاؤنٹر کلرک نے برا سامنہ بنایا اور پھر رجسٹر کی ورق گردانی کرنے لگا۔

”اگر آپ بیٹا چاہیں تو میں آپ کو پرنس ہنری کا ڈبہ دے سکتا ہوں۔“ حمید بولا۔

”ایک ڈبہ۔“ کاؤنٹر کلرک نے حیرت سے کہا۔ کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔

”لیکن وہ بہت مہنگا ہوگا۔“

”میں تحفہ پیش کروں گا۔“

”ارے نہیں..... آپ کو کمی پڑے گی۔“

”قطعاً نہیں۔ میرے بڑے بھائی ایک بار بردار جہاز پر چیف انجینئر ہیں۔ ہر ماہ میرا کوٹہ

بھجوا دیتے ہیں اس میں سے بھی کئی ڈبے بچ رہتے ہیں لہذا احباب کا بھی بھلا ہوتا ہے۔“

”تب تو میں آپ سے درخواست کروں گا کہ ایک ڈبہ مجھے بھی عنایت فرمائیے اور پھر

ان حضرت کو بھی دکھائی جائے یہ بھی کیا یاد کریں گے۔“

”جی نہیں شکریہ۔“ دوسرا آدمی ناخوشگوار لہجے میں بولا۔ ”مجھے اپنا ہی برا بھلا لگتا ہے۔“

اس طرح حمید نے کاؤنٹر کلرک سے دوبارہ اچھی خاصی جان پہچان پیدا کر لی۔ اب وہ یاکین کے بارے میں بہت زیادہ تشویش میں پڑ گیا تھا۔ اگر اس کا تعلق مجرموں ہی سے ہوتا تو وہ پولیس کو ہرگز بیان نہ دیتی۔

پولیس والوں کے ساتھ ان لوگوں کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی ہے۔“

”کیا خیال ہے تمہارا.....!“ دوسرے آدمی نے پوچھا۔ ”کیا یہ میجر سعید بھی کوئی آدمی ہے۔“

”میں کیا بتاؤں۔“ کاؤنٹر کلرک طویل سانس لے کر بولا۔ ”میرے ساتھ تو بڑی سے پیش آیا تھا۔ پرنس ہنری کے تمباکو کی وافر مقدار مجھے دی تھی۔ تم نے کبھی ٹرائی کیا پرنس ہنری۔ میری دانست میں تو اس سے اچھا کوئی اور تمباکو ہے ہی نہیں۔“

”کیپشن کیا برا ہے؟“

”بکواس ہے..... میں تو اپنے ایک جہازی دوست سے خط و کتابت کر رہا ہوں کہ بھی آئے میرے لئے دو درجن ڈبے لیتا آئے۔“

”کیپشن کے مقابلے کا نہیں۔ مانو میری بات۔“

”خواہ مخواہ بحث نہ کرو۔“

”لارڈ بوگر ڈوگر بھی کیپشن ہی کا تمباکو استعمال کرتے ہیں۔“

اس پر کاؤنٹر کلرک صاحب نے لارڈ بوگر ڈوگر کی والدہ کی شان میں بہت بڑی فرمائی اور مخاطب کے چہرے پر بھی کسی قدر برا فروختگی کے آثار نظر آئے۔ لیکن وہ بچلا دانتوں میں دبائے دوسری طرف دیکھتا رہا۔

کاؤنٹر کلرک برا سامنہ بنا کر رجسٹر کی ورق گردانی کرنے لگا۔ پھر شاید دوسرے آدمی اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے لہجے میں دوستانہ نرمی پیدا کر کے پوچھا۔

”پھر میجر سعید کا کیا ہوا.....؟“

”میجر سعید کی.....!“

لیکن قبل اس کے کہ وہ میجر سعید کی والدہ کو بھی نواز بیٹھتا حمید جلدی سے بولا پڑا۔

”کون کون سے اخبار آتے ہیں۔“

”اخبار.....!“ کاؤنٹر کلرک جھلا کر مڑا۔ لیکن پھر شاید یاد آنے پر کہ اب وہ ایک

لیکن اس کے برعکس بھی تو ہو سکتا تھا۔ وہ فریدی ہی کے کام کرنے والی کوئی لڑکی ہو سکتی تھی۔ اس کے امکانات پر بھی حمید نے بار بار غور کیا تھا۔ پھر یہ سوچ کر اس نظر سے کر دیا تھا کہ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو خود اس سے راز داری برتنے کا کیا مقصد ہو سکتا؟ دونوں مل کر کیوں نہ کام کرتے۔ اگر یہ یاسمین درحقیقت رضیہ ہی تھی تو درزی خانے میں وہ دوسرے کے لئے کیوں اجنبی بنے رہتے۔ کیا مصلحت تھی اس میں۔ لیکن آخر وہ کم بخت درزی خانہ ہی کس مرض کی دوا تھا۔ کیا مقصد تھا اس کے قیام کا اور پھر وہ اس طرح بند کیوں کر دیا؟ حمید پائپ میں تمباکو بھر کر اُسے دیا سلائی دکھانے ہی والا تھا کہ یاسمین قزلباش ڈانڈ ہال میں داخل ہوئی۔ حمید نے اُسے دیکھ کر اتنی گہری سانس لی تھی کہ کاؤنٹر کلرک کو بھی اس طرف متوجہ ہو جانا پڑا تھا۔

”آخر کس جنگل کا جانور ہے؟“ حمید نے کاؤنٹر کلرک سے پوچھا۔ ”خود خال مشرقی لگتے ہیں لیکن لباس ٹھیک مغربی ہے۔“

”ایرانی ہیں جناب۔ یہی تو ہیں مس قزلباش جن کو یہ واقعہ پیش آیا تھا۔“

”اوہو..... اچھا..... اچھا..... ایرانی ہیں۔ خوب۔ ایرانی لڑکیاں میری کمزوری ہیں۔“

کاؤنٹر کلرک نے دانت نکال دیے۔

یاسمین کی نظر حمید پر پڑی اور حمید نے محسوس کیا جیسے وہ ایک پل کے لئے خشکی ہو۔ آگے بڑھتی چلی گئی۔

”حق..... حق..... قیامت ہے۔“ حمید مضحکانہ انداز میں ہلکایا۔

”بے حد سنجیدہ عورت ہے۔ میں نے ابھی اُسے مسکراتے نہیں دیکھا۔“ کاؤنٹر کلرک بولا۔

”میں تمہیں اس کے لئے پاگل ہو کر دکھا دوں گا۔“ حمید نے کہا۔

”آپ ایسے ہی معلوم ہوتے ہیں جناب.....!“ دوسرے آدمی نے طنزیہ لہجہ میں کہا تھا۔

حمید نے مسکرا کر اُسے آنکھ ماری اور کسی گھٹیا قسم کے عیاش آدمی کی طرح اپنی جیب

ہاتھ پھیرنے لگا۔

”نہ بدور نہ بزدلی نہ بزمی آئید.....!“ دوسرے آدمی نے کہا۔

”مجھے فارسی نہیں آتی۔ مطلب بھی سمجھاؤ۔“ حمید غصیلے لہجے میں بولا۔

”یہ بڑی بدتمیزی کی بات ہے کہ بغیر تعارف کسی سے بے تکلف ہوا جائے۔“ کاؤنٹر

کے نے دوسرے آدمی سے کہا اور پھر معذرت طلب نظروں سے حمید کی طرف دیکھنے لگا۔

”کوئی بات نہیں۔“ حمید ہنس کر بولا۔ ”ہم تو یاروں کے یار ہیں۔“

”یہ بات ہے تو لاؤ ادھر ہاتھ۔“ دوسرا آدمی اپنا ہاتھ بڑھاتا ہوا بولا۔ حمید نے بڑی گرم

نہ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”بس اسی طرح ہنس بول کر دن گزارتے ہیں۔“

دوسرا آدمی تحسین آمیز نظروں سے اس کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کا ہاتھ ابھی تک حمید ہی کے

میں تھا۔

”اچھی بات ہے دوست۔“ اس نے بلا آخر کہا ”ہمارا وقت اچھا ہی گزر جائے گا۔“

”یہ مسٹر شفقت ہیں.....!“ کاؤنٹر کلرک نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

”رام گڈھ کے مشہور گلوکار..... اپنا ثانی نہیں رکھتے۔“

”بڑی خوشی ہوئی۔“ حمید ایک بار پھر گرم جوشی سے اس کا ہاتھ دباتا ہوا بولا۔ ”مجھے رشید

لہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں وائیلن بہت اچھا بجاتا ہوں۔“

”ضرور..... ضرور..... انگلیاں یہی کہہ رہی ہیں۔“

اتنے میں یاسمین پھر دکھائی دی۔ کاؤنٹر ہی کی طرف آتی معلوم ہوتی تھی۔

حمید کا اندازہ درست ہی نکلا۔ اس نے قریب آ کر کاؤنٹر کلرک سے وقت پوچھا تھا اور

بٹا گزری ملائی تھی۔

”کہئے..... کچھ سراغ ملا۔“ کاؤنٹر کلرک نے بڑے ادب سے پوچھا۔

”نہیں! ہم ان غاروں میں بھی دیکھ آئے اور پل تک بھی گئے۔ ان کا کہیں سراغ نہیں

ملا۔ بے چاری لڑکی۔ یہ نہیں وہ درندے کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔“

”میرا خیال ہے شاید آپ اب واپس چلی جائیں۔“

”بڑی خوشی ہوئی کہ آپ اردو جانتی ہیں۔“ حمید نے اردو ہی میں کہا۔
”وہ میرا کمرہ ہے۔“ یاسمین نے ایک جانب ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”چلے۔“ حمید دوسری راہداری میں مڑ گیا۔

یاسمین اس کے پیچھے چل رہی تھی۔ لیکن کمرے میں داخل ہونے میں اس نے پہل کی۔
”وہ لوگ کہہ رہے تھے کہ آپ بہت مغرور ہیں۔“ حمید نے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔
”میں خود کو لئے دیئے رہنے کی عادی ہوں۔“

”انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ آپ ایران سے تعلق رکھتی ہیں۔“

”کچھ نہ بولی۔ خاموشی سے اُسے دیکھتی رہی۔

”کیا میں اس ملاقات کو قریب کا رنگ دے سکتا ہوں۔“ حمید نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

اب وہ انگریزی ہی میں گفتگو کر رہا تھا۔

”میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کیا اسکیم میں کوئی تبدیلی ہوئی ہے۔“ اس بار یاسمین قزلباش
ع اردو میں پوچھا۔

”کچھ دیر مجھے اور ٹھہرنے دیجئے یہاں۔ آپ تو لاطینی بھی بولنے لگیں گی۔“

”میں پوچھتی ہوں آپ میک اپ کے بغیر کیوں نظر آ رہے ہیں۔“

”کوسٹیکس کی گرانی..... میکس فیکٹر کی لپ اسٹک کا عادی تھا۔ دوسرے براؤن قطعی پسند

ہیں۔“

”نجیدگی سے گفتگو کیجئے۔“

”کیا ایرانی مرد.....؟“

”پلیز کیپٹن حمید۔“

”عبدالرشید نام ہے خاکسار کا۔“

”مجھے کٹل صاحب سے آپ کی شکایت کرنی پڑے گی۔“ اس نے ناخوشگوار لہجے میں کہا

”کترہ رضیہ..... آپ خود کو کیا سمجھتی ہیں۔“

”ناممکن..... مجھے یہ ایک دلچسپ لیکن ڈراؤنا قصہ معلوم ہوتا ہے۔ اب تو میں تفصیل معلوم
کرنے کے لئے بہر حال ٹھہروں گی۔“

”جی ہاں..... جی ہاں.....!“ وہ سر ہلا کر بولا۔ ”آپ کو پلاٹ مل جائے گا۔ اچھا۔ آپ
کہانیاں ہی تو لکھتی ہیں۔“

”میں رات کا کھانا اپنے کمرے میں کھاؤں گی۔“ اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا اور واپس
کے لئے مڑ گئی۔

”ناک پر کبھی ہی نہیں بیٹھنے دیتی سالی۔“ کاؤنٹر کلرک بڑبڑایا۔

زینوں کے قریب پہنچ کر وہ ایک بار پھر مڑی تھی۔ حمید نے محسوس کیا جیسے اس بار مرکز
صرف وہی رہا ہو۔

”اُن دونوں نے بھی شاید اُسے محسوس کر لیا تھا اور پر معنی انداز میں مسکرا رہے تھے۔

”واقعی آپ بلا کے بچیلے ہیں جناب۔“ کاؤنٹر کلرک ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

”کیوں.....؟ کیوں بھی۔“

”شاید ہی کسی کو اس نے نظر بھر کر دیکھا ہو..... کمال ہو گیا۔“

”کیا کمال ہو گیا۔“ حمید نے انجان بن کر پوچھا۔

”کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ وہ مڑ مڑ کر آپ کو دیکھتی رہی تھی۔“

”وہم ہو گا.....!“ حمید نے لاپرواہی سے شانوں کو جنبش دی اور پھر چونک کر بولا۔

”ادہ..... میں آپ کے لئے تمباکو تو لیتا آؤں۔“

پھر ان کی کوئی بات سننے بغیر وہ بھی زینوں کی طرف بڑھ گیا۔

تیزی سے زینے طے کئے اور اپنے کمرے والی راہداری میں مڑی رہا تھا کہ آواز آئی
”ٹھہریئے۔“

حمید چونک کر مڑا۔ یاسمین قزلباش دوسری راہداری کے سرے پر کھڑی تھی۔

حمید کے مڑنے پر اس نے کہا۔ ”میں بس ایسی معمولی ہی سی اردو جانتی ہوں۔“

”میرا نام رضیہ بھی نہیں ہے۔“ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”محترمہ..... لفاتن..... ہیں.....!“

وہ تھوڑی دیر تک خاموشی سے حمید کو گھورتی رہی پھر بولی۔ ”اسی خدشے کے تحت کہ آپ پر میری اصلیت نہیں واضح کی تھی کہ پھر کام نہیں ہو سکے گا۔“

”اب تو کام تمام ہو گیا تا۔“ حمید نے ٹھنڈی سانس لی۔

”اچھی بات ہے..... آپ جا سکتے ہیں۔“

”نفسیات پر کچھ نہیں ہوئی۔ بہت دنوں سے کان پیسا سے ہیں۔“

وہ ہنس پڑی اور بولی۔ ”آپ کی ڈاڑھی اکثر یاد آتی تھی اور وہ پہاڑ خانم۔“

”قاسم.....!“

”جواب نہیں ہے اس کا بھی۔“ اس نے کہا اور پھر چونک کر بولی۔ ”الجبھا لیا آر

..... میں پوچھ رہی تھی کہ آپ میک اپ کے بغیر کیوں نظر آ رہے تھے۔“

”پہلے تم مجھے اپنا جغرافیہ سمجھانے کی کوشش کرو۔“

”میرا تعلق نصیر آباد آفس سے ہے۔ میں نے ایک معاملے میں کرنل سے مدد طلب کی

”نصیر آباد آفس.....!“ حمید نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”تم لیڈی انپائلر

نہیں ہو۔“

”ہاں بھی ہے میرا نام.....!“

”تذکرہ سنا تھا۔“ حمید ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”اور کوشش بھی کی تھی کہ کچھ ذوا

لے آن ڈیپوٹیشن نصیر آباد چلا جاؤں۔“

حمید نے سوچا درزی خانے والا چکر بھی لگے ہاتھوں سمجھ لینا چاہئے۔ لیکن پھر خامو

رہا۔ کیا وقت رہ جاتی اس کی نظروں میں۔ کرنل فریدی اپنے ماتحتوں پر اعتماد نہیں کرتا۔

حالات سے بے خبر رکھتا ہے۔

”آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔“ زیبانے کہا۔

”جو حکم ملا۔ اس پر عمل کر ڈالا گیا۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتا۔ وقت اتنا کم تھا کہ

اس کی وجہ بھی نہ معلوم کی جا سکی۔ ورنہ صبح تک تو میک اپ ہی میں تھا۔“

”کہاں تھے؟“

”کچھ وقت تو تمہارے ساتھ بھی گزرا تھا۔“

”کیا مطلب.....؟“

”اسی غار میں محترمہ زیباحس کی زیارت کرانے لے گئی تھیں۔ آپ یہاں کے ٹھکوں کو۔“

”میں اب بھی نہیں سمجھی۔“

”میجر سعید محترمہ۔“

”وہ..... وہ..... آپ تھے؟“ زیبانے حیرت سے کھل گیا۔

”جناب.....!“

”لل..... لیکن..... پھر آپ کیسے رہا ہوئے..... اس مردود نے تو پانسہ ہی پلٹ دیا تھا

آکر.....؟“

”جی..... یہ آپ نے کس مردود کا تذکرہ کیا ہے۔“

”وہی..... جو آپ کو بندھوا لے گیا تھا۔“

حمید نے قہقہہ لگایا اور دیر تک ہنستا رہا پھر بولا۔ ”اگر اس بیچارے کو علم ہو جائے کہ آپ

نے اُسے کن الفاظ میں یاد فرمایا تھا تو شاید وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ جنگل کی راہ لے۔“

”پلیئر کیپٹن..... مجھے الجھن میں نہ ڈالئے۔“

تب حمید نے اُسے پوری داستان سنائی اور وہ بڑی دیر تک متحیرانہ انداز میں حمید کی طرف دیکھتی رہی۔

پھر بولی۔ ”خدا کی قسم! میرے تو ہاتھ پیر پھول جاتے کہ آدمیوں کو کیسے باندھ لے

جاؤں؟ اُن کے ذہن کو کون پاسکتا ہے۔“

”مجھے اس پر حیرت ہے کہ انہوں نے تم کو رخصت کرتے وقت کوئی ہدایت کیوں نہیں

حمید نے دروازے کی طرف مڑتے وقت ریڈی میڈ میک اپ کا سامان جیب سے نکال

وہ دونوں

”پورٹر ایک بہت بڑے اور وزنی ہولڈال کو گھنٹے ہوئے ایک کمرے کے دروازے سے
نے کی کوشش کر رہے تھے اور قاسم قریب ہی کھڑا نہیں غیرت دلا رہا تھا۔

”اور..... زور لگا کے..... ہاں..... یا علی..... اور جور سے..... ہت تیری تی..... اچھا
بس دغ لیا..... میرے طرح بھینس کا دودھ پیا تو.....!“

”دونوں پورٹر الگ ہٹ گئے اور قاسم نے جھک کر اس ہولڈال کو اس طرح اٹھالیا جیسے
بناٹا تے ہیں۔ لیکن اس سمیت وہ دروازے سے تو نہیں گزر سکتا۔

”اب دیکھو حرامی پن.....!“ وہ جھلا کر بولا۔ ”سالوں نے یہ جراجرا سے دروازے بنائے
فیہ گھسوں اور قیسی گھسیروں۔“

پورٹروں نے منہ دبا کر ہنستا شروع کر دیا۔

”اے ہنستے ہو بے شرمو۔“ قاسم نے اس وزنی ہولڈال کو اسی طرح اٹھائے ہوئے کہا۔

”آواز ترقی کر رہی ہے اور یہ لوغ ٹھیک سے دروازے بھی نہیں بنا سکتے۔“

”صاحب..... پہلے ہولڈال کو اندر پھینک دیجئے۔“

”اور پھر خود گھس جاؤں قیوں.....؟“ قاسم آنکھیں نکال کر بولا۔

”اور کیا حضور عالی.....؟“

”اے ہاں ٹھیک تو ہے؟“ قاسم آہستہ سے بڑبڑایا اور ہولڈال کو اٹھا کر اندر پھینک دیا۔

”اور اب آپ.....!“

دی اور تم نے یہ سب کچھ اپنی مرضی سے کیسے کر ڈالا۔“

”میرا خیال ہے کہ وہ بھی چاہتے تھے جو کچھ میں نے کیا ہے۔“

”کیوں؟ کس بناء پر.....؟“

”میرا دل مطمئن ہے؟ کیا آپ ٹیلی پتھی میں یقین نہیں رکھتے۔“

”صرف اسی حد تک کہ وہ دو دلوں کا معاملہ ہو۔“

حمید نے محسوس کیا کہ وہ جھینپ کر دوسری طرف دیکھنے لگی ہے۔

دفستار اہداری سے کچھ عجیب قسم کے شور کی آواز آئی وہ چونک پڑے۔ شاید کوئی وزنی چیز
گھسیٹی جا رہی تھی۔

ساتھ ہی کوئی کہتا جا رہا تھا۔ ”ابے خانا نہیں خاتے قیام لوغ..... جراسا ہولڈال نہیں اٹھا
سکتے..... قیوں.....؟“

”صاحب آپ خواہ مخواہ لائے ہولڈال..... یہاں بستر وغیرہ سب ملتا ہے۔“ کسی نے
جواب میں کہا تھا۔

”تمہارے بستروں کا قیٹھکانا..... کل توئی بھگی ونگی لینا ہو اس پر تو.....!“

”ارے یہ یہاں کیسے۔“ حمید نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

”پہاڑ خانم ہی ہے نا..... آواز ویسی ہی ہے۔“

”بالکل وہی مردود ہے۔“

”یہ تو بہت بُرا ہوا..... وہ مجھے پہچان لے گا۔“

”لیکن اُسے کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں؟“ حمید نے پرتشویش لہجے میں کہا۔

”کیا یہ ضروری ہے کہ وہ آپ ہی کے لئے آیا ہو۔“

”ہاں..... دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو وہ کسی نگڑی سی عورت کا تعاقب کرتا ہوا یہاں آیا

ہے یا پھر یہاں میری موجودگی کا علم ہو گیا ہے اس کو..... خیر میں دیکھتا ہوں۔ جب تک واپس نہ
آؤں کمرے سے باہر نہ نکلتا۔“

”اے ہاں گھس رہا ہوں۔“ قاسم پھر جھلا کر بولا۔ ”جلدی قیا ہے؟“

”کچھ نہیں صاحب..... کچھ نہیں..... اچھا اب اجازت دیجئے۔“

”خانے میں قیا ملے گا.....!“

”صاحب یہ تو بابو صاحب ہی بتائیں گے۔“

پورٹوں نے آنکھیں پھاڑ کر ایک دوسرے کو دیکھا اور چپ چاپ زینوں کی طرف بڑھ کر حمید بھی آہستہ آہستہ چلتا ہوا زینوں کے قریب پہنچ چکا تھا۔ زینے طے کرتے وقت نے ناک کے نتھوں سے اسپرنگ نکال لئے۔ پھر اُسے تمباکو کا ڈبہ یاد آ گیا اور اُسے پاؤں واپس ہونا پڑا۔

کچھ دیر بعد وہ پھر کاؤ پر دکھائی دیا۔ کاؤ نر کلرک اب تنہا ہی تھا۔ تمباکو کا ڈبہ سنبھا ہوئے اس نے بڑی لجاجت سے حمید کا شکریہ ادا کیا تھا۔

”ابھی مجھے زینوں کے قریب ہی ایک دیوڑا نظر آیا تھا..... یہ کون ہے۔“

”ارے صاحب حد ہوگئی۔“ وہ راز دارانہ لہجے میں بولا۔ ”میں نہیں سمجھ سکتا کہ

کیسے حیرت انگیز واقعات پیش آرہے ہیں۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ حد ہوگئی۔“

”کیوں کیا ہوا.....؟“

”وہ صاحب ضروری کاررائیوں کے بعد اوپر گئے ہی تھے کہ ایک محترمہ تشریف لائیں کہنے لگیں کہ انہیں ان صاحب کے برابر والا کمرہ دیا جائے۔ یہ بے حد ضروری ہے اور“ کے لئے مجھے کوئی معقول رقم بطور انعام بھی دے سکیں گی۔ حالانکہ ایک کمرہ اس کے برابر خالی ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔“

”دے دو نا..... مفت کے پیسے ہاتھ آئیں گے۔“ حمید آہستہ سے بولا۔

”نہیں صاحب.....! وہ اس کی بیوی ہوگی چھپ کر اس کی مصروفیات کا جائزہ لینا؟

ہوگی۔“

”ہاں معلوم تو بیوی ہی ہوتی ہیں۔ کچھ ہی کم ہوں گی ان صاحب سے۔ لیکن

ن۔ چہرے مہرے کی بھی اچھی ہیں۔ اپنا نام ٹریا لکھا گئی ہیں۔“

”یعنی تمہارا خیال ہے کہ قد و قامت میں کچھ ہی کم ہوگی۔“

”جی ہاں.....!“

حمید نے پر تشویش انداز میں سر کو جنبش دی۔

”اب بتائیے کیا خیال ہے۔“

”میری دانست میں تو تمہارا کوئی نقصان نہیں اس میں اگر برابر والا کمرہ خالی ہے۔“

”خالی ہے جناب۔“

”دے دو.....!“

کلرک طویل سانس لے کر بولا۔ ”اچھی بات ہے۔ آپ کہتے ہیں تو دے دوں گا۔“

”تم فکر نہ کرو۔ میں ان پر نظر رکھوں گا۔ کوئی گڑبڑ دیکھی تو تمہیں آگاہ بھی کر دوں گا۔“

”بہت بہت شکریہ جناب۔“ وہ کھسیانی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔ ”لیکن جناب کسی سے

گا نہیں کہ مجھے اس کے لئے پیسے ملتے ہیں۔ آپ کو اپنا سمجھ کر بتا دیا۔“

”تم فکر نہ کرو۔ ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔“

”بہت بہت شکریہ جناب۔“

واپس پر حمید نے دونوں اسپرنگ پھر نتھنوں میں فٹ کر لئے۔ ناک کی نوک اوپر اٹھ گئی

کی کیا تھ اور پری ہونٹ بھی اس طرح اوپر اٹھتا چلا گیا کہ سامنے کے دانت دکھائی دینے لگے۔

زینا کے کمرے کے دروازے کے سامنے رک کر اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر ہینڈل

ماکر دروازے کو دھکا دیا۔ وہ اندر سے مقفل نہیں تھا۔ اس لئے اُسے بے تحاشہ کمرے میں

ماہو جانے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔

زینا نے اُسے دیکھا اور اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ اس کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا تھا۔

”یہ کیا یہودگی ہے۔ کون ہو تم..... اس طرح بغیر اجازت.....!“

حمید کچھ نہ بولا۔ خاموش کھڑا اُسے گھورتا رہا۔

دفعتاً زیبائے اپنے بلاؤں کے گریبان سے اعشاریہ دو پانچ کا پستول نکال لیا۔
 ”کون ہو تم.....!“ اس بار اس کا لہجہ پہلے سے بھی زیادہ سخت تھا۔
 ”اِس ک اداس اور تنہا آدمی.....!“ حمید ناک کے بل بولا۔
 ”نکل باہر..... نکل جاؤ..... اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ.....!“

حمید نے ہاتھ اٹھائے تو لیکن وہ صرف چہرے تک آ کر رہ گئے۔ اس نے اپنا منہ
 تھما اور پھر جب ہاتھ چہرے سے ہٹے تو دونوں اسپرنگ تھنوں سے نکل کر مٹھی میں آچکے۔
 ”ارے.....!“ زیبا لڑکھڑاتی ہوئی کئی قدم پیچھے ہٹ گئی۔

حمید بڑی سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔

”کمال ہے۔“ زیبا انک انک کر بولی۔ ”کیا یہ جادو تھا۔“

”نہیں..... ہماری روحانی قوت کا کرشمہ۔ بولو کیا چاہتی ہو۔“

”نہیں بتائیے۔ میں نے ایسی حیرت انگیز تبدیلی آج تک نہیں دیکھی۔“

”کیا آپ اپنی ناک کی نوک اس طرح اٹھا سکتی ہیں۔“

”نہیں..... یہ ناممکن ہے۔ قطعی ناممکن.....“ نتھنے پھلائے جاسکتے ہیں..... لیکن ناک

طرح اوپر نہیں اٹھائی جاسکتی۔“

”اونچی ناک والے ہیں۔“

”خدا کی قسم دو گھنٹے متواتر دیکھتے رہنے کے بعد بھی نہ پہچان سکتی۔“

”اب اس قصے کو ختم کرو۔ میں سنجیدگی سے کچھ دیر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔“

”سنجیدگی سے۔“ زیبائے نے مصنوعی حیرت ظاہر کی۔ ”آپ اور سنجیدگی۔“ یہ بھی آپ

جا میں۔ میں کیا بتا سکوں گی۔“

”دوسرا چکر اور بھی ہے۔“

”وہ کیا.....؟“

”میں سمجھتا تھا کہ وہ کسی عورت کا تعاقب کرتا ہوا یہاں آیا ہے لیکن معاملہ برعکس ہے۔“

”یعنی.....!“

”کوئی عورت اس کا تعاقب کرتی ہوئی یہاں آئی ہے۔“

”میں پھر نہیں سمجھی۔“

حمید اُسے اپنی اور کاؤنٹر کلرک کی گفتگو کا ماحصل بتاتا ہوا بولا۔ ”اب دیکھنا ہے کہ وہ

عورت کون ہے۔“

”عورتیں ہی آتی ہیں آپ کے حصے میں۔“ زیبا اٹھلائی۔

”نفیاتی نکتہ نظر سے۔“

”اوہو..... تو اب آپ کو بھی دلچسپی ہوگئی ہے نفیات سے۔“

”یہ بھی ایک نفیاتی نکتہ ہے..... جب کوئی پوسٹ گریجویٹ درزن دل کے چاک رفو

کرتی ہے تو اکثر ایسا ہو جاتا ہے۔“

”کیا اب ہم رومانی قسم کی گفتگو کریں گے۔“ زیبائے حیرت سے کہا۔

”ڈیپارٹمنٹ کے رولز اینڈ رگولیشن میں کہیں اس کا تذکرہ موجود نہیں کہ ڈیپارٹمنٹ کی

خواتین سے رومانی گفتگو نہ کی جائے۔“

”اوہ..... ہاں..... تو آپ کیا کہہ رہے تھے اس عورت کے متعلق۔“

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“ حمید نے پرٹھکر لہجے میں کہا۔ پھر چونک کر بولا۔ ”کیا تم

پروفیسر اور اس کی لڑکی کی نگرانی کرتی رہی تھیں۔“

”ہاں..... میں نصیر آبادی سے ان کا تعاقب کرتی ہوئی آئی تھی اور کرنل صاحب کو اس

کی اطلاع دی تھی۔“

”آخر پروفیسر اور اس کی لڑکی پر تمہیں کس بات کا شبہ تھا۔“

”گولڈن ایرو سے متعلق ہونے کا۔“

”کس بناء پر۔“

”سارہ رحمان پروفیسر ہی کی پروردہ تھی اور میں نے کچھ مشتبہ آدمیوں کو پروفیسر سے ملتے

”بس یونہی..... میرا خیال ہے کہ آپ نے اسکا نام سارہ رحمان کے سلسلے میں سنا ہوگا۔“

”شاید؟ پھر.....!“

”دونوں گہرے دوست تھے؟“

”پھر تو پولیس نے اُسے گھیرا ہوگا؟“

”صرف سوالات کئے تھے۔ میرے محکمے نے انہیں ہدایت دی تھی کہ اُسے زیادہ پریشان

اجائے۔ دراصل وہ ہم لوگوں کی نگرانی میں تھی۔“

”اُس کے باوجود بھی نکل بھاگی نصیر آباد سے.....؟“

”میری عدم موجودگی میں ماتحوں نے میری ہدایات پر عمل نہیں کیا ورنہ وہ ایک پل کے

بھی نظروں سے اوجھل نہ ہو سکتی۔“

”لیکن تمہیں درزن بننے کے شوق نے گھیرا تھا۔“

”ہمیں ایک تجربہ کرنا تھا۔“

حمید کچھ نہ بولا۔ بات نازک مرحلے پر آ پہنچی تھی۔ وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اُسے اس

بے کے بارے میں علم نہیں تھا۔

کمرے کی فضا پر پھر خاموشی چھا گئی۔ حمید جیب سے پائپ نکال کر اس میں تمباکو بھرنے لگا۔

”اب اس کا مسئلہ سمجھ میں نہیں آتا۔“ زیبا کچھ دیر بعد بولی۔

”کس کا.....!“

”اسی موٹے کا..... غائب قسم کا ذہن رکھتا ہے۔ مجھے دیکھتے ہی رضیہ کا نعرہ لگا بیٹھے گا۔ یہ

بے بغیر کہ وہ خود میرے سامنے ہمیشہ ایک عورت کے میک اپ میں آتا رہا ہے۔“

”یہ بات تو ہے؟“ حمید کا لہجہ پر تشویش تھا۔ ”تم آخر میک اپ میں کیوں نہیں رہتیں۔“

”اس کا سلیقہ ہی نہیں ہے؟ ویسے بھی میں صرف اپنا ذہن استعمال کرنے کی قائل ہوں۔“

”چوٹ کر رہی ہو ہم پر..... کیوں؟“

”نہیں..... اپنی ایک کمزوری کا اظہار کر رہی ہوں۔“

بھی دیکھا تھا اور یہ بھی محسوس کیا تھا کہ پروفیسر اُن سے ملنے کے بعد بہت زیادہ خوفزدہ نظر آنے لگتا ہے۔ یہاں آ کر ایک دن پروفیسر اچانک غائب ہو گیا۔ لڑکی تنہا رہ گئی۔ لیکن وہ مطمئن نظر آتی تھی۔ مجھے دیکھنا تھا کہ پروفیسر کہاں غائب ہو گیا۔ ہو سکتا تھا کہ لڑکی اس سے باہر ہوتی۔ لہذا وہ جب بھی باہر جاتی تھی میں اس کی نگرانی کرتی رہتی تھی۔“

”پھر تم نے کیا دیکھا.....!“

”کچھ بھی نہیں..... وہ ہر شام باہر ٹہلنے جاتی تھی اور ساجد بھی اُس کی نگرانی کیا کرتا تھا۔

وہ بھی نصیر آبادی کا تھا۔ میرا خیال ہے کہ میں نے اُسے ایک بار آپ کے ساتھ بھی دیکھا تھا۔

اگر آپ واقعی مجر سعید کے میک اپ میں تھے۔“

”اس آدمی کے بارے میں تم کیا جانتی ہو۔“

”ساجد نام ہے..... نصیر آباد کا ایک متول آدمی ہے۔ لیکن نیک نام نہیں۔“

”کیا خیال ہے؟ وہ بھی گولڈن ایرو سے تعلق رکھتا ہوگا۔“

”یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتی۔“

”اس کا کوئی بھائی واجد نامی بھی تھا۔“ حمید نے پوچھا۔

”یقیناً تھا اور بڑی بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔“

”پھر قاتل کا کیا بنا۔“

”ابھی تک تو نصیر آباد کی پولیس اس کیس کو حل نہیں کر سکی۔“

پھر وہ سارہ رحمان کے متعلق کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ دفعتاً فریدی کا خیال آ گیا۔ پتہ

نہیں وہ اسے پسند کرے یا نہ کرے۔

چند لمبے خاموشی رہی پھر زیبا نے پوچھا۔ ”آپ نے واجد کے بارے میں کیوں پوچھا تھا۔“

”کہیں نام سنا تھا۔“

”کہاں سنا تھا.....؟“

”کیوں.....؟“ حمید نے اُسے گھور کر دیکھا۔

”حالات جب ایسے ہوں تو سبھی کچھ کرنا پڑتا ہے۔“ حمید نے کسی قدر ناخوشگوار لہجہ میں
 ”آپ تو امان گئے۔ میں نے یونہی کہہ دی تھی یہ بات۔“
 ”تم سے زبردست حماقت سرزد ہوئی۔ تمہیں اس واقعہ کی پبلیٹی نہ کرنی چاہئے تھی
 چپ چاپ ہوٹل تبدیل کر دیتیں۔ پروفیسر اور اس کی نگرانی کا معاملہ تو کھٹائی میں پڑی ہو
 یہ لوگ زیادہ باخبر معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں سے کوئی نہ کوئی تو تمہیں جانتا ہی ہوگا۔“
 ”انہیں شبہ میں ڈالنے ہی کے لئے تو یہ ایرانی بہروپ ہے۔“
 ”لیکن مجھے یقین تھا کہ تم رضیہ ہی ہو۔“
 ”اس خیال کی تصدیق کے لئے کبھی مجھے مخاطب کرنے کی ہمت تو نہیں پڑی تھی۔“
 ”میجر سعید کے میک اپ میں یہ ایک احمقانہ حرکت ہوتی۔ کیا تم مجھے بھی قاسم سمجھ
 ”ارے جانیے۔“
 ”خیر چھوڑو..... ہٹاؤ..... یہ بتاؤ کہ میں تمہیں کیسا لگا۔“
 ”بے حد بور.....!“ وہ ہنس پڑی۔
 ”زندگی تلخ کر دوں گا۔“
 ”ارے حمید صاحب۔“ زیبا نے مضحکہ انداز میں سر ہلا کر کہا۔
 ”اچھی بات ہے۔ دیکھ لیتا۔“
 ”بہت دیکھے ہیں حمید صاحب۔“
 ”نفسیاتی نکتہ نظر سے نہ دیکھے ہوں گے۔ اچھی بات ہے۔ اب میں جا کر اس
 لوں۔ بہتر ہوگا کہ تم اپنے کمرے ہی تک محدود رہو۔“
 ”بہت بہتر حمید صاحب۔“
 حمید اس کے طعنے لہجے پر ہنسا گیا لیکن کچھ بولا نہیں۔ دروازے کے قریب
 اسپرنگ پھر نتھنوں میں فٹ کر لئے۔
 راہداری سنسان پڑی تھی۔ قاسم والے کمرے میں اندھیرا تھا۔ وہ نکلا چلا گیا۔

کمرے میں آ کر وہ جیکٹ نکالی جسے الٹ کر بھی پہنا جاسکتا تھا۔ اسٹر کچھ اس انداز میں لگایا گیا
 تھا کہ وہ بھی اسی ہی معلوم ہوتا تھا۔ اس انتظام کے ساتھ وہ ڈانگ ہال میں اس طرح داخل
 ہوا جیسے کوئی مقامی گاہک ہو۔ اس کے لئے اُسے عقبی زینے استعمال کرنے پڑے تھے اور صدر
 دروازے سے ہال میں داخل ہوا تھا۔
 قاسم کو کاؤنٹر کے قریب کھڑے دیکھا۔ وہ بلند آواز میں کلرک سے گفتگو کر رہا تھا۔ ”اے
 تم ذنبہ مسلم نہیں سمجھتے اور بیٹھے ہو کاؤنٹر پر۔“
 ”جناب عالی یہ ہمارے مینو میں شامل نہیں ہے۔“
 ”نہ ہوگا..... اب شامل ہو سکتا ہے۔ ایک دمبہ منگوا لو..... میں خود ذبح کر دوں گا۔ خال
 بھی خود ہی اتار دوں گا..... حالانکہ میں اکثر ذبہ نہیں بیٹھ سکتا۔“
 ”حضور والا..... آپ کیوں خواہ مخواہ یہ ساری تکالیف اٹھائیں۔“
 ”بھوخوں مریں حضور والا سالے.....!“ قاسم جل کر بولا۔ ”دل کشا والے پچھلے سال
 میرے لئے دمہ مسلم تیار کراتے تھے۔“
 حمید نے کاؤنٹر کے قریب ہی کی ایک میز منتخب کی۔ ٹاک میں اسپرنگ موجود تھے اس
 لئے وہ بہ آسانی قاسم کے قریب ہی رہ سکتا تھا۔
 ”کیا مرغ مسلم سے کام نہیں چلے گا۔“ کاؤنٹر کلرک نے پوچھا۔
 قاسم کی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا..... ”کھیر چلو یہی سہی..... مالوم کراؤ کتنے تیار ہیں۔“
 ”آ خر آپ کو کتنے درکار ہوں گے۔“
 ”ہیں..... اور کچھ اسٹیک و سٹیک کھا کر کام چلا لوں گا۔“
 کاؤنٹر کلرک دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گیا۔
 ”کیا سوچ رہے ہو۔“
 ”جناب عالی..... بارہ روپے کا ایک بیٹھتا ہے۔“
 ”اے ہاں اتنی اڑھمیک مجھے بھی آتی ہے۔ دو سو چالیس روپے ہوئے بیس کے۔“

”خاص موضوع کیا ہے۔“

”بب..... بالکل ہی کھاس موجوع ہے۔“

”وضاحت بھی تو کیجئے؟“ وہ ہنس کر بولی۔

”وضاحت..... وضاحت..... جی..... دراصل مجھے بھوخ لگی ہے..... کھانا کھا کر.....
”روں گا۔“

”یعنی بھوک کی حالت میں آپ گفتگو نہیں کر سکتے۔“

قاسم نے بے بسی سے سر ہلا دیا۔

اس پر یہ نہیں کتنے قیمتی حید کے پیٹ میں گھٹ کر رہ گئے۔

”یہ تو بڑی عجیب بات ہے.....!“ عورت بولی۔

”بب..... بُرا نہ مانئے نا۔“ قاسم لجاجت سے بولا۔ ”بھوکا ہوتا ہوں تو بے وقوفی کی

نہی کرنے لگتا ہوں۔“

”بہت دلچسپ ہیں آپ.....!“ عورت منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی اور قاسم بھی جھینپے ہوئے

ناز میں ”ہی ہی ہی“ کرنے لگا۔

اتنے میں ایک ویٹر نے آہستہ سے کاؤنٹر کلرک سے کچھ کہا اور اس کے چہرے پر تشویش

کے آثار پائے جانے لگے۔

پھر وہ قاسم کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس سے کچھ کہنا تو چاہتا ہو

لیکن کئی خدشے کے تحت کہہ نہ سکتا ہو۔

قاسم نے بھی اُسے محسوس کر لیا تھا شاید۔ لہذا بھاڑ سامنے پھیلا کر بولا۔

”قیابات ہے؟“

”جج..... جناب عالی..... صرف بارہ عدد تیار ہیں۔“

”میں کچھ نہیں جانتا..... سمجھے..... بیس عدد..... قیا سمجھے؟“

”حضور والا..... کل صبح نو بجے سے پہلے مزید مرغوں کا انتظام نہیں ہو سکتا۔“

”اور آپ دو سو چالیس روپے ایک وقت میں.....!“

”روپے نہیں چباؤں گا..... مرغ کھاؤں گا..... جالڈی..... کارو.....!“

”بب بہت بہتر جناب۔“ کاؤنٹر کلرک نے سہمے لہجے میں کہا۔

اتنے میں حید نے دیکھا کہ ایک قد آور اور تندرست عورت کاؤنٹر کے قریب آکر کڑی
ہو گئی ہے۔ چہرے مہرے کی اچھی تھی۔ رنگت سرخ و سفید آنکھیں خاصی دل کش تھیں۔

ساتھ ہی حید نے یہ بھی محسوس کیا کہ قاسم صاحب اس کے قرب کی بناء پر شدید ترین
بوکھلاہٹ میں مبتلا ہو گئے ہیں۔

”یہاں کمروں کی سروس کا انتظام کیسا ہے۔“ عورت نے کاؤنٹر کلرک سے پوچھا۔

”مناسب ہی ہے محترمہ..... آپ کسی قسم کی تکلیف محسوس نہ کریں گی۔“

”پتہ نہیں میرے پڑوسی کیسے ہوں۔“ عورت نے پر تشویش لہجے میں کہا۔

”روم نمبر گیارہ ہے آپ کا شاید.....!“

”جی ہاں۔“

”ٹھہریئے میں بتاتا ہوں۔“ کاؤنٹر کلرک نے کہا اور رجسٹر کے ورق الٹنے لگا پھر بولا۔

”وہ ایک تو آپ ہی ہیں۔“ اس نے قاسم کی طرف دیکھ کر کہا۔

”اوہ..... اچھا.....!“ عورت نے اس طرح کہا جیسے پہلی بار قاسم پر نظر پڑی ہو۔ پھر

مسکرائی اور مصافحے کے لئے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھاتی ہوئی بولی۔ ”مجھے شریا کہتے ہیں۔

یہاں کے مناظر پینٹ کرتی ہوں۔“

قاسم اضطرابی طور پر اس سے مصافحہ کرتا ہوا ہکھلایا۔ ”حق..... حق..... قاسم.....!“

”یعنی قاسم صاحب۔“

”جی ہاں..... جی ہاں۔“ قاسم کے دانت ”نقل“ پڑے۔

”آپ کا کیا مشغلہ ہے۔“ عورت نے پوچھا۔

”میں بھی..... پپ..... پینٹ کرتا ہوں۔“

”ہائیں تو کیا میں کل صبح نو بجے تک بھو خا بیٹھا رہوں گا.....!“

”میں کیا عرض کر سکتا ہوں جناب۔“

”میں اس ہوٹل کو نیلام قرار دوں گا..... سمجھے..... قیاً سمجھتے ہو۔“

”میں بھی اس کے ساتھ ہی نیلام ہونے کو تیار ہوں۔ لیکن اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا۔“ کلرک نے بھی کسی قدر ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

قاسم کو بہت زور سے غصہ آ گیا تھا۔ لیکن عورت جلدی سے بول پڑی۔

”کیا قصہ ہے..... آپ کیوں خفا ہو رہے ہیں۔“

”میں مرغوں سے کم میں میرا قیام نہیں چلے گا.....!“

”پالیں گے؟“

”ہی ہی ہی..... آپ تو مزراغ کرتی ہیں۔“

”پھر.....؟“

”ارے خاؤں گا..... میں نے تو دہہ مسلم مانگا تھا..... مگر یہ مرغ دیتے ہیں۔ پھر پور

میں بھی نہیں۔ بارہ عدد..... رات بھر بھوخ کے مارے نیند نہیں آئے گی۔“

”میں مرغ کھائیں گے آپ.....!“ عورت نے حیرت سے کہا۔

”اور کچھ اسٹیک وغیرہ بھی کھا کر کام چلا لیتا۔“

”میں مرغ اور کچھ اسٹیک وغیرہ۔“

”مجبوری ہے..... ورنہ ایک دہے سے کام چل سکتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں سے؛

تو بھر جاتا ہے مگر جی نہیں بھرتا..... ایک ایک مرغ اٹھا کر کھا رہے ہو..... کچھ پیہ ہی نہیں کھہر گئے۔“

”کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں۔“

”جی ہاں.....!“

”تب تو آپ کے کھانے کا منظر دلچسپ ہوتا ہوگا۔“

”اجی میں کیا..... ہی ہی ہی۔“ قاسم خاکسارانہ انداز میں ہنسا۔

”تو ایسا سمجھئے..... بارہ مرغ..... کچھ اسٹیک..... اور بقیہ سلائیز وغیرہ سے کام چلائیے۔“

”نہیں چلے گا.....!“ قاسم کا لہجہ بے حد معنوم تھا۔

”بتائیے..... میں آپ کے لئے کیا کر سکتی ہوں۔“ عورت یک بیک سنجیدہ ہو گئی۔

”م..... میرے لئے۔ یعنی کہ آپ ہی ہی ہی۔“ قاسم نے دانتوں میں انگلی دبائی

لیں چپکائیں۔

مید کا جی چاہا کہ اٹھ کر کم از کم پچاس جوتے رسید کرے۔

”یہاں میری ایک عزیزہ کے پاس گیارہ درجن بطخیں ہیں جب تک آپ بارہ مرغ ختم

ہائے میں آٹھ بطخیں منگوا لوں گی۔“

”بطخ بھی لذت بخشتی ہے۔“ قاسم نے کہا اور اس طرح منہ چلانے لگا جیسے بطخ کے گوشت

دلی دانتوں کے درمیان ہو۔

”آپ کہاں تکلیف کریں گی محترمہ۔“ کاؤنٹر کلرک جلدی سے بول پڑا۔

”ہمارے پاس گوشت سے تیار کی جانے والی اور بھی بہت سی اشیاء مل سکیں گی۔ صاحب

مل سے کچھ منتخب کر لیں گے۔“

”اے تو تمہارا دم کیوں نکل رہا ہے۔“ قاسم آنکھیں نکال کر بولا۔

”حضور عالی..... ہوٹل کے کچھ قوانین بھی ہیں۔“

”پہلے ہم ہیں..... پھر کواٹین اور کوانا ہیں۔“ قاسم سینے پر ہاتھ مار کر دھاڑا اور کاؤنٹر

کلرک کی گھٹھی بندھ گئی۔

”جانے دیجئے..... جانے دیجئے۔“ عورت آہستہ سے بولی اور قاسم یلخت نرم پڑ گیا۔

عورت نے پھر کہا۔ ”ممکن ہے یہاں گاہکوں کی لائی ہوئی چیزیں نہ پکائی جاتی ہوں۔“

”یہی بات ہے محترمہ۔“ کلرک نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

”چلے..... آج اس طرح گزارا کر لیجئے۔ کچھ کولڈ بیف وغیرہ لے لیجئے گا۔“

”اللہ مالک ہے۔“ قاسم نے ٹھنڈی سانس لی پھر جھلا کر بولا۔ ”تو وہ بارہ مرتبہ“
دونا..... بھونخ کے مارے میرا دم نکلا جا رہا ہے۔“

”یہیں یا اپنے کمرے میں کھانا پسند کریں گے۔“

”چلئے..... وہیں اوپر چلیں۔“ عورت نے کہا۔ پھر کاؤنٹر کلرک سے بولی۔ ”میرا کھانا“
اوپر ہی بھجوا دیئے۔“

”بہت بہتر محترمہ۔“

پھر حمید نے دیکھا کہ قاسم لڑکھڑاتا ہوا اس عورت کے پیچھے چلا جا رہا ہے۔ اس میں حمید نے کافی منگوائی تھی اور اب ٹھنڈی کافی کی چسکیاں اُسے گراں گزرنے لگی تھیں۔ سوچ رہا تھا کہ عورت قاسم کے لئے بالکل ہی اجنبی نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ اُسے اپنے قریب کر بُری طرح گڑ بڑا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا اس نے پہلے بھی کہیں اسے دیکھا وہ تو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ خود قاسم ہی اس کا تعاقب کرتا ہوا یہاں تک پہنچا ہو اور اس تنازعہ کی ترغیب خود عورت ہی کی طرف سے ہوئی ہو جسے قاسم جیسا کوڑھ مغز ترغیب کی حیثیت نہ سمجھ سکا ہو۔

عورت اس معاملے میں فطری طور پر تربیت یافتہ ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے مادہ جانوروں کے جسم کی بومیوں دور تنہا بھٹکنے والے ز جانوروں کو ان کی طرف کھینچ لاتی۔ بالکل یہی ہوا ہے۔ وہ خود ہی اُسے اپنے پیچھے لگا لائی۔

حمید مٹھیاں بھینچ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

فائر

کافی ختم کر کے حمید پھر اٹھا..... کاؤنٹر پر جا کر کافی کی قیمت ادا کی اور باہر نکل آیا۔

اپنی شکل میں دوبارہ ڈانگ ہال میں واپس جانا چاہتا تھا اس لئے ضرورت تھی کہ جیکٹ کو لے لیا جائے۔ لہذا وہ کسی ایسی جگہ کی تلاش میں چل پڑا جہاں کسی کی نظر نہ پڑ سکے۔

تھوڑے ہی فاصلہ سے ڈھلان شروع ہو گئی تھی جس کے سرے پر چیز کے درختوں کی غار نصف دائرے کی شکل میں دور تک پھیلتی چلی گئی تھی۔ اس نے سوچا ادھر ہی سہی۔ دیکھنے اے سمجھیں گے رات کے کھانے کے بعد چہل قدمی ہو رہی ہے۔ لہذا وہ ٹہکتا ہوا اسی طرف ہلی پڑا۔

آسمان میں بادل نہیں تھے اس لئے اندھیرا گہرا نہیں تھا۔ دفعتاً حمید نے محسوس کیا جیسے بیڑوں کے درختوں کے درمیان کوئی ڈھلان میں اتر رہا ہو۔ تھا وہ دھندلا سا ہولی ہی لیکن انداز ایسا تھا جیسے اُسے بھی دیکھ لئے جانے کا خدشہ لاحق ہو۔ حمید ایسی جگہ پہنچ چکا تھا جو فزرو کی روشنیوں کی زد سے دور تھی۔ لہذا وہ بڑی پھرتی سے سینے کے بل زمین پر لیٹ گیا۔

پھر سینے کے بل زمین سے لگ کر آگے گھسنے کی رفتار خاصی تیز تھی۔

ہر چند کہ وہ سایہ اب نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا لیکن حمید کو اندازہ تھا کہ وہ ڈھلان کے سرے پر کسی جگہ غائب ہوا ہے۔ وہ رینگتا ہوا ٹھیک اسی جگہ جا پہنچا۔ نیچے تک ڈھلان صاف نظر آ رہی تھی جیسے ہی اُس نے سر کو اٹھا کر دور تک دیکھنے کی کوشش کی نیچے سے آواز آئی! ”چلے آؤ فزندہ۔“

”لا حول ولا قوۃ.....!“ وہ آہستہ سے بڑبڑایا۔ ”کیا مصیبت ہے۔ یہ بھی وہ حضرت ٹکے..... کہیں بھی دھول دھپے کا موقع میسر نہیں آتا..... آخر ہاتھ پیر میں جان کیسے آئے گی۔“
”اتری سے آواز کی جانب ڈھلان میں اترتا چلا گیا۔“

دوسرا سایہ گھٹنوں کے بل بیٹھا نظر آیا..... حمید نے اس کے قریب ہی پہنچ کر دم لیا۔

”سخت قسم کی ٹالانٹھیاں سرزد ہو رہی ہیں تم سے۔“ سائے یا فریدی نے کہا۔ ”یہی اطلاع“

”سینے کے لئے اس وقت میں نے تمہیں اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔“

”میرا قصور.....!“ حمید کے لہجے میں زہریلا پن تھا۔

”تم اس کے کمرے میں کیوں گئے تھے؟“

”اس نے مجھے اشارہ کیا تھا۔ اُسے تشویش تھی کہ آپ کی کسی اسکیم کے برخلاف میں

یہاں میک اپ کے بغیر کیوں پایا جاتا ہوں۔“

”اور پھر اس نے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہوگا۔“

”جناب! صرف زیبا ہی نہیں بلکہ ایک عدوِ ثریا کا سہرا بھی میرے ہی سر ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“

”قاسم کو دیکھا آپ نے.....؟“

”ہاں..... مجھے حیرت ہے۔“

”اوہ..... گرائڈیل عورت بھی نظر سے گزری یا نہیں۔“

”ہاں..... آں..... اُسے بھی دیکھا تھا۔“

”اس نے ہوٹل کے رجسٹر میں اپنا نام درج کر لیا ہے اور میرا دعویٰ ہے کہ وہ قاسم کو

اپنے ساتھ لائی ہے۔“

پھر حمید نے ان دونوں کے بارے میں جو کچھ سنا اور دیکھا تھا دہراتے ہوئے کہا۔ ”میرا

تو یہی خیال ہے کہ عورت کی ترغیب خفی ہی اُسے یہاں تک لائی ہے اور وہ احمق یہی سمجھ رہا ہوگا

کہ وہ اس کے علم میں آئے بغیر اُس کا تعاقب کرتا رہا ہے۔“

”ہو سکتا ہے۔“ فریدی آہستہ سے بڑبڑایا۔ ”لیکن ایسے حالات میں یہ محض اتفاق تو نہیں ہو سکتا۔“

”کیسے حالات میں۔“

”میں کیا بتاؤں کہ زیبا سے کتنی بڑی غلطی سرزد ہوئی ہے۔ درزی خانہ ختم ہونے کے بعد

اُسے ایسی مہمات میں میک اپ کا سہارا ضرور لینا چاہئے تھا۔“

”درزی خانہ.....!“ حمید نے طویل سانس لی۔

”اُس کے متعلق بھی تمہیں سب کچھ معلوم ہو چکا ہوگا۔“

”اُسے کیا پڑی تھی کہ خود ہی بتاتی..... اور میں اس شرمندگی کی وجہ سے پوچھ نہیں سکا کہ

با خیال کرتی..... یہی ناکہ کرل فریدی کو اپنے نائب پر اعتماد نہیں۔“

”ناصے عقل مند ہوتے جا رہے ہو۔ حالانکہ میں نے تمہیں محض اس بناء پر نہیں بتایا تھا

بہن تم آزادانہ طور پر اپنی عقل نہ استعمال کر بیٹھو اور کھیل بگڑ جائے۔ اچھی بات ہے۔ آؤ

ساتھ۔ اب تمہیں بھی بتا ہی دوں۔“

پھر وہ دونوں ڈھالان پر اترتے چلے گئے۔ حمید پیچھے تھا اور فریدی اندھیرے میں بھی ایسی

انسانی سے راستہ طے کر رہا تھا جیسے بارہا دیکھا بھالا راستہ ہو۔

حمید خاموشی سے اُس کی تقلید کرتا رہا۔ کئی بار گرتے گرتے بچا تھا۔ آخر جھنجھلا کر بولا۔

”ہاں جانا ہے۔ کب تک چلنا پڑے گا۔“

”بس زیادہ دور نہیں۔“ فریدی نے جواب دیا۔ آواز میں تھکن کے آثار نہیں پائے

نے تھے۔

پھر جلد ہی حمید کو اپنا بچپن یاد آ گیا۔ یاد یوں آیا کہ اب وہ گھٹنوں اور ہتھیلیوں کے بل

بنامار کے چھوٹے سے دہانے میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس سے قبل فریدی سے

ایسی حرکت سرزد ہوئی تھی۔ وہ آگے تھا اور نارنج کی روشنی میں حمید کو راستہ دکھاتا جا رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ایسی کشادہ جگہ پہنچ گئے جہاں حمید اطمینان کی سانس لے سکتا تھا۔

”یہاں اطمینان سے گفتگو کر سکیں گے۔“ فریدی نے کہا اور نارنج بجھا دی۔

”اندھیرے ہی میں۔“

”کیا اندھیرا تمہاری شجاعت پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔“

”آپ کی صورت دیکھے بغیر باتوں میں مزہ نہیں آتا۔ ہائے جب پھول کی پگھڑیوں کے

سہونٹ جنبش کرتے ہیں اور کسی بات پر زور دیتے وقت اوپری ہونٹ نیم دائرے کی شکل

تیار کرتا ہے تو کچھ نہ پوچھئے کہ دل پر کیا گزرتی ہے۔“

”شٹ اپ..... وقت کم ہے میں تمہیں کچھ ہدایات دینا چاہتا ہوں۔ غور سے سنو۔ اب

”بالکل تھا..... تھا نہیں بلکہ تھی۔“

”کون.....؟“

”سب سے زیادہ متین اور بنجیدہ لڑکی فرزانہ۔“

”اوہ..... یہ کیسے ممکن ہے۔ مطلب یہ کہ کیا ہمارے درزی خانے کے ذریعے بھی یہ کام

ہے۔“

”قطعی ہو چکا ہے۔“

”یہ کیسے ممکن ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے۔“ حمید مضطربانہ بڑبڑایا۔

”وہ دن یاد کرو جب ایک گاہک عورت نے شلوار کی موریوں کے بارے میں شور مچایا

کا کہنا تھا کہ موریوں میں بکرم نہیں رکھا۔ موریایں زیبائی بناتی تھی۔ دونوں میں جھڑپ

ہوئی۔ تم زیبا پر بگڑے تھے اور فرزانہ نے یہ کہہ کر بات ختم کرادی تھی کہ اب موریایں وہی

ہوں گی اور وہ اس کی ایکسپریٹ ہے۔ پھر اُس کے بعد ہی سے وہ کاروبار شروع ہو گیا تھا۔

اب بکرم کی تہہ میں کوکین رکھی جاتی تھی۔“

”سرہٹ لینے کو جی چاہ رہا ہے اس وقت۔“ حمید نے کھسیانے انداز میں کہا۔

فریدی کچھ نہ بولا۔ تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر اُس نے کہا۔

”اس تجربے کے بعد درزی خانہ ختم کر دیا گیا اور فرزانہ جھکے کی حوالات کے سپرد کردی گئی۔“

”تو کیا عورتوں میں کوکین بہت زیادہ رواج پاری ہے۔“

”کپڑے سلوانے والیاں براہ راست گاہک نہیں ہوتیں بلکہ وہ بھی گروہ ہی سے تعلق

ہیں۔ گولڈن ایرو کی منشیات دراصل کئی ہاتھوں سے گزر کر گاہکوں تک پہنچتی ہیں۔ یہی وجہ

ہے کہ ابھی تک سرگروہ پر ہاتھ نہیں ڈال سکا۔“

”تو یہ کھڑاگ اسی لئے پھیلا یا ہے آپ نے کہ سرگروہ پر ہاتھ ڈال سکیں۔“

”یقیناً..... اس کے بغیر گروہ نہیں ٹوٹ سکتا۔“

فریدی شاید کچھ سوچنے لگا تھا۔ حمید بھی کچھ نہ بولا۔ اب اس کا ذہن سارہ رحمان کی

زیبا سے دور ہی رہنا۔ تمہارے لئے میک اپ میں ہونا چنداں ضروری نہیں ہے۔ البتہ اگر
والے میک اپ کو جب چاہو بروئے کار لا سکتے ہو۔ قاسم سے دور ہی رہنے کی کوشش
اسپرنگ والے میک اپ کو تم اس سے بچنے کے لئے استعمال کر سکتے ہو۔ پھر تمہیں
دیکھنا ہے کہ وہ عورت اُسے یہاں کیوں لائی ہے۔“

”میں درزی خانے کے بارے میں کچھ سننے کا منتظر ہوں۔“

”ہوں..... اوں..... بتاؤں گا۔“ فریدی نے کہا اور کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔ ”میں

دیر سے گولڈن ایرو کی فکر میں تھا اور گولڈن ایرو والے بھی میری فکر میں تھے۔ انہیں دو آدمی

اپنی راہ سے ہٹانا تھا اور اتفاق سے وہ دوسرا آدمی بھی میں ہی ہوں۔“

”کیا مطلب.....؟“

”انہیں فریدی کی فکر بھی ہے اور اُس دوسرے آدمی کی زندگی کے بھی خواہاں ہیں

نے اُن کے مقابلے میں گولڈن ایرو ہی کے نام سے اپنا کاروبار بھی چلا رکھا ہے۔“

”میرے خدا..... تو اب آپ جس فروشی پر اتر آئے ہیں۔“

”سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ بہر حال میں عرصہ سے اُن کی فکر میں تھا۔ اسی دوران میں

نے مجھ سے مدد طلب کی۔ اُس کا خیال ہے کہ گولڈن ایرو کا ہیڈ کوارٹر نصیر آباد ہی میں۔

اُس نے اُن کی تجارت کا ایک طریقہ کار دریافت کر لیا تھا۔ حالانکہ وہ طریق کار پہلے ہی

میرے علم میں تھا۔ بہر حال اُس کے ایک نئے نظریے کی تصدیق کرنے کے لئے مجھے

خانہ قائم کرنا پڑا تھا۔“ فریدی خاموش ہو گیا۔

”میں جاگ رہا ہوں۔“ حمید بولا۔

”وہ درزی خانوں کے ذریعے بھی کاروبار کرتے ہیں۔ یہ میں پہلے سے جانتا تھا۔

اس پر مصر تھی کہ جب بھی کہیں کوئی نیا درزی خانہ قائم ہوتا ہے گروہ کا کوئی فرد اس میں ضرور

بنالیتا ہے۔ اس طرح کہ درزی خانے کے مالک یا دوسرے ملازموں کو اس کی خبر تک نہیں ہوتی

”اوہ..... تو کیا ہمارے یہاں بھی ایسا کوئی آدمی تھا۔“

طرف منتقل ہو گیا تھا۔ وہ بھی تو گولڈن اریو ہی کا شکار ہوئی تھی۔ اُس کا کیا قصہ تھا.....
پروفیسر.....!

”اب تم سارہ رحمان کے متعلق سوچ رہے ہو گے۔“ دفعتاً فریدی بولا۔

”خدا کی پناہ..... اندھیرے میں آپ کو اس قدر بھائی دیتا ہے؟“ حمید بوکھلا کر پوچھا۔

”اُس کے بارے میں پھر بتاؤں گا۔ وقت کم ہے۔ اب آؤ قاسم کی طرف۔ یہ

ہے کہ وہ یاسین قزلباش کی شناخت کے لئے یہاں لایا گیا ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“

”تم بھی شے میں مبتلا رہ چکے ہو کہ وہ رضیہ ہی ہو سکتی ہے۔“

”یقیناً.....!“

”تو پھر کیا وہ بھی اس فکر میں نہ ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ فرزانہ کی گرفتاری ان سے

نہ ہوگی۔“

”پوشیدہ تو صرف مجھ سے رہی ہے۔“ حمید جل کر بولا۔

”جچ پوچھو تو مجھے اسکے بعد سے کبھی اتنی فرصت ہی نصیب نہیں ہوئی کہ تمہیں کچھ بتا

”اب مجھے کیا کرنا ہے۔“

”زیبا کو فرارو سے ہٹا دو..... اگر وہ اُسے اغواء کر لینے میں کامیاب ہو گئے تو شاید

ہی نہ چھوڑیں۔“

”ہٹا کر کہاں لے جاؤں؟“

”تم خود اُسے دلکشانک پہنچا آؤ..... پھر وہاں سے کہیں اور منتقل کر دوں گا۔ نہ

اسپرنگ والے میک اپ میں رہ کر انجام دے سکتے ہو۔ اس کا خیال رہے کہ اُسے دلا

لے جاتے وقت کوئی تمہارا تعاقب نہ کر سکے۔“

”تو پھر اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں کہ وہ بھی میک اپ میں ہو۔“

”جو مناسب سمجھو کرو.....!“

”اُسے میک اپ کرنا نہیں آتا اور..... اور میں کسی نامحرم عورت کے گال کیسے چھو سکوں

گا۔ معاذ اللہ.....!“

”اٹھو اور باہر نکلو.....!“ فریدی نارنج روشن کرتا ہوا بولا۔ ”تم فرارو ہی میں مقیم رہو گے۔

بغیر میک اپ.....!“

”قاسم..... میری جان کو آ جائے گا۔“

”پرواہ مت کرو..... تمہیں اُس سے یہ بھی تو معلوم کرنا ہے کہ وہ یہاں پہنچا کس طرح۔

”سری بات۔ کل یہاں کی پولیس مونٹا چنگیزی کو تلاش کرے گی اور پولیس ہیڈ آفس میں کیپٹن

حمید کا انتظار کیا جائے گا۔ کیپٹن حمید کے علاوہ اور کوئی اس کا بیان نہیں لے سکے گا۔“

”واقعی..... یہ دوسری ہوئی۔“ حمید ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”میرا سارا دھیان تو زیبا کی

طرف ہو گا۔ مونٹا میں کیسے دلچسپی لے سکوں گا۔“

”یکومت..... وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ تمہیں محتاط رہنا پڑے گا۔ بیان من وعن لکھنا.....

جرح مت کرنا۔“

”ظاہر ہے آپ کے بیان پر جرح کی ہمت کسے ہو سکے گی۔“

”چلو.....!“ فریدی نے اُسے غار کے دہانے کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔

غار کے دہانے پر پہنچ کر فریدی نے اُس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ پھر حمید نے وہیں اپنی

بیکٹ الٹی تھی اور فرزانہ کی طرف چل پڑا تھا۔

ڈائینگ ہال خاصہ آباد تھا۔ حمید کاؤنٹر کی طرف توجہ دیئے بغیر زینوں کی طرف بڑھتا چلا

گیا۔ پھر اچھی طرح یقین ہو جانے کے بعد کہ اُس کا تعاقب نہیں کیا جا رہا اُس نے زیبا کے

”روازے پر دستک دی تھی۔“

زیبا نے اُس وقت تک دروازہ نہیں کھولا تھا جب تک اُس کی آواز نہیں سن لی۔

حمید نے اُسے فریدی کی ہدایات کے متعلق بتاتے ہوئے کہا ”میک اپ کا معمولی سا

نامان میرے پاس موجود ہے۔ اگر کہو تو.....؟“

”میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ مجھے اس کا سلیقہ نہیں۔“

”تو پھر میں کیسے کر سکوں گا۔“

”کیوں..... آپ کیوں نہ کر سکیں گے۔“

”ارے بھئی..... یہ گال وال سب چھوٹے پڑیں گے؟“

”تو کیا ہوا؟“

”اگر کچھ نہیں ہوا..... تو..... تو..... تو.....!“

”حمید صاحب ہم دونوں کا عہدہ ایک ہی ہے۔“

”لیکن ایسے حالات میں میرے لئے عہدہ برآ ہونا مشکل ہوگا۔“

”الفاظ سے نہ کھیلے..... کام کیجئے۔“

”نک..... کام..... اچھی بات ہے۔ میں ابھی آیا۔“ اس نے کہا اور وہاں سے نکل کر

اپنے کمرے میں چلا آیا۔

پھر ایک گھنٹہ بعد وہ اس کے ساتھ فزارو سے اس طرح باہر نکل رہا تھا جیسے وہ دونوں

ریکریٹیشن ہال میں بیٹھ کر بہت زیادہ پی گئے ہوں۔ حمید کی ناک کے تھنوں میں اسپرنگ موجود

تھے اور زیبا کی شکل بدلی ہوئی تھی۔

وہ اپنا سارا سامان اُسی کمرے میں چھوڑ آئی تھی۔ دلکشا سے فون پر فزارو کے کاؤنٹر کلرک

کو آگاہ کیا کہ وہ رات باہر ہی گزارے گی۔

دلکشا کے ڈائننگ ہال میں بھی گھٹی آبادی نظر آئی تھی۔ شاید ایک بھی میز خالی نہ رہے

ہوگی۔ اس لئے انہیں ریکریٹیشن ہال کا رخ کرنا پڑا۔ یہاں ٹوئیٹ ہو رہا تھا۔

”ناچو گی!.....“ حمید نے پوچھا۔

”ایسی امتحانہ حرکتوں سے مجھے دلچسپی نہیں ہے۔“

”لیکن نفسیاتی نکتہ نظر سے۔“

”سب بکو اس ہے۔ آپ یہ بتائیے کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔ سامان کے بغیر کمرہ حاصل

”دوسروں کو شبہات ہی میں مبتلا کرنا ہوگا۔“

”اور اگر شبہات کو یقین میں بدلنا ہو تو پھر ہمیں کمرہ لے ہی لینا چاہئے۔“

”کیپٹن..... پلیز سٹ اپ..... میں الجھن میں ہوں۔ مجھے کیا سوچنی تھی کہ آپ کو خواہ

اشارہ کیا تھا۔“

”کمرہ حاصل کرنے کے لئے۔“

”خدا کی قسم ہاتھ چھوڑ دوں گی۔ انپکٹر ریکھنا نہ سمجھنا۔“

”اچھا تو اب میں چلا.....!“

”ہرگز نہیں.....!“

”ارے..... تو پھر کیا کروں۔“

”پلوٹوئیٹ کریں گے۔“

”میری شکل دیکھ رہی ہو.....!“

”سچ..... بڑی کریہہ شکل ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے۔ ناک کی نوک کیسے اٹھ

ا ہے اور.....!“

”محترمہ..... پہلی ملاقات میں سب کچھ نہیں معلوم ہو جایا کرتا۔“

پھر انہیں سچ سچ تھوڑی دیر تک تو ٹوئیٹ کرنا پڑا تھا اور جب رائڈ ختم ہو جانے کے بعد وہ

بائروں کی جانب بڑھ رہے تھے ایک آدمی نے حمید سے ٹکرا کر آہستہ سے کہا تھا۔ ”باہر آؤ۔“

آواز فریدی کی تھی۔ لیکن حمید اس کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا۔ کیونکہ وہ تیزی سے دوسری

فاز میں گم ہو گیا تھا۔

حمید زیبا کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔

”کیا بات ہے..... کہاں.....؟“

”بس چلی آؤ..... زحمت سے بچ گئیں.....!“ حمید نے کہا۔

”کیا مطلب.....؟“

تو تاسم کی طرف دیکھتی تھی اور کبھی حمید کی طرف۔

آخر وہ تاسم کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”آپ کیا سوچ رہے ہیں۔“
تاسم چونک کر بڑبڑایا۔ ”کک..... کچھ نہیں۔“

پھر شاید اُس نے آہستہ سے یہی پوچھا تھا کہ وہ کون ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ تاسم کے ہونٹ ملتے حمید ایک بار پھر کھکا را۔ اس بار کھکار نے کا انداز وارنگ کا سا تھا۔

دفعتاً تاسم اُسے گھونسا دکھا کر بولا۔ ”کھکارے جاؤ سارے..... میں بھی دغ لوں گا۔“
”ارے ارے..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“ ثریا جلدی سے بولی۔

”اگر آپ کی جان پہچان کے ہوں تو انہیں بھی یہیں بلا لیجئے۔“

”ہر گز نہیں۔ اس سالے پر تو میں دس میل سے بھی پیٹاب نہیں کروں گا۔“

”آپ فکر نہ کیجئے محترمہ۔“ حمید نے ہنس کر کہا۔ ”اُن کی بیوی میری آپا جان ہیں۔“

”اُف.....!“ ثریا گڑبڑا گئی۔ پھر اُس نے تاسم کی طرف دیکھا۔

”جھوٹا ہے سالہ..... وہ میرے چچا کی لڑکی ہے اور یہ کسی اور کا لڑکا نہیں ہے۔“

”ہاں ہاں میں تو آسمان سے پڑکا ہوں۔“ حمید سر ہلا کر بولا۔ پھر ثریا کو مخاطب کر کے کہا۔

”شاید یہ حضرت آپ کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ ابھی تک ان کی شادی نہیں ہوئی۔“

”اے چوپ.....!“

”آپ بھی یہیں آجائیے نا.....!“ ثریا نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔

حمید اٹھ کر اُن کی میز کے قریب جا بیٹھا۔ تاسم قہر آلود نظروں سے اُسے گھورے جا رہا تھا اور شاید ثریا کی مخالفت کرنے کی ہمت نہیں پڑی تھی۔ لیکن چہرے سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ لاوا بھٹ پڑنے کو زور مار رہا ہے۔

بالآخر وہ دانت پیس کر گھونسا دکھاتا ہوا بولا۔ ”تم سالے میری قبر میں بھی گھس آنا.....“

”اچھا۔“

”بس چلی آؤ..... کان نہ کھاؤ۔“

وہ باہر آئے۔ سیاہ رنگ کی ایک چھوٹی سی گاڑی کے قریب کھڑے ہوئے اور انہیں اشارہ کیا۔ حمید پھر شےبے میں پڑ گیا کہ وہ فریدی ہے بھی یا نہیں۔ کیونکہ یہ پچھلی دو ملاقات والا چہرہ نہیں تھا اور ڈھلان پر اندھیرے میں صحیح طور پر اُس کی صورت نہیں دیکھ سکا تھا۔ کی روشنی میں بھی اس کی پوزیشن کچھ ایسی ہی رہی تھی کہ صورت نہیں دکھائی دی تھی۔

گاڑی کے قریب پہنچ کر حمید بولا۔ ”پہلے کچھ گنگنا کر سنائیے..... پھر یقین کر لوں گا۔“
”زیبا گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔“ اُس نے حمید کی بات کا جواب دینے کی بجائے کہا اور یقین آ گیا وہ فریدی ہی ہے۔

”اچھی بات ہے۔“ حمید نے ٹھنڈی سانس لے کر زیبا کو مخاطب کیا۔

”قسمت میں ہے تو پھر ملیں گے۔“

گاڑی چلی گئی۔ حمید کھڑا حسرت بھری نظروں سے اندھیرے میں گھورتا رہا۔ زیبا پسند تھی۔ اس نے سوچا تھا تنہائی کا احساس کچھ دنوں کے لئے رفع ہو جائے گا۔ لیکن تاسم نے کھیل بگاڑ دیا۔

”اچھی بات ہے۔“ وہ منھیاں بھیجنے کر بڑبڑایا۔ ”اب اس بھینے کو ذبح کرنا ہی پڑے اُسے یقین تھا کہ اس وقت تاسم فزارو کے ریکریشن ہال میں رتجگا منارہا ہوگا۔

فزارو پہنچ کر اس کا اندازہ غلط نہ نکلا۔ تاسم اور ثریا ریکریشن ہال ہی میں موجود تھے ابھی ایک دلچسپ اتفاق ہی تھا کہ حمید کو ٹھیک اُن کے قریب ایک میز خالی مل گئی۔

اس وقت حمید کے تھنوں میں اسپرنگ نہیں تھے اور وہ دور سے بھی پہچانا جاسکتا تھا۔ میز کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھے ہوئے حمید اپنے مخصوص اسٹائل میں کھکا را۔ تاسم نے چونکا اس کی طرف دیکھا اور پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُس کی روح قبض کر لی گئی ہو۔ ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔ حمید محسوس کیا کہ اُس کی اس از خود فگنی کی بناء پر ثریا بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئی ہے۔ اب ”

خون کے دھبے

عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ لوگ ایک دوسرے پر گر رہے تھے اور میزیں دھڑا دھڑا اٹھ رہی تھیں۔

”شروع ہو گیا۔“ قاسم حمید کو گھونسا دکھا کر بولا۔ ”ابے مخوسو تم لوغ جہاں جاؤ گے۔“
پھر حمید کی گونجدار ”ٹٹ اپ“ میں اس کی آواز دب کر رہ گئی۔ ثریا بُری طرح بدحواس نظر آ رہی تھی۔

”چلو..... نقلو یہاں سے۔“ قاسم اس کا بازو پکڑ کر بولا۔ ”نہیں تو ابھی یہ سالا یہاں تے مارے دروازے بند کر اڈے گا۔“

حمید اُن دونوں کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ دراصل سوچ رہا تھا کہ اس موقع پر اپنے اختیارات استعمال کرے یا خود بھی تماشائی بنارہے۔

پتہ نہیں کس نے فائر کیا تھا اور وہ چیخ کس کی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورا ہال خالی ہو گیا۔ ہوٹل کے عملے اور حمید کے علاوہ اب وہاں اور کوئی نہیں تھا۔

ان میں وہ کاؤنٹر کلرک بھی شامل تھا جس سے حمید کی گفتگو ہوتی رہی تھی۔

”کیوں جج جناب۔“ وہ حمید کے قریب آ کر ہکلا یا۔ ”کک کیا ہوا۔“

”میں خود بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ کیا ہوا.....؟“

”آپ نے بھی فائر کی آواز سنی تھی۔“

”بالکل سنی تھی۔“

”اور چیخ بھی۔“

”ہاں ہاں چیخ بھی سنی تھی۔“

”لل..... لیکن..... نہ کوئی لاش نہ کوئی زخمی.....!“

”یہ بھی کوئی سوچنے کی بات ہے؟“ حمید نے تلخ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”آپ خاموش بھی رہنے کچھ دیر۔“ ثریا بولی اور قاسم نے کچھ بددلتے ہوئے دوسری طرف پھیرا۔

”شاید آپ ان کے کوئی بے تکلف دوست ہیں۔“ ثریا نے حمید سے کہا۔

”ابھی لانت بھیجو ایسی دوستی پر.....!“ قاسم پھر پلٹ پڑا۔

”آپ میری بات نہیں مانیں گے۔“

”مانو غا.....!“ قاسم نے غرا کر پھر منہ پھیر لیا۔

”میں ان کا بے حد بے تکلف دوست ہوں۔ اتنا کہ ان کی بیوی کو بھابھی کی بجائے

جان کہتا ہوں۔“

”سچ جج ان کے سالے ہیں.....؟“

”آپ یکنیں کر لیں گی اگر اس نے ہاں کہہ دیا۔“ قاسم پھر بول پڑا۔

”پیارے بھائی میں خواہ مخواہ ہاں کہنے ہی کیوں لگا۔“ حمید نے بے حد نرم لہجے میں کہا

لیکن قاسم پھر اینٹھ کر منہ پھیر چکا تھا۔

”آپ لوگ انہیں تنہا کیوں سفر کرنے دیتے ہیں۔“ عورت نے پوچھا۔

”کیوں..... کیا ہوا.....؟“ حمید نے بوکھلاہٹ ظاہر کی۔

”کچھ نہیں..... ویسے اگر میں دخل اندازی نہ کرتی تو انہوں نے فزارد کو الٹ پلٹ کر ر

دیا ہوتا۔ میں عدد مرغ طلب کر رہے تھے اور فی الوقت بارہ سے زیادہ دستیاب نہیں تھے۔ پہلے

پورا دمبہ مانگا تھا۔“

”اس کے باوجود بھی آدمیوں کو کھانے دوڑتا ہے۔“ حمید نے سنجیدگی سے کہا۔

”بس چلے جاؤ۔“ قاسم مٹھیاں بھیج کر کھڑا ہوتا ہوا بولا۔ ”میں کہتا ہوں چلے جاؤ۔“

”ارے..... ارے..... بیٹھے..... یہ کیا ہے۔ لوگ کیا کہیں گے۔“ ثریا منمنائی۔

دفعتاً ایک فائر ہوا۔ ہال کے کسی گوشے سے ایک چیخ اُبھری اور قاسم ہانپتا ہوا بیٹھ گیا

حمید اچھل کر کھڑا ہو گیا تھا۔ پھر ہال میں بھگدڑ مچ گئی۔

”کیوں.....؟ کیوں.....؟“

”میں تو صرف یہ سوچ رہا تھا کہ لڑکیاں جب خوفزدہ ہو کر بھاگتی ہیں تو دیکھنے کی چیز ہوتی ہیں۔“
کاؤنٹر کلرک نے پہلے تو آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھا پھر زیر لب کچھ بڑبڑاتا ہوا اسٹنڈ
نیجری کی طرف متوجہ ہو گیا جو اُس سے کچھ کہہ رہا تھا۔

”لیس سر.....!“ اب وہ اُس کا بہت احترام کرنے لگا تھا کیونکہ مرحوم نیجری کی جگہ اُسی نے
سنجالی تھی۔

”دیکھو..... کونا..... کونا..... تلاش کرو.....؟“

حمید نے نیجری کی طرف غور سے دیکھا اور یہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ اُسے کس چیز کی تلاش ہے
”لاش جناب.....!“
”کیا ضروری ہے۔“

”ایسے مقامات پر جب بھی فار ہوتے ہیں تو مقصد قتل ہی ہوتا ہے۔“ نیجری نے کسی قدر
ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

”اچھی بات ہے تو تلاش کیجئے۔“

”آپ کون ہیں.....؟“

حمید نے اپنا کارڈ جیب سے نکال کر اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن یہاں
میں عبدالرشید ہوں..... اس کا خیال رہے۔“

نیجری کا وہ ہاتھ کانپ رہا تھا جس میں کارڈ تھا۔ اُس نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔
”جی بہت اچھا جناب۔“

اور کارڈ حمید کو واپس کر دیا۔ کاؤنٹر کلرک نے نیجری کی بدلتی ہوئی حالتوں سے اندازہ کر لیا
تھا کوئی خاص بات ہے۔ اس لئے اب حمید کو عجیب نظروں سے گھورے جا رہا تھا۔

”بات یہ ہے جناب عالی۔“ نیجری کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ بولا۔ ”شکار یوں سے کچھ
بعید نہیں ہے۔ پچھلے سال نشاط میں اسی طرح ایک فار ہوا تھا۔ لیکن اُس وقت کچھ نہیں معلوم ہوا

پھر دوسری صبح کچن میں ایک لاش پائی گئی تھی۔ جس کی کھوپڑی میں سوراخ تھا۔“

”اچھا تو پھر میں بھی اس تلاش میں حصہ لینا پسند کروں گا۔“

وہ آگے بڑھے۔ حمید کا رخ ایک کھلی ہوئی کھڑکی کی طرف تھا۔ کھڑکی میں سلاخیں نہیں تھیں۔
کا اندازہ تھا کہ وہ عمارت کے باہر سے زمین کی سطح سے پانچ فٹ کی بلندی پر ضرور ہوگی۔

قریب پہنچنے پر چوکھٹ کے پاس تازہ خون کا دھبہ دکھائی دیا۔

”دیکھئے.....!“ نیجری کا بپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میرا خیال غلط تو نہیں تھا۔ لاش یقینی طور
ری طرف پڑی ملے گی۔“

باہر اندھیرا تھا۔ نیجری تجویز تھی کہ انہیں دوسری طرف چل کر دیکھنا چاہئے۔ ریکریشن
سے بھاگنے والے باہر نہیں گئے تھے اس لئے ڈائننگ ہال میں تل رکھنے کی بھی جگہ نہیں رہ
تی۔

”میرا خیال ہے کہ انہیں روکے رکھا جائے۔“ حمید نے نیجری سے کہا۔

دیے یہاں اس وقت بھی دو ڈیوٹی کاٹنبل موجود تھے۔ میجر سعید اور ساجد پرویز کے
دل کی نگرانی اُن کے ذمے تھے۔ انہوں نے یہاں کی بھگدڑ کے بارے میں قریبی پولیس
اٹا کو بذریعہ فون مطلع کر دیا تھا۔

”میرے بارے میں کسی کو کچھ نہ معلوم ہونا چاہئے۔“ حمید نے نیجری سے کہا۔ ”آپ ان
نبیوں سے اپنے طور پر کہہ دیجئے کہ کسی کو باہر نہ جانے دیں۔“

”بہت بہتر جناب۔“

حمید اس وقت خود باہر نہیں نکلنا چاہتا تھا۔ اُس نے سوچا ہو سکتا ہے خود اُسی کے لئے کسی
اکال بھجایا گیا ہو۔

اُسے تو اس بھیڑ میں قاسم کی تلاش تھی۔ وہ اُسے ڈائننگ ہال میں ڈھونڈتا پھرا لیکن
ایک بالی نہ ہوئی۔ پھر اُس نے سوچا وہ عورت اُسے اوپر لے گئی ہوگی۔

زینے طے کر کے وہ اس راہداری میں پہنچا جس میں قاسم کا کمرہ تھا۔ دروازہ کھلا نظر آیا۔

پردے کے پیچھے روشنی تھی اور قاسم بڑے زور شور کے ساتھ اپنے ”ٹھانیں ٹھوکیں“ کے نعرے بیان کر رہا تھا۔

حمید نے دروازے کے قریب رک کر اونچی آواز میں کہا۔ ”کیا میں اندر آ سکتا ہوں۔“
اندرا خاموشی چھا گئی۔ پھر قدموں کی چاپ سنائی دیا اور کسی نے پردہ ہٹایا۔ یہ ثریا تھی۔
”اوہ..... آپ.....!“ وہ چپک کر بولی۔ ”اندرا تشریف لائے..... ہم دونوں آپ ہی بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ پتہ نہیں کیوں قاسم صاحب آپ کو پسند نہیں کرتے۔ اُن کا ہے کہ آپ سچ سچ ایسے ہی منحوس ہیں..... جہاں چلے جائیں وہاں لاشوں کے علاوہ اور دکھائی نہیں دیتا۔“

”اس کا خیال بالکل درست ہے۔ اُسکے خاندان کے مردے ہماری ہی فرم دفن کرتی ہے“
”آئیے..... آئیے..... اطمینان سے باتیں ہوں گی۔“

حمید کمرے میں داخل ہوا۔ قاسم منہ پھلائے اُسے قہر آلود نظروں سے گھورے جا رہا تھا۔
”تشریف رکھئے۔“ ثریا نے کہا اور حمید قاسم کے موڈ کی پرواہ کئے بغیر کرسی کھینچ کر بیٹھ کرے کی فضا پر بوجھل سا سکوت مسلط ہو گیا تھا۔ آخر حمید ہی نے خاموشی توڑی۔
”میں مخل تو نہیں ہوا.....؟“

”قطعاً نہیں! ویسے ہم یہ معلوم کرنے کیلئے بے چین ہیں کہ ریکریشن ہال میں کیا ہوا؟“
”ایک فائر..... ایک چیخ..... اُس کے بعد ہال خالی ہو گیا۔ نہ یہ معلوم ہو سکا کہ فائر نے کیا تھا اور نہ یہی پتہ چلا کی چیخ کس کی تھی۔“

”قاتل و مقتول کی تلاش جاری ہے۔“
”تو تم..... کیا یہاں میٹنگن چھپنے آئے ہو..... کاتل و کتول کی تلاش جاری ہے۔“
منہ ٹیڑھا کر کے جملے کئے لہجے میں بولا۔

”پتہ نہیں آپ لوگوں کے تعلقات کس قسم کے ہیں۔“ عورت ہنس پڑی۔
”میری جان کا دشمن ہے۔“ قاسم دانت پیس کر بولا۔

”پیارے بھائی کیوں خفا ہو مجھ سے۔“ حمید گھگھکیا۔
”اے جاؤ..... دگا بازی والی باتیں نہ کرو..... بڑے آئے قہنے والے پیارے بھائی۔“

باہر سے بھائی اندر سے قصائی..... لگایا کرو جھوٹ موٹ میرے جی کو۔“
”کیا جھوٹ بات کہی ہے..... پیارے بھائی میں نے۔“
”اے تو قیا یہ سچ ہے کہ میری شادی ہو گئی ہے۔“ قاسم نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں ایک خاموش اپیل تھی۔
”تم تو مذاق کا بُرا مان جاتے ہو۔ ابھی تو تمہارے والد صاحب کی بھی شادی نہیں ہوئی۔ تمہاری کہاں سے ہو جائے گی۔“

”والد صاحب کی بھی نہیں ہوئی۔“ عورت ہنس پڑی۔
”مطلب یہ کہ بیوی ہو کے مرنے کے بعد انہوں نے اب تک دوسری شادی نہیں کی۔“
”کہتے ہیں پہلے بیٹے کی ہو جائے پھر میں کروں گا۔“
”اچھا.....!“ عورت سر ہلا کر بولی اور قاسم بے حد ہشاش بشاش نظر آنے لگا اور آنکھوں کی آنکھوں میں حمید کا شکریہ ادا کرتا رہا۔

”آپ کا مشغلہ کیا ہے؟“ عورت نے حمید سے پوچھا۔
”یہ..... یہ..... تو.....!“ قاسم شاید تعارف کرانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن اُس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی حمید بول اٹھا۔ ”کمیشن ایجنٹ ہوں ایک فرم کا۔“
”بہت بڑے کمیشن ایجنٹ۔“ قاسم نے سر ہلا کر تائید کی اور حمید نے اطمینان کی سہانسی ل۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ابھی تک قاسم نے اس کے بارے میں عورت کو کچھ نہیں بتایا۔
”پتہ نہیں..... نیچے کیا ہو رہا ہے۔“ عورت نے پرتشیش لہجے میں کہا۔
”چلے چل کر دیکھیں۔“

”اب یہیں بیٹھے رہو۔“ حمید بولا۔ ”دروازے بند کر دیئے گئے تھے۔ پولیس ریوالور کے لئے جامہ تلاشیاں لے رہی ہوگی اور اب شاید کمروں کی بھی تلاشی لی جائے۔“

”تم نے بند کرائے ہیں دروازے۔“ قاسم نے پوچھا۔

”عقل کے ناخن لو..... میں کیوں بند کرتا۔“

”ارے ہاں..... تو بہ..... ہی ہی ہی..... بھول جاتا ہوں کہ تم کمیشن ایجنٹ ہو۔“

”اگر کمروں کی بھی تلاشی لی جائے گی تو پھر مجھے اپنے ہی کمرے میں ہونا چاہئے۔“

عورت بولی۔

”بالکل..... یہی میرا بھی خیال ہے.....!“ حمید نے کہا۔

”برابر ہی میں تو ہے ان کا کمرہ.....!“ قاسم ہنس کر بولا۔

عورت تیزی سے اٹھی اور باہر نکل گئی۔ حمید مضحکہ انداز میں قاسم کی طرف دیکھتا رہا۔

قاسم کے چہرے پر زلزلے کے آثار تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اب رویا اور تب رویا۔

آخر کچھ دیر بعد بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”حمید بھائی..... میں تمہارا گلام ہوں..... مجھے

جندہ رہنے دو گے یا نہیں۔“

”جگ جگ جو میرے لال..... تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں تمہاری زندگی کا خواہاں ہوں۔“

”پھر یہ سب کیا ہے۔“

”بہتر ہوگا کہ تم کاؤنٹر کلرک سے معلوم کر لو..... میں یہاں پہلے سے مقیم ہوں۔“

”تو پھر یہ بھی تو ظلم ہی ہوا نا کہ اقبیلے اقبیلے چلے آئے۔“

”میں ڈیوٹی پر ہوں۔ لیکن اگر تم نے میرے بارے میں اپنی محبوبہ کو کچھ بتایا تو اچھا نہیں ہوگا۔“

”الاقسم میں نے کچھ بھی نہیں بتایا..... چند تھوڑا ہی ہوں۔“

”اُس نے تو ضرور پوچھا ہوگا کہ آخر تم مجھے منحوس کیوں سمجھتے ہو۔“

”بس غلطی سے نکل گیا تھا زبان سے؟“

”کیا نکل گیا تھا۔“

”یہی کہ تم کھفیہ پولیس کے آدمی ہو۔“

”تب پھر کیا باتی چھوڑا تم نے ڈیوٹی۔“

”اے نام تھوڑا ہی بتایا ہے..... نام پوچھا تھا..... میں نے کہہ دیا عبدالغفور.....!“

”مالانکہ میرا نام عبدالرشید ہے۔“

”ایک میں عبدل ایک میں عبدل..... ٹھیکے سے..... دینا جائے گا۔“

”کیا دیکھا جائے گا۔“

”کہہ دوں گا کہ اُسے ٹھیک سے یاد نہیں۔ میں نے تو عبدالرشید کہا تھا۔“

”دوستی زیادہ پرانی نہیں معلوم ہوتی؟“

”بس آج ہی ملاکات ہوئی ہے۔“

”خدا کرے تمہارا یہ رومان کامیاب ثابت ہو۔“

”سچے دل سے کہہ رہے ہو حمید بھائی۔“ قاسم نے گلوگیر آواز میں پوچھا۔

”بالکل..... میں تمہارے لئے بہت مغموم رہتا ہوں۔“

قاسم نے شدت جذبات سے بے قابو ہو کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑے اور انہیں بے

اثر چوستا رہا۔

”اے..... بے یہ میں ہوں۔ حمید..... وہ تو کب کی جا چکی ہے۔“

”حمید بھائی..... الا قسم..... دنیا میں تمہارے علاوہ اور کوئی ہمدرد نہیں دیکھائی دیتا۔ قہمی قہمی

ہٹا ہوں قاش تم ہی میرے باپ بھی ہوتے۔“

”خیر..... خیر..... میں کوشش کروں گا۔ اس بار تمہاری زندگی سدھر جائے۔“

”حمید بھائی..... وہ بھی تو کچھ کچھ..... یعنی کہ.....!“

”میں سمجھ گیا..... وہ بھی تم پر مر مٹی ہے..... کیوں.....؟“

”لیکن کرو..... تمہارے آنے سے پہلے کہہ رہی تھی کہ اگر واقعی تمہاری شادی نہیں ہوئی

تو تمہیں اپنے ڈیڈی سے ملاؤں گی۔“

”تب تو وہ مارا.....؟“

”ہے نا.....!“ قاسم کی بانجھیں کھل گئیں۔ آنکھیں اس طرح چمکنے لگی تھیں جیسے پورے

جسم کی قوت ان میں کھنچ آئی ہو۔

”ہے نا۔۔۔!“ قاسم اُس کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر بولا۔

”لیکن۔۔۔!“ یک بیک حمید مغموم نظر آنے لگا۔

”یقین و یقین کچھ نہیں۔ سالے حمید بھائی گھپلا نہ قرو۔۔۔!“

”تم سمجھتے نہیں۔ اس کی طرف سے نہیں بلکہ تمہاری طرف سے تشویش ہے مجھے۔“

”ٹھیکے پر گئی تمہاری تفتیش و تفتیش۔۔۔! میں سمجھائے دیتا ہوں ہاں۔“

”اے تفتیش نہیں۔ تشویش۔۔۔!“

”کیا فرق پڑتا ہے۔۔۔ پہلے تشویش۔۔۔ پھر تفتیش۔۔۔ سالے ہزار کیڑے نکال کر رکھ دو

میں کچھ نہیں سنوں غا۔۔۔!“

”تمہارے بھلے کو کچھ کہنے جا رہا تھا۔ نہیں سننا چاہتے تو جہنم میں جاؤ۔“ حمید اٹھتا ہوا بولا۔

قاسم نے اُسے روکا نہیں تھا۔ وہ باہر نکلا چلا آیا۔ راہداری سنان پڑی تھی۔ اُس نے

کرے کی راہ لی۔

پھر تقریباً ایک گھنٹے کے بعد کسی نے اس کے دروازے پر دستک دی تھی۔ اُسے یقین تھا

”خانہ تلاشی لینے والے ہی ہوں گے۔“

لیکن دروازہ کھولنے پر اُسے حیرت ہوئی۔ وہ ثریا تھی۔ قاسم کی نئی دریافت۔

”کیا میں اندر آ سکتی ہوں؟“ اُس نے کہا۔

”ضرور۔۔۔ ضرور۔۔۔!“

”ناوقت تکلیف دہی کی معافی چاہتی ہوں۔۔۔!“

”تشریف رکھئے۔۔۔ میرے لئے وقت اور ناوقت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ رام گڈھ

سکا مقصد ہی یہی ہوتا ہے کہ کچھ دنوں کے لئے معمولات زندگی سے پیچھا چھڑا لیا جائے۔“

”دیکھئے جناب۔۔۔ آپ کا اندازہ غلط نکلا۔ وہ لوگ تو نیچے ہی پوچھ گچھ کر کے واپس چلے

سرکوں کی تلاشیاں نہیں ہوئیں۔“

”میرا تو یہی خیال تھا۔ ان کی جگہ میں ہوتا تو یہی کرتا۔ تو کیا وہ لوگ چلے گئے۔“

حمید کچھ نہ بولا۔ قاسم یہی کہتا رہا۔ ”یار اس دن میرے ستارے بڑے شاندار تھے

جب میں نے اُسے آرکچو میں دیکھا تھا۔ میری میز کے قریب ہی والی میز پر بیٹھی تھی۔“

بار نظریں ملی تھیں اور ہائے۔۔۔ حمید بھائی کیا پوچھتے ہو۔۔۔ دل تھا کہ یوں یوں۔۔۔ یوں۔“

یہاں قاسم نے دل کی حالت ہاتھوں سے بیان کرنے کی کوشش کی تھی۔

”اچھا تو پھر۔۔۔!“ حمید نے پوچھا۔

”اُس کے ساتھ ایک بوڑھی عورت تھی۔ وہ اس سے کہہ رہی تھی کہ وہ کل آٹھ بجے

ٹرین سے رام گڈھ جائے گی۔ تنہا سفر کرنا پڑے گا اس لئے اس کا دل گھبرا رہا ہے۔“

عورت اُسے سمجھانے لگی تھی کہ ڈرنے کی بات نہیں۔ اکثر عورتیں تنہا سفر کرتی ہیں۔ میں

اپنے دل میں قہا ہرگز نہیں۔۔۔ وہ تنہا سفر نہیں کرے گی۔ میں بھی اس کی دینج بھال کے لئے

ٹرین سے سفر کروں غا۔“

قاسم خاموش ہو کر مسکرایا اور آنکھ مارنے کی کوشش کی۔ لیکن دونوں آنکھیں ”مرا

گئیں“ وہ صرف ایک آنکھ بند کر لینے پر قادر نہیں تھا۔ ساتھ ہی دوسری بھی بند ہو جاتی تھی۔

حمید نے ہونٹ بھیج کر سر کو جنبش دی اور قاسم کو تیز نظروں سے گھورتا رہا۔ پھر قہقرا

بعد بولا۔ ”تو اس کا یہ مطلب ہے کہ تم وہیں سے اس کا تعاقب کرتے ہوئے آئے ہو۔“

”اور یہ دیکھو کہ ٹھیک اسی جگہ پہنچ گیا جہاں اُسے آنا تھا۔“

”غالباً اُس نے بوڑھی عورت سے یہ بھی بتایا ہوگا کہ وہ رام گڈھ میں کہاں ٹھہرے گا

”بلکل بتایا تھا۔ ورنہ میں سیدھا یہیں کیسے چلا آتا۔ بولو کیسی رہی۔۔۔ اب بھی ما۔

میری کھوپڑی کو یا نہیں۔ اس طرح پیچھا کیا کہ پتہ ہی نہ چل سکا۔ اس کو اور اب سمجھتی ہے

دونوں بس اتفاق سے مل بیٹھے ہیں۔“

”یقیناً۔۔۔ یقیناً۔۔۔!“ حمید سر ہلا کر بولا۔ ”تمہاری کھوپڑی لا جواب ہی نہیں

ساب ہے۔“

”جی ہاں..... گئے..... ریکریشن ہال کی ایک کھڑکی پر انہوں نے تازہ خون کا دھبہ لگایا تھا۔ دوسری طرف دیوار پر بھی خون کی کچھ چھینٹیں ملی ہیں۔ باہر کچھ دور تک انہیں کبھی خون کے دھبے ملے..... اُس کے بعد پھر کوئی سراغ نہ مل سکا۔ اُن کا خیال ہے کہ زخمی والا فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہوگا۔“

حمید نے جماعتی لی اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔

”یہاں آئے دن یہی کچھ ہوتا رہتا ہے۔“

”ہوتا ہوگا..... مجھے کیا۔“

”آپ ان کو کب سے جانتے ہیں۔“

”کن صاحب کو.....؟“

”میرا مطلب ہے قاسم صاحب کو۔“

”بہت دنوں سے۔“

”کیا سچ اُن کی شادی ہو گئی ہے۔“

”نہیں..... وہ تو میں اُسے چھیڑتا رہا تھا۔ کسی کی شامت آئی ہے جو اسے بیٹا دے؟“

”کیوں..... کیا.....؟“

”ارے گنگال ہو جائیں گے سسرال والے، اگر ایک وقت بھی اسے کھلانا پڑا۔“ وہ ہنس

”آپ کب سے جانتی ہیں۔“ حمید نے پوچھا۔

”آج یہیں ملاقات ہوئی ہے۔ سچ پوچھئے تو ان کی خوراک ہی نے مجھے ان کا

متوجہ کیا تھا۔“

”پھر اب کیا خیال ہے؟“

”کیا مطلب.....؟“

”مطلب یہ کہ بیٹو آدمی کی دوستی سے یہ اچھا ہے کہ آدمی کھتی باڑی کو ذریعہ معاش بنا

”میرا کیا بگڑتا ہے اگر کوئی بیٹو ہے؟“

”معمولی جسامت کی لڑکیاں اُس سے خوف کھاتی ہیں۔ اسی لئے اب تک اس کی شادی نہیں ہو سکی۔“

”یہ تو بڑی عجیب بات ہے؟“

”یہ تو آپ نے دیکھا ہی ہوگا کہ وہ کتنا سیدھا سادھا آدمی ہے۔“

”میں تو انہیں آدمی سمجھتی ہی نہیں۔ وہ صرف سیدھے سادھے ہیں۔“

”آپ کہاں سے تشریف لائی ہیں۔“

”جہاں سے قاسم صاحب آئے ہیں۔“

”اوہ..... تو ساتھ ہی آئے ہیں آپ دونوں۔“

”میرا اندازہ تو یہی ہے کہ ہم دونوں ایک ہی ٹرین سے آئے ہیں۔“

حمید نے پھر جماعتی لی اور اکتائے ہوئے انداز میں دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔

ٹھیک اُسی وقت کسی نے پھر دروازے پر دستک دی۔

”کم ان.....!“ حمید کے لہجے میں جھلاہٹ تھی۔

دوسرے ہی لمحے میں کسی نے دروازے کو نہ صرف دھکا دیا بلکہ بے تحاشا کمرے میں گھستا چلا آیا۔

قاسم کے علاوہ اور کون ہوتا؟ کمرے میں داخل ہو کر اُس نے اُن دونوں پر نظر ڈالی اور

کئی بت کی طرح ایک ہی جگہ پر استادہ ہو کر رہ گیا۔

اب وہ پلکیں جھپکائے بغیر حمید کو گھورے جا رہا تھا۔

اور حمید کا یہ عالم تھا کہ پینتھرہ بدلنے کے لئے تیار۔ اچھی طرح جانتا تھا کہ جس طرح

بگڑے ہوئے ہاتھی کو قابو میں لانا مشکل ہوتا ہے اُسی طرح قاسم کی ذہنی رو بہک جانے کے

بعد اس کا سنبھالنا بھی کارے دارد.....!

دفتر حمید نے ثریا کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”آپ خود دیکھئے۔ کون کہہ سکے گا کہ یہ شخص ابھی

تک کنوارا ہے؟ جو دیکھتا ہے شادی شدہ سمجھتا ہے؟“

قاسم کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ پھر عجیب شرمیلی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔ ساتھ ہی ایک انگلی بھی دانتوں میں جادبی۔

”اب دیکھئے“ حمید پھر بولا۔ ”اس میں اور ایک کنواری پردہ نشین میں کیا فرق باقی رہا ہے۔“
ثریا ہنس پڑی اور حمید نے قاسم سے کہا۔ ”میں انہیں بہت دیر سے باور کرانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ابھی تمہاری شادی نہیں ہوئی۔ میں نے تو محض چھپڑنے کے لئے اپنی کسی آبا جان کا تذکرہ کیا تھا۔“

”تو میں کیا جانوں۔“ قاسم نے بدستور دانتوں میں انگلی دبائے ہوئے اور نظریں نیچے کر کے کہا۔

”اب یہ دیکھئے۔“ حمید دانت پر دانت جما کر بولا۔ ”اگر میری شادی نہ ہوگئی ہوتی تو خود اس سے شادی کر لیتا۔“

”قاسم بالکل لوٹو یوں ہی کے سے انداز میں ”کھی کھی کھی“ کرتا ہوا باہر نکل گیا۔
ثریا دونوں ہاتھوں سے پیٹ دبائے بُری طرح ہنس رہی تھی۔
ادھر حمید نے ایسی سنجیدگی اختیار کر رکھی تھی جیسے ابھی اپنے کسی عزیز کو دفن کر کے ہو۔ ثریا ہنستی رہی۔ بدقت خاموش بھی ہوئی تو کافی دیر تک پیٹ دبائے بیٹھی رہی۔

”یہ آپ کو کیا سوچھی تھی۔“ آخر اس نے حمید سے پوچھا۔

”بہی حربہ..... وقت پر کار آمد ثابت ہوا تھا۔“

”میں نہیں سمجھی۔“

”اگر وہ پہاڑ غصے میں مجھ پر آ پڑتا تو کیا ہوتا..... یہ بھی سوچا آپ نے۔“

”لیکن یہ شادی وادی کی بات کیوں چھیڑی تھی آپ نے۔“

”پہلے بھی مجھ پر خفا ہوتا رہا تھا کہ میں نے ایک غلط بات آپ کے سامنے کیوں کہہ دی۔“
”بھلا مجھے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے ان باتوں سے۔“ ثریا نے کسی قدر ناخوشگوار لہجے میں

”آپ کو ہوا یا نہ ہو دلچسپی لیکن وہ تو ہر اس عورت پر عاشق ہو جاتا ہے جو اس کی خوراک کے بارے میں اس کے ساتھ ہمدردانہ رویہ رکھتی ہو۔“

”آپ کو شرم آتی چاہئے۔ اتنی بے تکلفی سے آپ اس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔“

”بے تکلفی کے بغیر کسی قسم کی بھی باتیں نہیں ہو سکتیں۔“

”مجھ سے غلطی ہوئی جو آپ کے پاس آئی.....!“ وہ پیر شیخ کراٹھتی ہوئی بولی۔

”آپ کی مرضی۔“ حمید نے جماعی لے کر لا پرواہی سے کہا۔

وہ چلی گئی۔ حمید نے دروازہ بند کر کے اندر سے بولٹ کر دیا۔

گھڑی دیکھی صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ پھر اس نے سوٹ سمیت بستر پر چھلانگ لگادی۔
غشی کی طرح نیند آئی تھی اور پھر آنکھ کھلی تھی ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز سے۔ وہ ریسیور

لا کر ماؤتھ پیس میں دھاڑا تھا۔

”مسٹر عبدالرشید.....!“ دوسری طرف سے کہا گیا۔

”ہاں..... کون ہے؟“

”پولیس ہیڈ کوارٹر پلینز..... ایس پی کوائنمئر.....!“

”اچھا.....!“ حمید نے کہا اور دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہونے کی آواز سن کر ریسیور لکڑیل پر شیخ دیا۔

شکار شکاری

رام گڈھ پولیس کے ہیڈ کوارٹر میں حمید مونا کا بیان لے رہا تھا۔ تین مختلف اسٹیوگرافرز اسے لکھتے جا رہے تھے۔ یہ بیان وہاں تک قطعی صحیح تھا جہاں سے فریدی نے اُن لوگوں پر قبضہ کیا تھا۔ مگر مسعود یعنی حمید کے ہاتھ پیر باندھ کر اس نامعلوم آدمی کی گاڑی میں ڈال دیا گیا تھا اور

”مجھے کہیں بھی جانا ہو۔“ مونا بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”مجھے پرواہ نہیں۔ لیکن خدا را

ایک نظر ڈیڈی کو دیکھ لینے دیجئے۔“

”ڈیڈی..... کیا مطلب.....!“

”کیا آپ کو نہیں معلوم کہ میرے ڈیڈی ہسپتال میں بیہوش پڑے ہیں۔“

”اوہ..... محترمہ..... مجھے افسوس ہے کہ اس سلسلے میں کچھ نہ کر سکوں گا۔ باس کے پیغام

میں ایسی کوئی ہدایت موجود نہیں ہے۔“

”میں انسانیت کے نام پر آپ سے التجا کرتی ہوں؟“

”کیا حرج ہے کیپٹن.....!“ ایس پی بولا۔ ”ہسپتال راستے ہی میں پڑے گا۔ میری

دانت میں تو آپ کو کوئی دشواری نہیں ہوگی۔“

”آپ نہیں سمجھ سکتے.....!“

”آپ کی مرضی.....!“ ایس پی کالجی کسی قدر ناخوشگوار تھا۔

”کیوں.....؟“ حمید چونک کر بولا۔ ”کیا آپ چاہتے ہیں کہ ایسا کیا جائے۔“

”میرا خیال ہے کہ آپ خود ہی لڑکی کے لئے ہمدردی محسوس کریں گے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے..... لیکن..... خیر آپ کہتے ہیں تو دو چار منٹ کے لئے ہسپتال میں رک

جائیں گے۔“

مونا نے گلوگیر آواز میں اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔

ایس پی صاحب اب حمید کی طرف نہیں دیکھ رہے تھے۔ لیکن حمید کی نظریں اُسی کے

چہرے پر تھیں۔

دفعۃً اس نے کہا۔ ”کیا ان چٹوں میں صرف اتنا ہی سا پیغام ہے۔“

”ہمارا ریسپونگ سیٹ ان دنوں کچھ گڑبڑا ہوا ہے۔“ ایس پی بولا۔ ”لہذا غیر ضروری

ٹریف بھی چھاپ ڈالتا ہے..... یہ دیکھئے۔“

اس نے پرنٹڈ چٹس حمید کی طرف بڑھادیں۔ حمید انہیں بغور دیکھتا رہا۔ غیر ضروری

مونا کو اس نے اپنے پاس ہی بٹھایا تھا۔

”پھر.....!“ مونا طویل سانس لے کر بولی۔ ”گاڑیاں چل پڑی تھیں۔ میجر سمیٹ

سیٹ پر پڑا ان لوگوں کو بے تحاشہ گالیاں دے رہا تھا۔ پھر شاید چار پانچ ہی میل گئے ہوں

کہ اچانک چاروں طرف سے فائرنگ ہونے لگی۔ پہلے ہی ہلے میں ہماری گاڑی کے دو

بیکار ہو گئے۔ وہ آدمی خود ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ گاڑی روکی تھی اور ڈھلان میں کود گیا تھا۔

اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے میجر سمیٹ کی چیخ بھی سنی تھی۔ عجیب افراتفری کا عالم تھا۔

سیٹ کا دروازہ تو کھلا ہی ہوا تھا۔ بوکھلاہٹ میں میں بھی باہر نکل کر ڈھلان میں دوڑتی چلی

مجھے ہوش نہیں کہ میں کتنی دور دوڑی تھی۔ بس فائروں کی آوازوں کا دھیان تھا۔ پھر میں نے

کو ایک بالکل ہی ویران جگہ پر پایا تھا اور فائروں کی گونج بہت ہی مدہم ہو کر میرے کانوں

پہنچ رہی تھی۔ اس کے بعد میں سارا دن انہیں چٹانوں میں بھٹکتی رہی تھی۔ صبح ہوتے ہو

پولیس پارٹی مل گئی اور اب میں یہاں ہوں۔“

حمید کو فریدی کی ہدایت یاد آئی اور اس نے بیان پر جرح نہیں کی۔

ایس پی کرائمر کے آفس میں یہ بیان لیا گیا۔ حمید پر تفکر انداز میں ایس پی کرائمر

طرف دیکھتا رہا۔

دفعۃً ایک آدمی کچھ ٹیلی پرنٹڈ چٹس لئے ہوئے کمرے میں داخل ہوا اور انہیں ایس

پی میز پر رکھ کر چلا گیا۔

حمید نے اُسے حیرت نظروں سے دیکھا اور پائپ میں تمباکو بھرنے لگا۔ ایس پی جو

چٹوں کو دیکھ رہا تھا سراسر اٹھا کر بولا۔

”اوہ..... آپ کے لئے پیغام ہے۔“

پھر اُس نے ان چٹوں کو بلند آواز میں پڑھنا شروع کیا۔ پیغام فریدی کی طرف سے

حمید کو ہدایت دی گئی تھی کہ پیغام موصول ہوتے ہی وہ مونا سمیت دھام مگر کیلئے روانہ ہو جائے

حمید نے طویل سانس لی اور مونا کی طرف دیکھنے لگا۔

حروف بھی تھے۔ لیکن ان کے ساتھ ہی ایک پوشیدہ پیغام اور بھی تھا جسے ایس پی نے غیر ضروری حروف کے زمرے میں شامل کر کے نظر انداز کر دیا تھا۔

فریدی نے اپنے وضع کئے ہوئے کوڈ میں اُسے مطلع کیا تھا کہ وہ ایس پی سے ہوشیار رہے۔ ”واقعی.....!“ حیدر طویل سانس لے کر بولا۔ ”آپ لوگوں کو بڑی دشواری پیش آئی ہوگی۔ مرمت کیوں نہیں کراتے اس کی۔“

”کئی بار ہو چکی ہے..... اب ابجیسی کا خیال ہے اس کی جگہ دوسرا سیٹ لگا دے۔“ حیدر نے سر کو جنبش دی اور گھڑی پر نظر ڈالتا ہوا مونا سے بولا۔ ”تو چلئے۔“

”اگر آپ کسی اور کو بھی ساتھ لے جانا چاہیں تو.....!“

”نہیں شکریہ۔“ حیدر نے ایس پی کی بات کاٹ دی۔ ”اگر یہ ضروری ہوتا تو پیغام میں

اس کی وضاحت ہوتی۔“

”آپ کی مرضی.....!“

پھر حیدر مونا سمیت اپنی اس ٹویسر میں آبیضا جس میں دو کی بجائے چار دروازے تھے اور وہ ایک میکنزم کو حرکت میں لانے سے فورسیئر کنورٹبل بھی بن سکتی تھی۔

پچھلے دروازوں میں باہر کی طرف ہینڈل نہیں تھے۔

مونا اپنی جانب والی کھڑکی پر جھک گئی۔ حیدر نے انجن اشارت کیا۔ گاڑی جھٹکے کے ساتھ

آگے بڑھی اور مونا بابائیں پہلو دبائے سیدھی بیٹھ گئی۔

”کیوں..... کیا بات ہے۔“ حیدر نے پوچھا۔

”میرا دل کمزور ہے..... اور آپ کو گیسر بد لے کا سلیقہ نہیں۔“

”مجھے افسوس ہے۔“

پھر ہسپتال تک کا راستہ خاموشی سے طے ہوا تھا۔ ان کی گاڑی کمپاؤنڈ میں داخل ہی ہوئی

تھی کہ ایک جیب بھی اُن کے برابر ہی رکی۔

”ہوں.....!“ حیدر نے ہونٹ بھیج کر طویل سانس لی۔

پھر قبل اس کے مونا اور حیدر گاڑی سے اترتے ایس پی کرائمر جیب سے اتر کر سیدھا ان طرف چلا آیا۔

”مجھے ابھی فون پر اطلاع ملی ہے کہ ڈاکٹر کو ہوش آ گیا ہے؟“ اس نے حیدر سے کہا۔

”اوہ.....!“ مونا نے پرست آواز میں چیخ کر دروازے کا ہینڈل گھمانا چاہا۔ لیکن ایس

پ نے باہر کے ہینڈل کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا۔ ”نہیں محترمہ۔ اب آپ واپسی ہی پر

نامے مل سکیں گی۔“

”کیوں..... کیوں.....؟“

”ہو سکتا ہے کہ آپ پر نظر پڑتے ہی وہ کسی قسم کے جذباتی بیجان میں مبتلا ہو کر دوبارہ اسی

نئی کیفیت میں نہ مبتلا ہو جائیں۔“

”میرا خیال ہے کہ ایس پی صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ حیدر بولا۔ ”میں بھی یہی کہوں

گا کہ اس وقت آپ پروفیسر کے سامنے نہ آئیے۔ شاید ہم شام تک واپس آ جائیں۔ میرا چیف

بالا اپنے طور پر جرح کرنا چاہتا ہے۔ ورنہ آپ کو تکلیف نہ دی جاتی۔“

”میرے خدا میں کیا کروں۔“ مونا ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ کر بڑبڑائی۔

حیدر نے دوبارہ انجن اشارت کیا اور گاڑی پھاٹک کی طرف موڑ لی۔ گاڑی کا انجن زیادہ

نور نہیں چماتا تھا اس لئے وہ مونا کی ہچکیاں اور سسکیاں صاف سنتا رہا۔

اس نے سوچا بعض پیٹے آدمی کو چتر بنا دیتے ہیں۔ اگر وہ چتر نہیں ہے تو کم از کم انہیں

ظاہر تو یہی کرنا پڑتا ہے کہ وہ چتر ہی ہیں۔

”چتر.....!“ اس نے بڑبڑا کر طویل سانس لی۔ وہ کسی طرح اسے دلاسا دینا چاہتا تھا۔

لیکن کیا کرتا۔ اس وقت اس کے لئے بالکل ہی اجنبی تھا۔ کیپٹن حیدر! مگر سعید کی حیثیت سے تو

”اس سے کسی قدر بے تکلف بھی تھا اور شاید وہ بھی اس سے گفتگو کرتے وقت اپنے ذہن کو

ایلا چھوڑ دیتی تھی۔“

اس نے سوچا کچھ بھی ہو وہ اُسے اس طرح نہ رونے دے گا۔ فادر ہارڈ اسٹون خواہ کچھ

کہے۔ پھر اس سے فرق بھی کیا پڑے گا۔ اگر وہ اسے بتا دے کہ میجر سعید بھی خود ہی تھا۔

”مونی!.....“ اس نے بلا خرا سے نرم لہجے میں مخاطب کیا۔ اور غالباً لہجے ہی کی بناء پر وہ نہ صرف چونک پڑی تھی بلکہ اس کی سسکیاں بھی قہم گئی تھیں۔

”مونی!..... ضبط کرنے کی کوشش کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے حق حاصل ہے کہ میں تمہیں اس لہجے میں مخاطب کروں۔ کیونکہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے بالکل ہی اجنبی نہیں ہیں۔“

”مم!..... میں!..... نہیں سمجھتی۔“ مونی بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

”میں میجر سعید ہوں۔“

”میجر سعید!.....“ وہ اچھل پڑی اور اسے اس طرح گھورنے لگی جیسے کسی ریچھ نے اپنے مہاتما ہونے کا اعلان کیا ہو۔

”لہل!..... لیکن آپ تو!.....!“

”کیپٹن حمید! اسی ٹیم سے تعلق رکھتا ہوں جس سے سارہ رحمان ملنا چاہتی تھی۔“

”لیکن میجر سعید!..... آپ دونوں کی شکلوں میں ذرا سی بھی مطابقت نہیں۔“

”اسے میک اپ کا کمال کہتے ہیں۔ میرا چیف اولڈ اسکول کے اس نصاب سے آج تک پیچھا نہیں چھڑا سکا۔“

”لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کی آواز سن کر میجر سعید کی آواز یاد آئی تھی مجھے۔“

”ہمیں بعض اوقات بڑے عجیب و غریب حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس لئے سبھی کچھ

کرنا پڑتا ہے۔ ہاں تو تم پولیس پارٹی کے ہاتھ کیسے لگیں۔“

”آپ کے ساتھی نے مجھے وہیں پہنچا دیا تھا جہاں پولیس پارٹی بھٹکتی پھر رہی تھی اور پھر

میں نے وہی سب کچھ کیا جو انہوں نے مجھے سمجھا دیا تھا۔“

”ایک بات پوچھوں؟ صحیح جواب دو گی۔“

”پوچھئے۔“

”تہہارا پہلا بیان جو تم نے میجر سعید کو دیا تھا اس سے بڑی حد تک مختلف تھا جو بعد کو تم

میرے ساتھی کو دیا تھا اس کی کیا وجہ تھی۔“

”مونا فوراً ہی کچھ نہ بولی۔ اس کے چہرے پر گہرے تفکر کے آثار تھے۔ پھر یک بیک اس

آنکھوں میں کچھ ایسی چمک نظر آئی جیسے اس نے کوئی اہم فیصلہ کیا ہو۔

”ہاں آپ ٹھیک کہتے ہیں اور یہ بھی سنئے کہ میں نے آپ کے ساتھی کو بھی پوری بات

بتائی۔“

”اوہو!..... تب تو تم نے میری عزت رکھ لی۔“ حمید بے حد خوشی کا اظہار کرتا ہوا بولا۔

”بھلا اس میں خوشی کی کیا بات ہے۔“

”میرا وہ ساتھی دراصل میرا چیف تھا جو مجھے بالکل اُلو سمجھتا ہے۔ بڑے عجیب انداز میں

دیکھتا تھا جب میں تم سے شکوہ کرتا کہ تم نے فلاں بات مجھے نہیں بتائی۔“

”اوہ تو اس کا یہ مطلب کہ وہ کرنل فریدی تھے۔“ مونا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”ہاں!..... آں!.....“ حمید نے طویل سانس لیتے ہوئے گاڑی کی رفتار کم کر دی اور پھر

سڑک کے کنارے لگا کر روک بھی دیا۔

ڈش بورڈ کے ایک خانے سے کنجیوں کا لچھا نکلا اور اپنی طرف کے دروازے کے ہینڈل

پر ٹکرائی لگائی۔ دروازے کا ستر الگ ہو گیا۔ مونا حیرت سے یہ کارروائی دیکھ رہی تھی۔ پھر

ناگن پر اس کی نظر پڑی جسے حمید خانے سے نکال کر اپنی گود میں رکھ رہا تھا۔

”یہ!..... یہ!..... کک!..... کیوں!.....؟“ وہ ہٹکائی۔

”فکر نہ کرو۔ احتیاط!..... آخر مجھے بھی تو سوچنا چاہئے کہ میرے چیف نے خواہ مخواہ دھام

اٹھائی کیوں طلب کیا ہے؟“

”اب تو میں بھی اسی الجھن میں پڑ گئی ہوں۔“ وہ کانپ کر بولی۔ ”دیکھئے۔ میرا دل بہت

بڑا ہے۔ کیا لڑائی جھگڑے کا امکان ہے۔ آپ کا وہ فائر مجھے کبھی نہ بھولے گا۔ میں تو کبھی

نہیں خاتمہ ہوا۔“

”وہ تو مجبوری تھی۔ اتنی شاندار ایکٹنگ کے بغیر میں کامیاب نہ ہو سکتا۔“ حمید نے کہا۔
گاڑی اسٹارٹ کر کے پھر سفر شروع کر دیا۔ مونا خاموشی سے ٹائی گن کو گھورے جاری تھی۔

”بہر حال۔“ حمید کچھ دیر بعد بولا۔ ”تم نے اچھا ہی کیا.....؟“

”کیا اچھا کیا.....؟“

”یہی کہ تم نے میرے چیف کو اصل واقعات کی ہوا بھی نہیں لگنے دی۔“

”یہ تو میں نے نہیں کہا۔ میں نے غالباً یہ کہا تھا کہ پوری بات انہیں بھی نہیں بتائی۔“
”لیکن اگر اب مجھے بتا دو تو کیسی رہے۔“

”مجھے بھی اب یہی سوچنا پڑا ہے کہ ڈیڑی سے کیا ہوا عہد توڑ دوں..... آخر کب تک لوگوں پر اسی قسم کے مظالم ہوتے رہیں گے۔ اگر میں اب بھی زبان بند رکھوں تو اسے وطن دشمن ہی کہیں گے۔“

”بالکل.....!“ حمید سر ہلا کر بولا۔

”سارہ کے پرس کاراز میں نے آپ کے چیف کو بتا دیا تھا.....!“

”ہاں..... وہ تو میرے سامنے ہی.....!“

”جی نہیں..... وہ تو اس کی اہمیت بتائی تھی۔ راز اب آپ کو بھی بتا دوں گی۔ قاتل چڑ-
کے دستا نے پہنچے ہوئے تھا۔ واجد سے کنکشن کے دوران میں داہنے ہاتھ کا دستانہ اتر گیا تھا۔
اس پر قابو پانے کے بعد اس نے اسی ننگے ہاتھ سے چاقو نکال کر اس کا زخرو کاٹ دیا۔ اس کا
ہاتھ خون سے تر ہو گیا۔ پھر وہ بے خیالی میں وہی ہاتھ زمین پر ٹیک کر اس کی لاش پر سے اٹھ
جلدی میں چاقو اٹھایا اور کھڑکی سے باہر کود گیا۔ سارہ جائے واردات پر موجود تھی۔ لیکن۔
دست و پا..... سبھی کھڑی رہی تھی۔ پھر کچھ دیر بعد جب اُسے ہوش آیا تھا اور اس نے دیکھا
کہ قاتل ایک پرانے اخبار پر اپنے خون بھرے ہاتھ کا نشان چھوڑ گیا ہے۔ گروہ کے لوگوں
خیال ہے کہ پولیس کے پاس اس کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ اسی لئے وہ اس طرح دغا بازی
ہے۔ جب جسے چاہا مار ڈالا۔ یہ ساری باتیں مجھے سارہ ہی نے بتائی تھیں۔ بہر حال سارہ

دانت میں اگر اس کے ہاتھ کا نشان پولیس تک پہنچ جاتا تو وہ اُسے ڈھونڈ نکالتی۔ لیکن اس نے
خیال بھی ظاہر کیا تھا کہ اس قسم کے گروہ پولیس کا تعاون حاصل کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ لہذا
اُسے کسی ایمان دار پولیس آفیسر کی تلاش تھی۔ وہ کہتی تھی کہ اگر وہ کسی طرح کرنل فریدی تک پہنچ
جائے تو اس کی یہ مشکل ضرور آسان ہو جائے گی۔ خدا اس کی روح کو سکون بخشے اس کی یہ آرزو
بہر حال پوری ہو گئی۔ میں نے شاید آپ کو یہ نہیں بتایا تھا کہ واجد اس گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔
سارہ اس سے لاعلم تھی۔ جب واجد نے یہ محسوس کر لیا کہ وہ اس کے بغیر ایک لمحہ بھی نہیں گزار
سکتی تو اس کو اسی راہ پر لگانے کی کوشش کی اور اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی رہا۔ سارہ کا
ڈسٹرل ہوم نشیات کی تجارت کا ذریعہ بن گیا اور سارہ ایک اعصاب زدہ لڑکی جیسی زندگی
زبان پر مجبور ہو گئی۔ اُسے نفرت تھی اس کا دوبار سے.....!“

سارہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی۔ حمید نے تھوڑی دیر بعد پوچھا۔ ”آخر سر گروہ نے واجد
کو مار کیوں ڈالا تھا۔“

”اس کی وجہ خود سارہ کو بھی نہیں معلوم تھی۔ حادثے کی ہدات کو واجد کو اپنی گاڑی میں اس
کے گھر پہنچانے گئی تھی۔ واجد نے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ کچھ دیر اس کے ساتھ ٹھہرے۔ اس
نے مکان کا قتل کھولا تھا اور وہ اندر گئے تھے۔ لیکن ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہوں
نے اس مقفل مکان کے اندر سیاہ پوش کو اپنا خطر پایا۔ سارہ اس کی حیرت انگیز صلاحیتوں کے
لفے پہلے ہی سن چکی تھی۔ لہذا اس کی موجودگی نے اُسے معمول سے زیادہ زور دیا۔ اُسے یہ
لگتا یا نہیں رہا تھا کہ ان دونوں کے درمیان گفتگو ہوئی تھی اور سیاہ پوش اس پر اچانک ٹوٹ
کیوں پڑا تھا۔“

کچھ دیر پھر خاموشی رہی۔

”یہ تو بتاؤ..... آخر تمہارے ڈیڑی کا کیا معاملہ ہے؟“ حمید نے پوچھا۔

”یہی تو میں نے آپ کے چیف کو بھی نہیں بتایا۔“

”ہرگز نہ بتانا۔“

”کیوں.....؟“ سارہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

”مطلب یہ کہ اس کا علم پہلے مجھے ہونا چاہئے۔“

”کچھ دیر پہلے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ آپ کو بتا دوں..... لیکن اب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔“

”تمہیں ٹوئیٹ کرنا چاہئے..... غم غلط کرنے کا بہترین طریقہ.....!“

”مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا..... کچھ بھی تو نہیں..... خلاء میں جھول رہی ہوں؟ نہ پیر رکھئے

لئے زمین ملتی ہے نہ بازوؤں میں قوت پرواز..... میرے خدا میں کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔“

”میں نے تو دراصل تمہارا دھیان بٹانے کی کوشش کی تھی۔“ حمید نے ہمدردانہ لہجے میں

کہا۔ ”لیکن تم خود ہی ایسے قصے کو نکال بیٹھیں۔“

”کیسے نہ نکال بیٹھتی جب کہ میں خود بھی اسی کہانی کا ایک کردار ہوں۔“

”اوہو..... میں تو تمہیں بالکل معصوم سمجھتا تھا۔“

”براہ راست نہیں..... میں دیڈی کے واسطے سے اس کہانی کا کردار بنی ہوں۔ میں نے

ان لوگوں کے لئے کبھی کوئی کام نہیں کیا۔ لیکن ڈیڈی..... اوہ..... میں..... کیا بک رہی ہوں۔“

”دل کا غبار نکالنا بے حد ضروری ہے مونی..... ورنہ تم بیمار پڑ جاؤ گی۔“

”میں تو مر ہی جانا چاہتی ہوں۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپاتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد حمید پھر اس کی ہچکیاں اور سسکیاں سنتا اور شدت سے پور ہوتا رہا۔ وہ تو سمجھ

تھا کہ باپ کے ہوش میں آنے کی خبر سن کر وہ کسی قدر باشا نظر آئے گی اور یہ سفر نمونہ سترن

ثابت ہوگا۔

”سنو..... میری طرف دیکھو..... اب تمہیں کیا پریشانی ہے۔ تم اپنے ڈیڈی کے ہوش میں

آنے کی خبر بھی سن چکی ہو۔ ان کی حالت بہتر ہوگی۔“

”میں ان کی زندگی نہیں چاہتی۔“ یک بیک مونا چیخ کر بولی۔ ”ان کی موت کی خواہاں ہوں۔“

”اوہ.....!“ حمید سنجیدہ ہو گیا۔

مونا کی ہچکیاں اور سسکیاں بھی رک گئیں تھیں۔ دفعتاً اس نے چیخ چیخ کر بکنا شروع کیا۔

”وہ ایک باعزت آدمی ہیں۔ اپنی رسوائی برداشت نہ کر سکیں گے۔ اس لئے میں چاہتی

ہاں وہ ہوش میں آنے سے پہلے ہی مر جاتے۔ سنو۔ انہوں نے مجھے اپنی بے بسی کی

جان سنائی تھی اور خواہش ظاہر کی تھی کہ میں کم از کم ان کی زندگی میں اس کا تذکرہ کسی سے نہ

اں۔ تم مجھے ان کی موت کی خبر سنا دو۔ میں سب کچھ بتا دوں گی۔“

”کاش میں تمہارے کسی کام آ سکتا.....؟ اب کچھ نہ پوچھوں گا۔“

پھر راستہ خاموشی سے طے ہوتا رہا۔ بھیگی بھیگی سی دھوپ چٹانوں پر بکھری ہوئی تھی اور وٹ

نے نکرانے والی ہوا سرد تھی۔

دفعتاً انہوں نے ہیلی کوپٹر کا شور سنا۔ بائیں جانب سے وہ سیدھا اسی طرف چلا آ رہا تھا۔

ازبچی تھی۔

”دیکھو..... یہ کدھر جاتا ہے۔“ حمید نے مونا سے کہا۔

گاڑی اس سے آگے نکل آئی تھی۔ مونا نے کھڑکی سے سر نکال کر دیکھا اور بولی۔ ”ٹھیک

اے پیچھے ہے۔“

”میرا چیف غافل نہیں ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“

”اوپر سے ہماری دیکھ بھال ہو رہی ہے۔“ حمید نے کہا اور مزید کچھ کہنے والا تھا کہ ایک

دار دھماکہ ہوا۔ گاڑی کو دھچکا سا لگا اور حمید بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میرے خدا.....

بڑا بلاست تھا۔“

ایکسپریٹر پر مزید دباؤ غالباً اس دھچکے ہی کا نتیجہ تھا اور گاڑی کی رفتار غیر ارادی طور پر

تیزی سے

پھر تو وہ رفتار بڑھاتا ہی گیا۔ ایک دھماکہ پھر ہوا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے۔“ مونا کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی۔

”فکر نہ کرو۔ میرا چیف اتنا احمق نہیں ہو سکتا کہ اس قسم کا مذاق کرے۔ یہ ہیلی کوپٹر کا دشمنوں ہی کا ہو سکتا ہے۔“

”ارباب! کیا ہوگا..... یہ تو..... یہ تو.....!“

”تیسرے دھماکے نے مونا کا جملہ پورا نہ ہونے دیا۔“

”واقعی شامت ہے۔ نہ گاڑی روک سکتا ہوں اور نہ اس رفتار سے چل ہی سکتا ہوں۔“

کیونکہ آگے موڑ ہی موڑ ہیں..... المدد یا رب السموات..... المدد.....!“

ٹھیک اسی وقت کسی طیارے کی آواز پھر سنائی دی اور اب کے گاڑی کے قریب اس زور

کا دھماکہ ہوا کہ اسٹیرنگ پر حمید کے ہاتھ بہک گئے۔ لیکن ساتھ ہی بریک پر بھی پیر پڑا اور گاڑی سڑک کے نیچے اتر کر ایک چٹان سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ دوسری طرف بھی اگر قد آدم چٹان ہوتی تو اس رفتار پر اچانک بریک لگنے پر گاڑی الٹ ہی جاتی۔

حمید کو اتنا ہوش تھا کہ بریک پر دباؤ کم کئے بغیر انجن بند کر دیتا۔

ہیلی کوپٹر ان کے سروں پر سے گزر گیا۔

”مونا..... مونا.....!“ حمید اُسے جھنجھوڑ کر بولا۔ ”تم ہوش میں ہو یا نہیں۔“

مونا کی آنکھیں تو کھلی ہوئی تھیں لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھی ہو۔

حمید نے اپنی طرف کا دروازہ کھولا اور تیزی سے نیچے اتر آیا۔ ٹامی گن بھی اس کی گونج سے نکل کر باہر گری تھی۔

اب وہ مونا کی بغلوں میں ہاتھ دے کر اسے بھی نیچے اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہیلی کوپٹر کچھ دور جا کر پھر ان کی طرف مڑا۔ اس بار اس کی پرواز پہلے سے بھی نیچی تھی۔

حمید نے سوچا اب بریت نہیں۔ مونا بیہوش ہو گئی تھی اور اس نے اُسے اپنے ہاتھوں میں سنبھال رکھا تھا۔

”اوہو..... یہ..... یہ.....!“ بے اختیار اس کی زبان سے نکلا۔ اس نے ایک طیارے

ہیلی کوپٹر پر ڈائیو کرتے دیکھا اور پھر وہ اس پر فائرنگ کرتا ہوا اوپر اٹھتا چلا گیا تھا۔ ہیلی کوپٹر کا ختم ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ طیارے کی زد سے بچ نکلتا چاہتا ہو۔ طیارے نے چکر بن کر پھر اس کے اوپر غوطہ لگایا لیکن اس بار فائرنگ نہیں کی۔

اب حمید نے ہیلی کوپٹر کو ڈھلان میں اترتے دیکھا۔ وہ نیچے تقریباً تین سو فٹ کی گہرائی میں جا رہا تھا۔

حمید نے مونا کو وہیں زمین پر ڈال دیا اور ٹامی گن سنبھال لی۔ جلد ہی اس نے ہیلی کوپٹر کیلئے کڑے دیکھا۔

طیارہ اب بھی اوپر فضا میں چکر لگا رہا تھا۔ حمید نے مناسب یہی سمجھا کہ لینڈ کئے ہوئے کوپٹر پر فوراً فائرنگ شروع کر دے۔ اُسے اندازہ نہیں تھا کہ ہیلی کوپٹر میں کتنے آدمی ہیں۔ وقت خود حمید کی پوزیشن محفوظ تھی۔ وہ ہیلی کوپٹر کو صاف دیکھ سکتا تھا۔ لیکن ہیلی کوپٹر والے بالکنا نہ نہیں لے سکتے تھے۔

ٹامی گن کے پہلے ہی ہلنے نے ہیلی کوپٹر کے سواروں کو ہیلی کوپٹر سے باہر نہ نکلنے دیا۔

حمید سوچ رہا تھا کاش مونا کو جلدی سے ہوش آ جاتا۔ وہ اپنی جگہ چھوڑ کر ہٹ نہیں سکتا تھا۔ اب ضروری تھا کہ اس کی ٹویٹر کے دوسرے دروازے کا پوشیدہ خانہ کھولا جاتا جس میں بہت طاقتور قسم کے تین عدد دستی بم رکھے ہوئے تھے۔ دانش مندی کا تقاضا یہی تھا کہ ہیلی کوپٹر

کا تاج کر دیا جاتا۔ فضا میں چکر لگانے والا جہاز مددگار ہی سہی لیکن شاید اس میں کوئی ایسا انتظام تھا جس سے ہیلی کوپٹر پر تباہ کن حملہ کیا جاسکتا۔

حمید نے تھوڑی دیر ٹھہر کر ایک بار پھر ٹامی گن کا ٹریگر کھینچ دیا۔ گولیوں کی بوچھاڑ نکلی اور اس نے ہیلی کوپٹر کی چھت میں سوراخ ہوتے دیکھے۔

اتنے میں مونا بھی کراہ کراٹھ بیٹھی۔

”کیا ہے..... یہ سب کیا ہے..... ارے یہ گاڑی..... تم کیا کر رہے ہو۔“ وہ ہدایاتی انداز میں بولی گئی۔

حمید نے پرسکون لہجے میں کہا۔ ”خود کو قابو میں رکھو اور ادھر میرے قریب بیٹھ کر کھک آؤ۔ اٹھنا نہیں..... دوسری طرف دشمن ہے۔“

پھر اس نے ٹامی گن سے کچھ فائر کئے۔ وہ دراصل نہیں چاہتا تھا کہ ہیلی کوپٹر کے باہر آئیں۔ باہر نکل کر وہ چٹانوں کی اوٹ لے لیتے اور پھر ان پر قابو پانے میں دشواری ہونے لگتی۔ ہیلی کوپٹر نے اس تک پہنچی اور حمید نے اُسے کنجیوں کا گچھا دیتے ہوئے کہا۔ ”طرح میں نے اپنی سائیڈ کے دروازے کا اسٹر نکال کر..... لیکن ٹھہرو..... احتیاط کی ضرورت ہے۔ تین ہینڈ گرنیڈز رکھے ہوئے ہیں اس خانے میں۔ ایک ایک کر کے نکال لاؤ۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے گاڑی تک جاؤ..... شابش!.....“

”مم..... میں..... ہینڈ گرنیڈ..... نہیں نہیں۔ مجھ سے نہیں ہوگا۔“

”تو پھر ہم دونوں ہی جہنم رسید ہوں گے۔“ حمید جھنجھلا کر بولا اور پھر ہیلی کوپٹر پر فائر کئے۔ ”جاؤ..... میں انہیں روکے ہوئے ہوں۔ اگر ہر منٹ پر فائر نہ کرے گا تو وہ ہیلی کوپٹر باہر نکل آئیں گے۔ پھر ہماری خیر نہیں۔“

”کک..... کوئی نیچی ہے.....؟“ مونا نے روہانی آواز میں پوچھا۔

حمید نے اُسے نیچی کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔ ”ڈرو نہیں..... سیفٹی کیج بٹائے بغیر پھٹ نہیں سکتے۔ خوبصورت لڑکیاں بہادر بھی ہوتی ہیں۔ دادا جان مرحوم اکثر کہا کرتے تھے۔“ مونا گھسٹی ہوئی گاڑی تک گئی۔ خفیہ خانہ کھولا اور ایک ایک کر کے تینوں دستی بم نکال لاؤ۔ ”ارے ادھر تو دیکھو۔“ دفعتاً ہڑک کی جانب ہاتھ اٹھا کر بولی۔

فصا میں ایک ہیرا شوٹ نظر آیا۔ کسی نے طیارے سے چھلانگ لگائی تھی اور آہستہ آہستہ نیچے آ رہا تھا۔

پوزیشن ایسی تھی کہ شاید ہیلی کوپٹر والے اسے دیکھ بھی نہ سکے ہوں۔

جہاز کی پرواز زیادہ اونچی نہیں تھی۔

حمید نے لاپرواہی سے شانوں کو جنبش دی اور پھر ہیلی کوپٹر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ار

ہی گن پھر گولیاں اگل رہی تھی۔

ہیلی کوپٹر سے نہ تو فائرنگ ہی ہوئی اور نہ اس کا انجن ہی جاگا..... حمید نے ٹامی گن رکھ دی اور ایک دستی بم کا سیفٹی کیج بٹانے ہی لگا تھا کہ مونا چیختی۔ ”ارے وہ ادھر ہی آ رہا ہے۔“

حمید نے مڑ کر دیکھا..... نہ صرف دیکھا بلکہ اپنی طرف دوڑ کر آنے والے کو پہچانا بھی۔ یہ زل فریدی تھا۔

وہ ہاتھ اٹھائے کہہ رہا تھا۔ ”اوہ احمق یہ کیا کر رہے ہو۔ سارا کھیل بگاڑ دو گے۔ خبردار..... گرنیڈ مت پھینکتا۔ ساری محنت برباد ہو جائے گی۔“

حمید نے طویل سانس لی اور ہاتھ ڈھیلے چھوڑ دیئے۔

آخری دھماکہ

فریدی اس وقت میک اپ میں نہیں تھا۔ اس نے جھک کر چٹائی ہوئی چٹان کی دراڑ سے اٹھ کر طرف دیکھا۔ ہیلی کوپٹر جوں کا توں وہیں موجود تھا۔

”میں نے ابھی تک کسی کو بھی باہر نہیں نکلنے دیا۔“ حمید نے گردن اکڑا کر کہا۔ ”اور اب اسے تباہ کرنے جا رہا تھا۔“

مونا حیرت سے آنکھیں پھاڑے فریدی کو دیکھ رہی تھی۔ یہی شخص اوپر چکرانے والے ہمارے سے کودا تھا۔ کون ہے یہ..... جو کیپٹن حمید سے اس انداز میں گفتگو کر رہا ہے۔

”تم سے حماقت سرزد ہوئی۔“ فریدی نے بدستور دراڑ سے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ذرا ایک گرنیڈ مجھے دینا۔“

حمید نے ایک دستی بم اُسے تھما دیا۔ اس کی نظر ہیلی کوپٹر ہی پر تھی۔ وہ فریدی کی طرف

نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس نے اسے ہم پھینکتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔ لیکن اُسے بڑی حیرت ہوئی جب اس نے فریدی کا نشانہ خطا کرتے دیکھا۔ ہم ہیلی کوپٹر سے کافی فاصلے پر گر ا تھا۔ اتنا فاصلہ تھا دونوں کے درمیان کہ وہ دھوئیں میں بھی نہ چھپ سکا۔

دوسرے ہی لمحے میں اس نے دو آدمیوں کو ہیلی کوپٹر سے باہر چھلانگ لگاتے دیکھا۔ دونوں خاکی لباس میں تھے لیکن فاصلہ زیادہ ہونے کی بناء پر ان کے خدو خال واضح طور پر نظر نہیں آ رہے تھے۔

”ٹوپسن مجھے دو۔“ فریدی نے کہا اور ٹامی گن اس کے ہاتھ سے لے لی۔ وہ دونوں ایک چٹان کی اوٹ لینے ہی والے تھے کہ فریدی نے ان سے کچھ دور ہٹا کر فائر کئے۔ وہ اچھل کر دوسری طرف بھاگے۔

”میگزین.....!“ فریدی غرایا اور پھر ٹریگرو دبا دیا۔

حمید گاڑی کی طرف جھپٹا۔ ٹامی گن والے خانے سے مزید میگزین نکالا اور ڈیش بورڈ کے ایک خانے سے ٹیلی سکوپ بھی نکالتا ہوا پھر فریدی کی طرف پلٹ آیا۔

فریدی تھوڑے تھوڑے وقفے سے برابر فائر کئے جا رہا تھا۔ حمید نے قریب پہنچ کر پوزیشن دیکھی اور اب اس فائرنگ کا مقصد اس کی سمجھ میں آ گیا۔

فریدی انہیں دوڑا دوڑا کر تھکا رہا تھا۔ جب بھی وہ کسی جانب بڑھتے فریدی اسی رخ ان سے کچھ دور فائر کر کے ان کا منہ پھیر دیتا۔ وہ دوسری طرف بھاگتے اور ادھر بھی ان کا ہتھیار ہوتا۔ ان میں سے ایک کا تو یہ حال تھا کہ گر گر پڑتا تھا۔ اسی طرح وہ دونوں ہیلی کوپٹر۔ کافی دور نکل آئے تھے۔

”تم ہیلی کوپٹر کو تباہ کرنا چاہتے تھے۔“ فریدی نے حمید سے پوچھا۔

”یقیناً.....!“

”تمہارے پاس صرف دو ہم ہیں۔ میں تمہاری مہارت دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”تباہ کر دوں.....؟“

”ہاں..... کیونکہ میں کچھ دیر اس مردود کے قص سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں۔“

حمید کا پھینکا ہوا پہلا ہی ہم ٹھیک نشانے پر بیٹھا۔

مونا تھر تھر کانپ رہی تھی۔ لیکن اس وقت شاید وہ دونوں ہی اُسے بھولے ہوئے تھے۔ ذرا جھٹکنی ہوئی گاڑی تک گئی اور اس سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

ادھر ہیلی کوپٹر سے دھوئیں کے مرغولے اٹھ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ایک دھماکہ اور ہوا۔ پہلے دھماکے سے کہیں زیادہ زور دار تھا۔ غالباً اس کا آئیل ٹینک پھٹا تھا۔

بچے پناہ تلاش کرنے والے اوندھے منہ زمین پر گر گئے تھے۔

حمید نے دور بین کے شیشے ایڈجسٹ کئے اور ان دونوں کو دیکھتا رہا۔ دفعتاً ان میں سے ایک بھیاں ٹیک کر اٹھتا ہوا نظر آیا۔

”اوہ..... اس کے چہرے پر تو خاکی نقاب ہے۔“ حمید بڑبڑایا۔

”صرف آنکھوں کی جگہ دو سوراخ ہیں۔ بقیہ چہرہ بالکل چھپا ہوا ہے۔“

”اسی لئے مجھے افسوس ہوتا اگر تم میرے پیچھے سے قبل ہیلی کوپٹر کو تباہ کر دیتے۔“ فریدی کہا۔

”تو آپ جانتے تھے کہ وہ ہیلی کوپٹر میں موجود ہے۔“

”گمان غالب تھا کہ اس بار یہی ہوگا۔ اس کے تحت کام کرنے والے تو لڑکی پر ہاتھ نہیں لے سکتے تھے اور وہ پھر نکل بھاگنے کی فکر میں ہے۔“

فریدی نے خاموش ہو کر فائر کئے لیکن اس بار بھی گولیاں اس سے کچھ دور ہٹ کر پڑی۔ مگر وہ بوکھلا کر دوسری طرف مڑا اور پھر گر پڑا۔

دوسرا آدمی تو پہلے جہاں گرا تھا وہاں سے جنبش بھی نہیں کر سکا تھا۔

”کیا دوسرا مر ہی گیا۔“

”ہو سکتا ہے۔“ فریدی نے لا پرواہی سے کہا۔ ”ہیلی کوپٹر کے ٹکڑے دور دور تک پھیلے تھے۔“

”وہ پھر اٹھ رہا ہے۔“ حمید نے آنکھوں سے دور بین لگائے ہوئے کہا۔

”میں دیکھ رہا ہوں۔“ فریدی نے کہا اور ٹریگر پھر کھینچ دیا۔ کئی گولیاں نقاب پوش قریب ہی گریں اور وہ دوبارہ زمین سے چپک گیا۔

”کب تک یہ کھیل جاری رہے گا۔“ حمید نے کہا۔

”فکر نہ کرو۔ موتا کو ہوش میں لانے کی کوشش کرو۔ کئی دھماکے سنے ہیں اس لئے بیڑ ہو گئی ہے۔“

اب حمید کو موتا یاد آئی اور وہ گاڑی کی طرف مڑا۔ موتا کے ہاتھ ادھر ادھر پھیلے ہوئے اور وہ گاڑی سے ٹکی نیم دراڑ تھی۔ آنکھیں بند تھیں اور دانت اتنی سختی سے بھینچے ہوئے تھے جیڑوں کی رگیں ابھری ہوئی سی معلوم ہوتی تھیں۔

لیکن وہ اُسے ہوش میں کیسے لاتا۔ منہ پر چھینٹے دینے کے لئے پانی تک تو تھا نہیں۔ ہر احمقوں کی طرح شانہ ہلا کر اُسے آوازیں دیتا رہا۔

فریدی نے اس دوران میں مزید دوبارہ فائر کئے تھے۔

”میں اسے کس طرح ہوش میں لاؤں.....!“ حمید کچھ دیر بعد منمنایا۔

”اور میں یہ سوچ رہا ہوں کہ یہ مردود..... کہیں پھر نہ نکل بھاگے۔“

”کیا مطلب.....!“ حمید چونک کر بولا۔ ”اور کیا پہلے بھی کبھی بھاگا تھا۔“

”کیا تمہیں یاد نہیں؟“

”کیا یاد نہیں۔“

”زیادہ دن تو نہیں گزرے حمید صاحب۔ یادداشت پر زور دو۔“

”فی الحال ذہن اس قابل نہیں۔ میں اُسے ہوش میں کیسے لاؤں۔“

”چھوڑ دو..... خود ہی ہوش میں آئے گی۔“

حمید پھر اس چٹان کی طرف پلٹ آیا جس کی دراڑ سے وہ دوسری طرف دیکھ سکتا تھا۔ دور میں آنکھوں کے قریب آئی۔

”اوہو..... کیا یہ بھی چل بسا۔“ اس نے کہا۔

”ہاں..... دیر سے نہیں اٹھا۔“ فریدی بولا۔ ”غالباً سمجھ گیا ہے کہ حملہ آور اُسے ہلاک نہیں کرنا چاہتا۔“

”تو پھر.....؟“

”سلح بھی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حربہ دور تک مارنے والا نہیں ہو سکتا۔“

”یہ کس بناء پر کہہ سکتے ہیں آپ.....!“

”اگر یہ بات نہ ہوتی تو کچھ نہ کچھ میگزین اس نے بھی ضائع کیا ہوتا۔“

”ارے تو ہاتھ کیسے آئے گا۔“

”جاؤ پکڑ لاؤ..... سر ڈالے اونڈھا پڑا ہوا ہے۔“ فریدی نے تلخ لہجے میں کہا۔

”اوہ..... تو اس کا یہ مطلب کہ ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ جب ہم قریب

پہنچیں گے تو اچانک فائرنگ شروع کر دے گا۔“

”سوچے جاؤ بچوں کی طرح۔ ایک لڑکی کے ساتھ سفر کرتے رہے ہوتا.....!“

”سفر زندگی کی ابتداء بھی ایک لڑکی ہی کی وجہ سے ہوئی تھی۔“

”اچھا بر خور دار بس یہ بات یہیں ختم کر دو۔ ورنہ تم یہ بھول جاؤ گے کہ کہاں ہو۔“

حمید کچھ نہ بولا۔ بُرا سا منہ بنائے ہوئے نشیب میں دور میں کوگردش دیتا رہا۔

مزم بے حس و حرکت اونڈھا پڑا تھا۔ حمید نے سوچا ممکن ہے آخری بار فریدی کا ہاتھ بہک

نہا گیا ہو۔ گولیاں اُسے چھلنی کر گئی ہوں۔ اس نے تھوڑی دیر بعد اپنے اس خیال کا اظہار بھی کر دیا۔

”ہوں..... تو دیکھو.....!“ فریدی نے کہا اور پھر ٹریگر دبا دیا۔

”اوہو.....!“ میساختہ حمید کے منہ سے نکلا۔ کیونکہ اس نے اُسے اچھل کر دوسری طرف

جاڑے دیکھا تھا۔

”پھر اس نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔“

”گڈ.....!“ فریدی پر اطمینان لہجے میں بولا۔

”اب اسے کور کئے ہوئے نیچے اتر چلے۔“ حمید نے کہا۔

”قطعی احمقانہ بات ہے حمید صاحب۔ وہ سمجھ چکا ہے کہ میں اُسے زندہ گرفتار کرنا چاہتا ہوں۔“
 ”انتاحفاظ میں نے آپ کو کبھی نہیں دیکھا۔“

”بہت دنوں سرگرداں رہنا پڑا ہے اس کے لئے۔ اور بڑی مشکلوں سے آج اسے اس کی کمین گاہ سے باہر نکالنے میں کامیاب ہوا ہوں۔ خیر تم دیکھو۔ گاڑی کا لاؤڈ اسپیکر ٹیسٹ کرو۔ مائیک سے کافی لمبا تار اٹچ ہے۔ اُسے یہاں تک لاؤ..... جلدی کرو۔“

حمید پھر گاڑی کی طرف بڑھا۔ اس نے دیکھا کہ مونا نے بھی ٹھیک اسی وقت کراہ کر اپنے پیروں کو جنبش دی تھی۔

”مونا.....!“ حمید نے اس کا شانہ ہلا کر آواز دی اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔

”اٹھو..... ہم نے اُسے گھیر لیا ہے۔“ حمید نے اس سے کہا۔

”کسے گھیر لیا ہے.....؟“ وہ نقاہت آمیز لہجے میں بولی۔

”مجرم کو..... اصل مجرم کو..... وہی نقاب پوش؟“

”خدا یا! ڈیڈی مر گئے ہوں..... مر گئے ہوں۔ میرے ڈیڈی۔ اے میرے اللہ.....“
 میری آخری آغوش دعا ہے۔ پھر کبھی کوئی دعا نہیں مانگوں گی۔ اے قبول کر میرے مالک۔“

”مونا..... مونا.....!“ حمید نے اُسے جھنجھوڑ کر آواز دی۔

”مائیک.....!“ چٹان کے قریب سے فریدی غرایا اور حمید بوکھلا کر گاڑی میں گھس گیا۔

کچھ دیر بعد مائیک فریدی کے ہاتھ میں تھا اور وہ نقاب پوش کو مخاطب کر کے کہہ رہا تھا۔

”اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے ہوئے اوپر چلے آؤ..... آخری وارننگ.....!“

حمید پھر مونا کی طرف پلٹ آیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کیا اس لڑکی کا ذہنی توازن ڈانواں

ڈول ہے۔

”مونا دیکھو..... میرے چیف نے اُسے جکڑ لیا۔“ حمید نے ایک بار پھر اس کا شانہ ہلا کر

کہا۔ مونا نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ آنکھوں سے اس طرح آنسو ابل رہے تھے جیسے

کسی ندی کا بند ٹوٹ گیا ہو۔

”تمہیں خوش ہونا چاہئے..... تمہیں خوش ہونا چاہئے۔“ حمید نے دھیسے لہجے میں کہا۔

”میں خوش ہو جاؤں گی..... تم بھی دعا کرو کہ ڈیڈی مر گئے ہوں؟“

”آخریوں.....؟“

دفعۃ فریدی کی آواز پھر پہاڑیوں میں گونجی۔

”اٹھو..... ورنہ پر نچے از جائیں گے۔“

حمید اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مونا بھی ادھر ہی دیکھنے لگی تھی۔

”نہیں..... دونوں ہاتھ بھی اوپر اٹھاؤ.....!“ فریدی کی آواز پھر چٹان سے ٹکرائی۔

”دیکھو..... شاید اب وہ اوپر آ رہا ہے۔“ حمید نے مونا سے کہا۔

”اور اب ڈیڈی کی گردن شرم سے جھک جائے گی۔ وہ ان کے بارے میں بھی سب کچھ

نارے گا۔ یا خدا..... ڈیڈی مر گئے ہوں..... مر گئے ہوں۔“

”حمید میرے پاس آؤ.....!“ فریدی نے مائیک سے منہ ہٹا کر کہا۔

”اے سنبھالو.....!“ اس نے ٹامی گن اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ حمید دراڑ سے

دیکھ رہا تھا۔ اس نے ٹامی گن فریدی سے لے کر اس کا رخ اس طرف کر دیا۔ نقاب پوش دونوں

ہاتھ اوپر اٹھائے ہوئے ڈھلان پر چڑھا آ رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کے قدم لٹکھڑاتے لیکن وہ

ہاتھوں کو نیچے گرائے بغیر ہی سنبھلنے کی کوشش کرتا۔

”ہوشیاری سے۔“ فریدی نے آہستہ سے کہا اور چٹان کے اس سرے کی طرف چلا گیا

جہر سے گزر کر آنے والا ان تک پہنچتا۔

جیسے ہی آنے والے نے اس سطح پر قدم رکھا جہاں وہ کھڑے ہوئے تھے فریدی نے بڑی

پھرتی سے اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔

”میں اپنی شکست تسلیم کرنے نہیں آیا۔“ حمید نے اس کی غراہٹ سنی اور چونک پڑا۔ کان

آشنا سے معلوم ہوئے۔ کہاں اور کب سنی تھی یہ آواز..... اس نے ٹامی گن کا رخ اس کی طرف

کرتے ہوئے سوچا۔

فریدی اُسے برا بھلا کہہ رہا ہے بیہوش طرم کے ہاتھوں میں جھکڑیاں ڈال دیں۔
”تم نے کیا کیا.....؟“ فریدی کی آواز غصیلی تھی۔

”مت بول کیجئے مجھے۔ اپنے اصول اپنے پاس رکھئے۔ اگر کچھ دیر پہلے اس کا پھینکا ہوا ہم گاڑی پر پڑا ہوتا تو کیا میں اس وقت تبلیغ اخلاق کے کسی جلسے کی صدارت کر رہا ہوتا۔“
غصے میں بگڑی ہوئی حمید کی صورت دیکھ کر فریدی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ بکھر گئی۔
اب وہاں رکھا ہی کیا تھا۔ ہیلی کوپٹر کے پر نچے اڑ چکے تھے۔ قلندر کا ساتھی جیج مرچکا اس طیارے کا بھی اب کہیں پتہ نہ تھا جس سے فریدی بذریعہ پیراشوٹ وہاں اُتر تھا۔
مونا اب بالکل خاموش تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف اور استعجاب کی ملی جلی کیفیت پائی تھی۔

خوش قسمتی سے گاڑی میں کوئی خرابی واقع نہیں ہوئی تھی۔ وہ دونوں اُسے دھکیلے ہوئے بارچہ چالے گئے۔

قلندر کو رام گڈھ پہنچنے سے پہلے ہی ہوش آ گیا تھا۔ لیکن وہ بھی خاموش ہی بیٹھا رہا۔
ہید کا خیال تھا کہ ہوش آتے ہی وہ گاڑی سے چھلانگ لگا دینے کی کوشش کرے گا۔
”تمہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔“ فریدی نے قلندر سے پوچھا۔

”نہیں شکریہ۔ صرف میرے چہرے سے نقاب ہٹا دو۔ اب اس کی ضرورت نہیں۔“
فریدی نے خاکی کپڑے کا وہ خول کھینچ لیا جو اس کے چہرے پر منڈھا ہوا تھا۔ مونا جو اگلی بار حمید کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

قلندر نے لا پرواہی سے اپنے شانوں کو جنبش دی اور بولا۔ ”میرا کھیل ختم ہو چکا ہے۔
ناکڑل فریدی تم میرے توسط سے میرے گردہ کے کسی آدمی پر ہاتھ نہیں ڈال سکو گے۔ میں
نہا ان میں سے کسی کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔“

”وہ خود ہی آ کر سب کچھ بتا دیں گے۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔ وہ تم سے خائف ہیں اور
بھئی۔“

نقاب پوش کے دونوں ہاتھ فریدی کی گرفت میں تھے اور وہ انہیں چھڑا لینے کے لئے
ایزی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔

”نہیں..... چھچھوڑے ناول نویس..... اس بار ناممکن ہے؟“

فریدی نے زہریلی سی ہنسی کے ساتھ کہا اور حمید میساختہ اچھل پڑا۔ اب اسے یاد آیا کہ
اسے یہ آواز جانی پہچانی سی کیوں محسوس ہوئی تھی۔

تو یہ قلندر بیابانی! وہ جو ایک بار فریدی کی گرفت میں آ کر نکل گیا تھا۔ حمید پہلے سے
بھی زیادہ الرٹ ہو گیا۔

پھر دفعتاً مونا کے حلق سے ڈری ڈری سے آوازیں نکلنے لگیں۔

نقاب پوش فریدی کو ہلائے ڈال رہا تھا لیکن اپنے ہاتھ اس کی گرفت سے کسی طرح بھی
آزاد نہ کر سکا۔

”حمید اس کی جامہ تلاشی لو.....!“ فریدی نے کہا۔

اور حمید نامی گن ایک طرف ڈال کر اس کی طرف بڑھا۔ تلاشی بھی لے ڈالی۔ لیکن اس
کے پاس سے ایک بہت بڑے چاقو کے علاوہ اور کچھ بھی نہ برآمد ہو سکا۔ چاقو پر نظر پڑتے ہی
مونا کی چیخیں پہلے سے بھی زیادہ تیز ہو گئیں۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس پر چیخنے کا دورہ
پڑ گیا ہو۔

”اب میری دائیں جیب سے جھکڑیاں نکالو.....!“ فریدی نے پھر حمید کو مخاطب کیا۔

حمید نے جھکڑیاں تو نکال لیں لیکن انہیں قلندر کے ہاتھوں میں نہ ڈال سکا۔ کیونکہ ہاتھ
چھڑانے کے لئے جدوجہد میں پہلے سے بھی زیادہ تیزی آ گئی تھی۔

پھر حمید پر جھلاہٹ کا دورہ پڑا..... اس نے جھکڑیاں زمین پر ڈال دیں اور جھپٹ کر ٹائی
گن اٹھائی اور اس کے بٹ سے تین چار گہری ضربیں قلندر کی گدی پر لگائیں۔ فریدی ہاں ہاں
ہی کرتا رہ گیا۔

قلندر کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے اور وہ لہرا کر ڈھیر ہو گیا۔ پھر حمید نے اس کی پرواہ کے
بے اس کہانی کے لئے ساتواں جزیرہ اور شیطانی جھیل جلد نمبر 31 ملاحظہ فرمائیے۔

”یہ غلط ہے۔ وہ مجھ سے خائف تو ہو سکتے ہیں لیکن متفر نہیں۔“

”کچھ ایسے آدمی تو میں پیش کر سکتا ہوں جو تم سے متفر ہی نہیں بلکہ تمہارے خون ریا سے ہیں۔ مثال کے طور پر تمہارا وہی لفٹیننٹ پیش کیا جاسکتا ہے جو تمہارے لئے آپریشن کرتا ہے۔ کیا سمجھتے ہو۔ وہ تمہارا آدمی ہے؟“

”اوہ..... تو کیا پولیس.....؟“

”قطعاً نہیں..... اب وہ اس گروہ کیلئے بھی کام کرتا ہے جو گولڈن ایرو کے مقابل کھڑا ہوا ہے۔“

”ہوگا؟“ قلندر نے لاپرواہی سے کہا۔

”اور وہ گروہ میرا ترتیب دیا ہوا ہے۔“

”نہیں.....؟“ قلندر چونک پڑا۔

”تمہیں تمہارے بل سے نکالنے کے لئے بہت کچھ کرنا پڑا ہے۔“

”تمہارے علاوہ مجھے اور کسی کی پروا نہیں تھی۔“

”پروفیسر کا کیا قصہ تھا؟ کیا یہ بھی نہیں بتاؤ گے؟“

”سب کچھ میرے ساتھ ہی دفن ہو جائے گا۔ میں کسی کے بارے میں کچھ نہ بتاؤں گا۔“

اس کا مجھے اعتراف ہے کہ میں نے گولڈن ایرو کے تحت کروڑوں کا بزنس پھیلا رکھا تھا۔ خواہ

تھی کہ اُسے مافیہ سے بھی بڑا کاروبار بنادوں۔“

”تم نے واجد کو کیوں قتل کیا تھا.....؟“

”ہاں..... ایسے سوالات کے جوابات دے سکتا ہوں۔ وہ بے ایمانی پر اتر آیا تھا۔“

انہیں زندہ نہیں چھوڑنا جو بزنس کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔“

”سارہ رحمان کیوں قتل کی گئی.....؟“

”مجھے اطلاع ملی تھی کہ وہ تم سے ملنا چاہتی ہے۔ واجد کے قتل کا منظر اس نے دیکھا۔“

مجھے شبہ تھا اس کے پاس کوئی ایسا ثبوت موجود ہے جس سے میری شخصیت پر روشنی پڑ سکے گی۔“

”اوہ وہ یقیناً تھا اس کے پاس.....!“

”کیا تھا.....؟“ قلندر نے مضطربانہ انداز میں پوچھا۔

”تمہارے خون سے بھرے ہوئے ہاتھ کا نشان۔ ایک پرانے اخبار پر۔“

”آپ کو کیسے معلوم ہوا.....؟“ حمید بے ساختہ بول پڑا۔ ”مونا نے آپ کو یہ بات نہیں

بتائی تھی۔“

”جتنا بھی اس نے بتایا تھا اسی سے میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ وہ مجھ تک وہی خونی نشان

پہنچانا چاہتی تھی۔“

”لیکن وہ تو..... آپ تو کہہ رہے تھے کہ پرس میں کچھ بھی نہیں تھا۔“

”یہ میں نے لڑکی سے کہا تھا؟ محض یہ معلوم کرنے کے لئے کہ واقعی اس پرس کی کوئی

اہمیت تھی یا نہیں۔ اس نے مجھے نقاب پوش اور اس کے دستاویز کی کہانی سنائی اور میں اس نتیجے

پر پہنچا کہ وہ اس کے دوست کے قاتل ہی کے ہاتھ کا نشان تھا۔“

”لیکن وہ آپ کو کب ملا تھا.....!“

”پرس ہاتھ آتے ہی.....!“

”لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت بھی آپ نے یہی کہا تھا کہ اس میں چند

سکوں کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔“

”ہاں..... وہ اسی وقت تک کی معلومات تھیں اس کے بعد پرس کا بغور معائنہ کرنے کے

بعد معلوم ہوا تھا کہ وہ دوہرے پلاسٹک سے بنایا گیا ہے۔ لہذا میں نے اسکی دونوں تہیں الگ کر دی

تھیں اور اخبار کا وہ ٹکڑا دونوں تہوں کے درمیان رکھا ہوا مل گیا تھا۔ میں نے اُسے فنگر پرنٹ

یکشن کے حوالے کر دیا۔ پرانے ریکارڈوں سے اس کا موازنہ کرنے کے بعد یہ بات پایہ ثبوت

کو پہنچی تھی کہ وہ قلندر بیابانی کے علاوہ اور کسی کے ہاتھ کا نشان نہیں ہو سکتا۔ پھر جب اس نقاب

پوش کی کہانی مجھ تک پہنچی تو!“

فریدی خاموش ہو گیا۔ قلندر آنکھیں پھاڑے خلاء میں گھور رہا تھا۔

کچھ دیر بعد فریدی نے کہا۔ ”اور یہ بھی سن لو کہ اس وقت میں نے تمہیں کیونکر گھیرا تھا۔“

”پروفیسر کے بارے میں نہ بتاؤ گے۔“
 ”ہرگز نہیں۔“ قلندر غراپا۔

میں تمہاری عزت کرنے پر مجبور ہوں بُرے آدمی۔ مونا روہاسی آواز میں بولی۔ ”وہ زندہ ہے۔ انہیں سوال و جواب کی ندامت سے بچالو۔“
 ”اچھا روں کا بستر بھی میری زبان نہیں کھلوا سکے گا۔“ قلندر نے کہا اور سختی سے اپنے منہ بند کر لے۔

پھر رام گڈھ پہنچ کر انہیں اطلاع ملی کہ پروفیسر مر چکا ہے۔ ہو سکتا تھا کہ کچھ دیر کے لئے ہی اتفاقات الموت ہی رہا ہو اور یہ بھی ممکن تھا کہ اس کے جسم میں زہر انجکٹ کر دیا گیا حال فریدی نے مشورہ دیا تھا کہ اس کی لاش کا پوسٹ مارٹم ضرور کیا جائے۔

فریدی ہی کے اختیارات خصوصی کی بناء پر ایس پی کرائمز کی گرفتاری بھی عمل میں آئی اس کے خلاف اس کے پاس بہتیرے ثبوت تھے۔

باپ کے مرنے کی خبر سن کر مونا پہلے تو روتی رہی تھی پھر حمید نے اس کے چہرے پر ایسا دیکھا تھا جیسے خود اس نے دوسری زندگی پائی ہو۔ دوسری زندگی جس میں زندگی کے لئے اور مستقبل کے لئے پریشان کن خیالات نہ ہوں۔

اور پھر اس نے بالکل ہی غیر جذباتی انداز میں وہ کہانی سنائی تھی جسے اب تک چھپاتی آئی تھی۔ ”ڈیڈی سارا کو بہت چاہتے تھے۔ مجھ سے بھی زیادہ اور وہ بھی اُن کا بہت خیال رکھتی۔ فرمت کے اوقات میں ان کے لئے لیبارٹری اسٹنٹ کے فرائض بھی انجام دیتی۔“
 اکیڑھائی تجربات کا خطبہ تھا۔ وہ کینسر کا علاج دریافت کرنے کی فکر میں تھے۔ کوئی ایسی دوا ناپا جتے تھے جو اس کے لئے تیر بہدف ہوتی۔ اسی سلسلے میں ایک نشیلا سفوف تیار ہو گیا۔

نوف جس کا اثر دوسری منشیات کے مقابلے میں کہیں زیادہ دیر پا ثابت ہوتا تھا۔ یہ ایک اعلیٰ درجہ حرارت میں تیار ہوتا تھا۔ خشک لکڑی پر کوئی محلول چھڑکا جاتا تھا اور ایک مخصوص درجہ حرارت میں لکڑی کے ساتھ وہ لکڑی رکھی جاتی تھی۔ کچھ عرصہ بعد لکڑی کی سطح پر پھسپھونی جیسے لگتی

تمہارے آدمی اس لڑکی کو اغواء کر لینے کی فکر میں تھے۔ میں نے ان کی اسکیموں کو ناکام بنادیا۔ تم جھلا گئے۔ تم نے اپنے اس لیفٹیننٹ کو سخت دست کہا جو تمہارے لئے آپریٹ کرتا تھا اور اسے ہدایت کی کہ اب لڑکی کا سراغ پانے کے بعد تمہیں اطلاع دی جائے۔ تم خود ہی اس معاملے کو دیکھو گے۔ تمہارے لیفٹیننٹ نے مجھے اس سے آگاہ کر دیا۔ میں نے لڑکی کو اس پولیس پارٹی کے پاس بھیج دیا جو اسے تلاش کر رہی تھی۔ تمہارے لیفٹیننٹ نے تمہیں اطلاع دی کہ وہ پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچ چکی ہے اور کیپٹن حمید اس کا بیان لے گا۔ پھر دوسری اطلاع تمہیں یہ ملی کہ میں نے کیپٹن حمید کو لڑکی سمیت دھام نگر طلب کیا ہے۔ پھر تم نے اپنے اسی لیفٹیننٹ کے توسط سے ایئر فورس کے ایک اسکویڈرن لیڈر ایڈورڈ مائلز سے رابطہ قائم کیا۔ مائلز بھی اس گندے بزنس میں شریک تھا۔ کسی طرح اس نے تمہاری اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک ہیلی کوپٹر کی پرواز کا جواز پیدا کر لیا۔

”اب مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ کوئی واقعہ کیونکر ہوا۔“ قلندر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

کچھ دیر خاموشی رہی پھر فریدی نے کہا۔ ”تم میری گردن بھی کاٹ دینے کی فکر میں تھے؟“
 ”یقیناً تھا..... مجھے تمہاری بھی فکر تھی اور اس آدمی کی تلاش بھی، جس نے گولڈن ایرو کے مقابلے میں نہ صرف کاروبار کھڑا کیا تھا بلکہ گولڈن ایرو کی ملکیت پر ڈاکے بھی ڈالا کرتا تھا۔ اگر کہیں مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ کٹرل فریدی کہ وہ بھی تم ہی تھے تو تم اس وقت بڑھ چڑھ کر باتیں نہ کر رہے ہوتے۔ صرف تمہیں ختم کر دینا، کتنی بڑی بات تھی۔ میری مصروفیات دو مختلف سمتوں میں بٹ گئی تھیں۔ اپنی دانست میں تنہا دو مخالف قوتوں سے جنگ کر رہا تھا۔ کاش میں نے صرف تم پر ہی دھیان دیا ہوتا۔“

”ہمیر..... ہمیر.....!“ حمید نے نعرہ لگایا۔ پھر زہر پٹی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔

”اسی حیرت انگیز صلاحیت کا نام تو کٹرل فریدی ہے۔“

کوئی کچھ نہ بولا۔ تھوڑا سا راستہ خاموشی سے طے ہوا تھا پھر کٹرل فریدی نے کہا۔ ”کیا ج

ہے اور اس کی سطح تیزی سے موٹی ہوتی جاتی۔ پھر اس پھپھوندی کو خشک کر کے سفوف کی شکل میں تبدیل کر لیا جاتا۔ سارہ سے حماقت یہ سرزد ہوئی کہ اس نے اس کا تذکرہ واجد سے کر دیا۔ واجد نے یہ بات نقاب پوش تک پہنچائی اور بلاآ خرقاب پوش نے سارہ کو اغواء کر لیا۔ ڈیڑی کی گمشدگی کی بناء پر اپنے حواس کھو بیٹھے۔ تب انہیں اسی مردود کا جسم کی آمیز خط ملا۔ اس نے گھر تھا کہ اگر ڈیڑی نے فارمولا اسے نہ بتایا تو وہ سارہ کو قتل کر دے گا۔ اس خط نے ان پر بہت اثر ڈالا اور ان کا ندوس بریک ڈاؤن ہو گیا۔ بمشکل ان کی حالت سدھری اور وہ نقاب پوش سے اس کی بتائی ہوئی جگہ پر ملے۔ بڑی دشواریوں سے انہوں نے اسے اس پر آمادہ کیا کہ وہ اس کے لئے وہ سفوف تیار کرتے رہیں گے لیکن فارمولا نہیں بتائیں گے۔ اس طرح وہ اپنی دائرہ میں سارہ کی جان بچا سکے تھے۔ برقیاتی نمبر پچر سے اتنے اعلیٰ پیمانے پر سفوف کی تیاری ہو چکی تھی۔ اس کے لئے باقاعدہ طور پر کارخانہ قائم کرنا پڑتا اور بات چھی نہ رہ سکتی۔ اس لئے اس مخصوص درجہ حرارت کے لئے رام گڈھ کا انتخاب کیا گیا۔ برف گرنے سے پہلے وہ لکڑی کے بڑے بڑے لٹھوں کو محلول سے تر کر دیتے۔ پھر ان لٹھوں پر برف گرتی اور جب برف پگھلا لگتی تو انہیں پھر رام گڈھ آنا پڑتا۔ دو مختلف ہوٹوں میں ان کے ٹھہرنے کا انتظام ہوتا تھا۔ بالکل والے سمجھتے کہ وہ موسم گرمای میں وہاں قیام کرتے ہیں اور فزارو والے انہیں پاگل سمجھتے کہ موسم سرما میں رام گڈھ آتے ہیں۔ یہ انتظام اسی نقاب پوش نے کیا تھا۔ رام گڈھ میں اکثر کئی کئی دن کے لئے غائب ہو جاتے۔ جب واپس آتے تو حالت بہت خراب ہوتی۔ بات تھی کہ اس جگہ تک پہنچنے کا راستہ بے حد دشوار گزار تھا جہاں لکڑی کے لٹھوں پر وہ کیمائی ہوتا تھا۔ اس بار وہ بیماری سے اٹھے تھے۔ واپسی کے سفر میں فقاہت کی وجہ سے کہیں گر کر ہوش ہو گئے ہوں گے۔ یہ تھی میرے ڈیڑی کی بے بسی کی کہانی..... اللہ انہیں معاف کرے۔

حمید اس لڑکی کے لئے بے حد مغموم تھا۔

شام تک فزارو پہنچنے کی نوبت آئی۔ قاسم کی نئی محبوبہ بھی حراست میں لی جا چکی تھی۔ فریدی کا یہ خیال قطعی درست ثابت ہوا تھا کہ وہ قاسم کو اسی لئے اپنے ساتھ رام گڈھ لگا لائی تھی۔

فریدی یا زبیا کی شناخت ہو سکے۔ ان لوگوں نے قاسم کو عورت کے میک اپ میں پہچان لیا تھا۔ فزارو کی گرفتاری سے یہ بات بھی ان پر عیاں ہو گئی تھی کہ اس سارے سیٹ اپ کا بانی بڑی ہی تھا۔

قاسم نے حمید کو دیکھا اور چڑھ دوڑا۔ کچھ عجیب سی کیفیت تھی۔ غصے میں مل بھی کھا رہا تھا۔ انہیں بھی ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔

”خدا گارت کرے تم لوگوں کو۔“ وہ اُسے گھونہ دکھا کر بولا۔ ”اس بار میں نے خدا کا شکر ادا کیا تھا اور تمہیں بتائے بغیر چپ چاپ یہاں چلا آیا تھا۔ لیکن سارے تم شیطان ہو۔ خبیث نہیں کسی طرح پتہ چل گیا..... اے الامیاں اگر بتاؤں تو مشکل نہ بتاؤں تب بھی میرا ہی اثر ہو جاتا ہے۔ میں سلا قیا کروں..... اب تو موت ہی دے دے..... یا پھر ان سالوں کا بدلہ فرا دے..... ہائے۔“

حمید نے اسی میں عافیت سمجھی کہ اب اس سے دو چار گز کے فاصلے ہی پر رہے۔ وہ زبیا کے بارے میں سوچ رہا تھا جو عجیب سی خلش اس کے ذہن میں چھوڑ گئی تھی اور اسے اس طرح غائب ہوئی تھی جیسے فضا میں تحلیل ہو گئی ہو۔

ختم شد